لائبریری ایڈیشن

آنگن

خدیجہ مستور

تین روپئے
۵۰ پیسے

لائبریری اڈیشن

آنگن

ناول

خدیجہ مستور

کتابی دنیا ۔ لکھنؤ

معیاری ادب

ارزاں قیمت

ندیم لالہ

کے

نام

ٹیلیفون

۲۶۲۳۵

پبلشر :- اظہر نگرامی ۔ کتابی دُنیا ۔ لکھنؤ
پرنٹر :- سرفراز قومی پریس لکھنؤ

(۱)

سردیوں کی رات کتنی جلدی سنسان ہوجاتی ہے۔ آج بھی شام سے بادل چھا گئے تھے۔ خنکی بڑھ گئی تھی۔ کھڑکی کے پاس لگے ہوئے بجلی کے کھمبے کا بلب خاموشی سے جل رہا تھا۔ گلی کے اس پار اسکول کی ادھ بنی عمارت کے قریب درختوں کے جھنڈ سے اُلو کے بولنے کی آواز آرہی تھی اس کی آواز کی نحوست رات کو اور بھی سنسان کئے جارہی تھی۔ پاس کے بڑے کمرے میں اب قطعی خاموشی تھی۔ چھمی کے کروٹیں بدلنے کی آہٹ بھی محسوس نہ ہوتی تھی۔

سو رہی ہو مزے میں۔ عالیہ نے بڑی حسرت سے سوچا۔ اسے نیند نہ آرہی تھی۔ رات کو نیند نہ آنا کتنا تکلیف دہ احساس ہوتا ہے۔ یہ احساس اس وقت تو اور بھی شدید ہوجاتا ہے جب بالکل نئی جگہ ہو۔ شاید نئی جگہوں کی پہلی رات اسی طرح بے خوابی سے گزرتی ہوگی اس نے ایک بار پھر سوجانے کی کوشش کی۔ کھڑکی کے پٹ بھیڑنے سے نتھے سے کمرے میں بالکل اندھیرا چھا گیا اور وہ لحاف میں منھ چھپا کر اس طرح لیٹ گئی جیسے واقعی سو رہی ہو دیر تک بے سُدھ پڑے رہنے کے بعد اسے احساس ہوا کہ ساری جدوجہد بے کار گئی نیند کا تو کوسوں پتہ نہ تھا۔ ماضی کی یادیں بگولے کی طرح دماغ میں لوٹیں لگا رہی تھیں۔

وہ بڑی بے لبی سے اپنے بستر پر پلتھی مار کر بیٹھ گئی۔ کھڑکی کے پٹ کھول کر باہر دیکھنے لگی گلی کے اس پار اسکول کی عمارت، آم اور پیپل کے گھنے درخت، سب اندھیرے میں ڈوبے ہوئے تھے۔ شام کو یہ سب کچھ کتنا صاف اور خوبصورت نظر آرہا تھا۔ کھڑکی میں بیٹھ کر اس نے یہ سب کچھ ذرا دلچسپی سے دیکھا تھا مگر اس وقت اندھیرے میں درخت سیاہ پہاڑوں کی طرح محسوس ہو رہے تھے۔ اور جب ہوا کا تیز جھونکا چلتا تو یہ درخت بچپن میں سُنی ہوئی کہانیوں کے بھوتوں کی طرح خوفناک معلوم ہوتے تھے۔

اس طرح تو نیند آنے سے رہی۔ اس نے سوچا اور کھڑکی کے پٹ کھینچ کر بند کر دیئے لیٹتے ہوئے اسے اپنا جسم ٹوٹتا ہوا محسوس ہوا۔ سارے دن کی سفر کی بے چینی نے کہیں کا نہ رکھا تھا۔

ہائے بھئی — وہ کراہی۔ اب نیند نہیں آتی۔ جب تک دماغ کی دنیا ویران نہ کی جائے نیند کا کہاں سے گزر ہو۔ ماضی کی یادیں ہر طرف سے دراتی چلی آرہی تھیں۔ لوگ کہتے ہیں کہ ماضی کو بھول جاؤ۔ پیچھے مڑکر دیکھنے میں کیا رکھا ہے۔ آگے بڑھے جاؤ۔ پر اسے تو ورثے میں صرف اپنا ماضی ہی ملا تھا۔ ماضی جس سے اس نے کیا کچھ نہیں سیکھا اب وہ اس سے کس طرح دامن بچائے۔ جن حالات میں وہ یہاں آئی تھی ان کی وجہ سے تو اور بھی یادوں نے سر اُٹھا رکھا تھا۔

جانے اماں بھی سوئی ہوں گی یا نہیں۔ گھر میں کیسی خاموشی طاری تھی گلی میں کوئی راہ گیر ٹھٹھری ہوئی آواز میں گاتا گزر گیا۔

مفت ہوئے بدنام سنوریا تیرے لیے

یہ رات کس طرح گزرے؟ اتا جیل میں تمھاری راتیں کس طرح گزر رہی ہوں گی! اس نے جیسے بلبلا کر گھٹنے پیٹ میں اڑا لیے۔ دور کہیں سے گھڑیال کے گیارہ بجانے کی آواز

آرہی تھی ۔

ہلکی ہلکی بارش شروع ہو گئی تھی ۔ یہ ہوا کے جھونکوں میں آتی ہوئی بوچھار کھڑکی کے ٹیوں پر مدھم لے میں گنگنا رہی تھی ۔

اب یہ زندگی کیسی ہو گی ؟ اس نے جیسے ڈر کر سوچا ۔ کمرے میں اتنا اندھیرا تھا ۔ اسے اپنے سوال پر اسی طرح اندھیرا چھایا ہوا محسوس ہوا ۔ اس نے گھبرا کر آنکھیں بند کر لیں ۔ نیند تو اب بھی کوسوں دور تھی یہ ماضی کی یادیں اس کی رات کٹوانے کے لیے پاس آ بیٹھی تھیں ۔

وہ ایک اُجاڑ ضلع تھا ۔ سُرخ سُرخ اینٹوں کے مکانات اس طرح بنے ہوئے تھے کہ کسی ترتیب کا خیال ہی نہ آتا ۔ بس ایسا محسوس ہوتا کہ کسی نے اُٹھا کر بکھیر دیے ہیں ۔ وہاں اس چھوٹی سی جگہ میں کتنے بہت سے مندر تھے ۔ ان کے سُنہرے کلس سر اُٹھائے جیسے بھگوان کی پرارتھنا کرتے رہتے ۔ مندروں میں صبح و شام گھنٹے بجتے ۔ پجاریوں کے بھجن گانے کی مدھم مدھم آواز گھر تک آتی ۔

وہاں درخت کس قدر تھے ۔ دھول سے اٹی ہوئی کچی سڑکوں پر دونوں طرف آم جامن اور بیل کے گھنے درخت تھے ان درختوں کے سائے میں راہ گیر انگوچھے بچھائے گٹھریاں سر کے نیچے رکھے مزے سے سویا کرتے ۔ ان دنوں بہار کا موسم تھا ۔ آموں میں بور آ چکا تھا ۔ کوئل ہر وقت کوکا کرتی ۔ انھیں دنوں تو وہ وہاں آئی تھی ۔

جب اس نئی جگہ پر ابا کا تبادلہ ہوا تو اس نے محسوس کیا کہ وہ بالکل تنہا اور اداس ہے ۔ وہیں اس کا شعور جاگا تھا اور کچھ سوچنے سمجھنے کی صلاحیت نے جنم لیا تھا ۔

اس دن جب سب لوگ نئے گھر میں اُترے تھے ، تو سامان کے بڑے بڑے بنڈل صحن میں ہر طرف رکھے ہوئے تھے جنھیں ابا محکمے کی طرف سے ملے ہوئے چپراسی کی مدد سے

کھلوا رہے تھے۔ اماں گھر اور سامان کی طرف سے بالکل بے تعلق سی معلوم ہوتیں پھر بھی انھوں نے کئی بار گھوم پھر کر اونچے اونچے محراب دار برآمدوں کمروں اور غسل خانے وغیرہ کو دیکھا تھا۔ تہمینہ آپا نظریں جھکائے چھوٹا موٹا سامان اٹھا اٹھا کر کمروں میں لے جا رہی تھیں اماں سخت بیزاری سے آرام کرسی پر نیم دراز تھیں صفدر بھائی اپنے کمزور شانے جھکائے برآمدے کی محراب میں اکڑوں بیٹھے تھے۔

"تم بھی اپنے ماموں کی مدد کرو۔" اماں نے بڑی حقارت سے صفدر بھائی کی طرف دیکھا تھا۔

"رہنے دو وہ کمزور ہو گیا ہے بخار سے، پھر سفر میں بھی تھک گیا ہے۔" ابا نے آہستہ سے کہا۔

"یہ تو ہمیشہ ہی تھکا رہتا ہے۔" اماں بڑبڑائیں اور پھر جیسے جل کر ابا کے ساتھ سامان کھلوانے لگیں۔ تہمینہ آپا نے گھبرا کر صفدر بھائی کو دیکھا اور پھر نظریں جھکالیں وہ کچھ خوف زدہ سی ہو گئیں۔

اسی دن تو اسے احساس ہوا کہ گھر کی فضا کھنچی کھنچی ہے۔ وہ سب کے بگڑے تیور دیکھ کر اور بھی رنجیدہ ہو گئی اسے تو اپنی وہی پرانی جگہ یاد آ رہی تھی۔

وہاں تو لائن سے سارے افسروں کے پیلے پیلے بنگلے بنے ہوئے تھے۔ بنگلوں سے ذرا دور آموں کا باغ تھا۔ پاس چھوٹا سا تالاب اور اس تالاب میں بچے اور بھینسیں ساتھ ساتھ نہایا کرتیں۔ وہاں اس کی ہم سن بہت سی لڑکیاں اور لڑکے تھے۔ سارا دن مزے مزے کے کھیل کھیلے جاتے اور کچھ نہیں تو پانی میں بیٹھی ہوئی بھینسوں کو ڈھیلے ہی کھینچ کھینچ کر مارے جاتے۔ باغ میں گھس کر کیریوں کی چوری کی جاتی۔ تو باغ کا رکھوالا انھیں کچھ بھی نہ کہتا بلکہ زمین پر ٹپکی ہوئی کچی کیریاں خود ہی چن کر انھیں دے دیتا۔

"اپنے بابو ہوردں کے بچے ہیں" وہ بڑے پیار سے ان کے سروں پر ہاتھ پھیرتا کملا اور اوشا اسے منھ چڑاتیں۔ اس کے بڑے دانتوں کا مذاق اڑاتیں۔ مگر وہ نہ بگڑتا

رات کو خانسامن بوا اس کی ضد پر کہانیاں سناتیں۔ شہزادے اور شہزادی کی کہانیاں جو ایک ہی بستر پر بیچ میں تلوار رکھ کر سو جاتے تھے۔ وہ اس کہانی سے سخت فکرمند ہوجاتی اگر کسی نے ذرا سی بھی کروٹ لی تو کہیں شہزادے یا شہزادی کا جسم نہ کٹ جائے۔ خانسامن بوا اُسے سمجھاتیں کہ "بھئی کہانیوں میں جسم نہیں کٹا کرتے" پھر بھی اس کی فکر کم نہ ہوتی۔ سوتے میں بھی وہ خوف سے کروٹ نہ بدلتی۔ جانے وہ تلوار اس کے بستر پر کہاں سے آجاتی۔

خانسامن بوا اور بھی کیسے مزے کی کہانیاں سُناتی تھیں۔ راجہ بھوج اور گنگوا تیلی کی کہانی، کٹھ تیلی کی کہانی جو راجہ کے محل کی ہر چیز کھاگئی تھی۔ کٹھ تیلی کی کہانی بھی کتنی اچھی تھی۔ کٹھ تیلی کی بُری حرکتوں کی اطلاع جب راجہ کو دی جاتی تو بڑے میٹھے انداز سے گایا جاتا۔ ع

کاٹھ کی کٹھ تیلی رے راجہ گئی سب گھوڑے کھائے جی

"خانسامن بوا۔ جب راجہ کو گا کر بتاتے تھے تو وہ ناراض نہیں ہوتا تھا۔؟"

وہ حیرت سے پوچھتی تھی۔

"نہیں بٹیا، راجہ لوگ بڑے نازک مزاج ہوتے ہیں، ان کے سامنے ہر بات اچھی طرح کہنی پڑتی ہے نہیں تو وہ بال بچوں سمیت کولھو میں نہ پلوا دیتے" اسے خوف سا محسوس ہوتا تو خانسامن بوا اسے اپنے لپٹنے سے چپکاتے ہوئے سینے سے لگاتیں۔

اماں سے تو اس کا صرف اتنا ہی تعلق تھا کہ وہ کھیلتے کھیلتے باہر سے آتی تو ان کے لپٹ جاتی وہ اسے پیار کر کے پھر سے کھیلنے کی ہدایت کرتیں۔ ابا تو اسے صرف

دُور ہی دُور سے نظر آتے۔ صبح دفتر چلے جاتے اور شام کو بیٹھک دوستوں سے بھر جاتی۔ وہ سب زور زور سے باتیں کرتے، قہقہے لگاتے اور خانساماں بوا ان کے لیے چائے بناتی رہتیں۔

اس کے بعد وہ اسکول میں داخل کر دی گئی۔ اب تو اس کی دنیا اور بھی وسیع ہو گئی تھی اس کی کئی ساتھی لڑکیاں اسکول میں آ گئی تھیں اور دوسری نئی نئی لڑکیوں سے دوستیاں بڑھ رہی تھیں۔ جب وہ پڑھ کر آتی تو صفدر بھائی اپنے پاس بلاتے، پڑھنے کے سلسلے میں سوالات کرتے۔ اس کے ہر جواب پر زور سے ہنستے "واہ تم کو تو کچھ نہیں آتا۔" وہ اُسے سخت بُرے لگتے۔ اور وہ جلدی سے بھاگنے کی کوشش کرتی۔

جب وہ پانچویں کلاس میں پڑھتی تھی تو اُس نے خانساماں بوا کے مشورے سے سلیقے والے کھیل کھیلنا شروع کر دیے تھے۔ صحن کے ایک کونے میں گڑیوں کا ایک بڑا سا گھروندہ بنایا گیا۔ اس گھروندے میں گڑیوں کی شادی ہوتی، دھوم سے برات نکلتی گڑیوں کے بچے پیدا ہوتے، آپا سے دھول کی ہوئی کترنوں کترنوں سے کپڑے سیئے جاتے، خانساماں بوا شادیوں اور پیدائشوں پر کھجوریں بنا کر دیتیں۔ کبھی کبھی زردہ بھی پکتا۔ اس دن کملا، اوشا اور رادھا چھوت نہ مانتیں، وہ سب کھلے خزانے زردہ کھاتیں۔

مگر یہاں تو کچھ بھی نہ تھا، اس نے باہر نکل کر ہر طرف نظر دوڑائی۔ چرواہے بکریاں ہانکنے کے لیے جا رہے تھے، دو چار ننگ دھڑنگ بچے بیٹھے مٹی سے کھیل رہے تھے۔ دُور چھوٹے چھوٹے کچے مکان دکھائی دے رہے تھے۔ اس کے گھر کے پاس تو صرف ایک ہی دو منزلہ مکان تھا یا پھر جیبا کسی کا گھر جو پیلی مٹی سے بنا ہوا تھا۔ وہ بڑی دیر تک اونچے دو منزلہ مکان کو دیکھتی مگر وہاں سے کوئی لڑکی نہ اُتری جسے وہ اپنا دوست بنا سکتی۔ ایک مرد سفید براق دھوتی کا پلو تھامے تیزی سے نیچے اُترا اور چلا گیا اس کے بعد گھر کی اوپری

منزل سے ہارمونیم پر گانے کی آواز آنے لگی۔ اس نے گیت کے بول دہرائے مگر اسے وہ بول کتنے غیر دلچسپ لگے تھے۔

درختوں پر پرند زور زور سے چہچہا رہے تھے۔ وہ بڑی بیزاری سے بیٹھک کی دہلیز پر بیٹھی رہی اس کا جی چاہ رہا تھا کہ خوب چیخ چیخ کر روئے، اپنے کپڑے پھاڑ ڈالے اور یہاں سے بھاگ جائے

"بٹیا، ہمارے پاس آجاؤ۔" چپراسی کی بیوی صحن کی کچی نیچی دیوار پر اُچک اُچک کر اسے بلا رہی تھی۔

"ہنہ!" وہ اندر آگئی۔

بہت سا سامان ٹھکانے لگ چکا تھا صحن میں آرام کرسیاں بچھ گئی تھیں اور چپراسی چائے بنا چکا تھا، آپا، صفدر بھائی، ابّا اور امّاں سب تھکے سے چپ چاپ بیٹھے تھے۔ اس سے کسی نے بات بھی نہ کی۔ بیچ صحن میں مہندی کا چھوٹا سا پودا لگا تھا جس کی پتیاں خوب ہری ہو رہی تھیں۔ اس نے لوٹے میں پانی بھر کر پودے میں ڈالنا شروع کر دیا۔

"چائے پیو ٹبّو" صفدر بھائی نے اس دن پہلی بار کچھ ایسے پیار سے بات کی کہ وہ ان کے پاس چلی گئی۔ اور اُن کے قریب والی کرسی پر بیٹھ گئی۔

"گھبرا رہی ہو ٹبّو" نئی جگہ ہے۔ کوئی ساتھ کھیلنے والا بھی نہیں۔" صفدر بھائی نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا تو وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ ایک صفدر بھائی تھے جو اس بات کو سمجھ سکتے تھے وہ اپنی کرسی پر بیٹھے بیٹھے اُن کی گود میں جھک گئی۔ امّاں نے بڑی سخت نظروں سے اس کی طرف دیکھا تو اس نے آنکھیں بند کر کے جیسے ان نظروں سے اپنے آپ کو محفوظ کر لیا۔ امّاں بڑے کرخت لہجے میں چپراسی کو سمجھانے لگیں "تمہارے ذمے باہر کے کام ہیں۔ تم گھر کے کام نہیں کر سکتے، فوراً ایک ماما کا انتظام کرو۔ مگر یہ خیال

رکھنا کہ جوان نہ ہو۔ ایسی عورتیں دو کوڑی کا کام نہیں کرتیں۔"

"بس کل تک آپ کی مرضی کا انتظام ہو جائے گا۔ سرکار۔"

شام ہو رہی تھی۔ ابا اپنی پتلی سی چھڑی اُٹھا کر باہر گھومنے چلے گئے۔ اماں نے ایک بار کنکھیوں سے صفدر بھائی کو گھورا۔ "جاؤ اب کھیلو" اماں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اُٹھایا اور جیسے رٹا ہوا جملہ استعمال کیا۔ وہ پھر باہر دہلیز پر جا کھڑی ہوئی۔ دو منزلے مکان کی پوری منزل سے دھواں اُٹھ رہا تھا۔ مندروں سے گھنٹوں کی تیز آوازیں آ رہی تھیں۔

"ہنہ! کھیلو، کس سے کھیلو، یہاں اس جنگل میں کون ہے؟" اس کا جی بھر رہا تھا۔ "گھر کے اندر ہو یا پھر اس دہلیز پر بیٹھو اور کھیلو کھیلو کہے جاؤ۔" وہ بڑبڑا رہی تھی۔ "اس پر سب لوگ مُنھ بنا کر بیٹھے ہیں۔" وہ گھٹ گھٹ کر رونے لگی۔

"آؤ بٹیا روٹی کھاؤ۔" جیراسی کی بیوی دیوار پر اُچک رہی تھی۔ اس نے جلدی سے آنسو پونچھ کر مُنھ پھیر لیا۔

"عالیہ، بٹو۔" آپا بڑی بڑی آنکھیں جھکائے اس کے پیچھے آ کھڑی ہوئیں۔ "چلو اندر اب اندھیرا ہو رہا ہے، ہائے کتنی خوبصورت جگہ ہے یہ بھی۔" انھوں نے بھی ٹھنڈی سانس بھر کر دُور دُور دیکھا اور پھر اسے اپنی کمر سے لپٹائے اندر آ گئیں وہ بیٹھک کے پاس والے چھوٹے کمرے سے گزر رہی تھیں تو ایک لمحے کو ٹھٹھک کر کھڑی ہو گئیں۔ صفدر بھائی میز پر رکھی ہوئی لالٹین کے پاس جھکے کوئی کتاب پڑھ رہے تھے۔

صحن میں قطار سے پلنگ بچھے ہوئے تھے۔ آپا کا پلنگ مہندی کے پودے کے پاس بچھا ہوا تھا۔ ان کے پاس اس کا پلنگ تھا وہ اپنے بستر پر خاموشی سے لیٹ گئی۔ چاند اُبھر رہا تھا، آسمان روشن تھا مگر آپا کا چہرہ صحن کے ہلکے سے اندھیرے میں آسمان سے

بھی کہیں زیادہ صاف نظر آرہا تھا۔ اسے تو اس دن احساس ہوا کہ آپا ہر وقت گم رہتی ہیں۔ اس وقت بھی وہ اپنے بستر پر بیٹھی بڑے کھوئے انداز سے مہندی کی پتیاں نوچ نوچ کر بکھیر رہی تھیں۔

دالان کی محراب کی بیچ میں رکھی ہوئی لالٹین کی لو بہت نیچی تھی چھبراسی باورچی خانے میں کھانا پکا رہا تھا۔ اماں دوسری لالٹین ہاتھ میں اٹھائے کمروں میں جانے کیا کرتی پھیرتی تھیں۔

"جب تم اسکول میں داخل ہوگی تو پھر بہت سی لڑکیاں دوست بن جائیں گی" آپا نے اس کی طرف کروٹ لے کر اس کا ہاتھ تھام لیا اور ہولے ہولے سہلانے لگیں مگر دکھ کے شدید احساس نے آپا کی محبت کا ذرا بھی اثر نہ لیا۔ ہاتھ چھڑا کر اس نے منھ پھیر لیا پھر کا سمان پر اڑتے ہوئے پرندوں کو دیکھنے لگی اور اُسے پتہ بھی نہ چلا کہ کب نیند کا جھونکا آگیا۔

"ارے ٹبّو بغیر کھانا کھائے سو رہی ہو" اس نے چونک کر آنکھیں کھول دیں۔ صفدر بھائی اس پر جھکے ہوئے تھے۔

"کیا ضرورت تھی ابھی سے جگانے کی؟" اماں اس لہجے میں بولیں جیسے وہ چھبراسی کو ہدایت دے رہی تھیں۔ صفدر بھائی اس کے پاس سے ہٹنے والے تھے کہ اس نے اُن کا ہاتھ پکڑ لیا اور پھر لیٹے لیٹے جھک کر ان کی ٹانگوں سے لپٹ گئی۔ صفدر بھائی نے دو ایک بار اماں کو نیچی نیچی نظروں سے دیکھا اور پھر اس کا سر گود میں رکھ کر بیٹھ گئے۔

"کہانی سنائیے۔ صفدر بھائی، یہاں تو خانسامن بوا بھی نہیں" اس نے بھرائی آواز میں کہا۔

"کون سی کہانی ٹبّو؟"

"اسی شہزادی کی جس کے ابا نے اُسے ڈولے میں بٹھوا کر جنگل میں چھڑوا دیا تھا

اس نے اماں کی پروا کیے بغیر کہانی کی فرمائش بھی کر ڈالی۔ آپا جیسے ہستر اُٹھا اپنے بستر پر اُٹھ کر بیٹھ گئی تھیں۔

"میں تم کو دوسری کہانی سُناتا ہوں۔ ایک غریب لڑکا جو شہزادی سے محبت کرتا تھا، ہاں تو سُنو، ایک تھا لڑکا۔"

آپا گھبرا کر ادھر اُدھر دیکھ رہی تھیں۔

(۲)

بارش اب تیز ہو گئی تھی۔ ہوا جیسے دروازوں پر دستک دے رہی تھی۔ جمی سوتے میں جانے کیا کیا بڑبڑا رہی تھی۔ اس نے لحاف میں منھ چھپا لیا۔ اسے کتنی تفصیل سے ذرا ذرا سی باتیں یاد آرہی تھیں۔

صفدر بھائی کتنے وجیہ مگر کیسی مسکین صورت کے تھے۔ ان کی مسکینی کی وجہ اماں کی بھرپور نفرت تھی۔ ابا ان سے اس قدر محبت کرتے تھے۔ ان کی ذرا ذرا سی ضرورتوں کا خیال رکھتے۔ آپا صفدر بھائی سے بات تو نہ کرتیں مگر چوری چھپے ان کا خیال ضرور رکھتیں۔ اماں کو کس قدر دکھ تھا کہ صفدر بھائی ان کے شوہر کے پیسے سے پڑھ پڑھ کر ایف اے پاس کہلاتے ہیں اور روزگار کی پروا کیے بغیر ٹھاٹ سے الم غلم کتابیں پڑھا کرتے ہیں۔ اماں سارا دن جل جل کر کہا کرتیں کہ یہ کتابیں کس کی روزی کا سامان بن سکتی ہیں۔ یہ نکما مجھے کھا کر گھر سے نکلے گا۔"

وہیں اس نے ایک نیا نام سُنا تھا۔ "نجمہ پھوپھی"۔ یہ ابا کی سب سے چھوٹی بہن تھیں۔ جو علی گڑھ کالج میں پڑھتی تھیں اور وہیں ہوسٹل میں رہتی تھیں۔ چھٹیوں

میں وہ اپنے سب سے بڑے بھائی کے گھر چلی جاتی تھیں اماں کی صورت سے بیزار تھیں مگر اماں جب انھیں یاد کرتیں تو نفرت کا سانپ ہر طرف پھنکارنے لگتا۔ خیر وہ تو نظر دل سے دُور تھیں مگر صفدر بھائی تو ہر وقت آنکھوں کے سامنے تھے اور اماں کو ان سے پیچھا چھُڑانا ناممکن نظر آتا تھا۔

اماں اپنے دکھوں میں مگن رہتیں اور ابا اپنی دنیا میں مگن۔ دفتر سے آنے کے بعد وہ گھنٹہ آدھا گھنٹہ گھر میں گزارتے۔ اماں کسی نہ کسی بات پر لڑتیں اور ابا باہر کی راہ لیتے قسم قسم کے دوست آجاتے جن سے گھنٹوں جوش و خروش سے باتیں ہوتیں۔

ایک بار اس نے ابا کی باتیں سُننے کی کوشش کی تھی۔ مگر آزادی، رگانڈھی اور آزاد وغیرہ کے ناموں کے سوا اُس کے پلے کچھ بھی نہ پڑا تھا۔ وہ اُکتا کر دروازے کے پاس سے ہٹ گئی تھی۔ ہاں صفدر بھائی کو ان باتوں سے کچھ ایسی دلچسپی تھی کہ گھنٹوں سر جھکائے بیٹھے رہتے۔ دروازے کی اوٹ میں کھڑے ہو کر وہ اشاروں سے انھیں اٹھانا چاہتی مگر صفدر بھائی پر کوئی اثر نہ ہوتا وہ صفدر بھائی سے روٹھ جاتی۔ ان دنوں تو صفدر بھائی اس کی خوشیوں کا سہارا تھے۔

صفدر بھائی سے کیسی عام سی کہانی وابستہ تھی۔ یہ کہانی سُناتے ہوئے اماں کتنی مغرور معلوم ہوتیں۔ اس دن بھی جب وہ اور آپا اماں کے پاس بیٹھی تھیں تو اماں نے صفدر بھائی کی کہانی چھیڑ دی تھی۔

"اس صفدر بدذات کا باپ ایک غریب کسان کا بیٹا تھا۔ اس کا دادا اور باپ تمھارے دادا مرحوم کی زمینوں پر کام کرتے تھے۔ اس کے علاوہ گھر کے کاموں کو بھی نوکروں کی طرح انجام دیتے۔ جانے کیسے یہ بدبخت تمھاری دادی کے سر چڑھ گئے

تھے جو گھر میں کوئی ان سے پردہ بھی نہ کرتا۔ ویسے تمھاری دادی کی طبیعت تو گاؤں بھر میں مشہور تھی۔ ان کی سختی کا یہ عالم تھا کہ جب کسی نوکر چاکر سے ناراض ہوتیں تو بٹی ہوئی بتی لے کر اس کی کھال اُدھیڑ دیتیں۔ ہائے کیا غرور تھا، کیا رعب تھا، جدھر سے گزرتیں لوگوں کی روح قبض ہو جاتی۔ مگر صفدر کے باپ دادا سے ہمیشہ عنایت سے بولا کرتیں۔ تمھاری دادی کا تو یہ حال تھا کہ کبھی اپنے شوہر سے سیدھے مُنھ بات نہ کی اور اللہ مرحوم کو بخشے اُنھوں نے تمھاری دادی کو دُکھ بھی بہت دیئے تھے ان کی دو داشتائیں تھیں جن کے تین لڑکے تھے۔ دادا نے اپنی داشتاؤں کے لیے الگ الگ مکان بنوا رکھے تھے۔ انھیں تمھاری دادی کی حویلی میں آنے کی اجازت نہ تھی ہاں ان کے بچے حویلی میں آتے جنھیں تمھاری دادی ناموں کے ساتھ حرامی کہہ کر پکارتیں۔ ویسے ان دنوں داشتائیں رکھنا اتنی بڑی بات نہ سمجھی جاتی تھی۔ اسی لیے تمھاری دادی یہ سب کچھ برداشت کر لیتیں۔ جائز بیوی کی شان تو اسی طرح وہ بالا رہتی زمینداری کا سارا کام تمھاری دادی کے سپرد تھا دونوں داشتاؤں کے کھانے پینے کا سامان اپنے سامنے تلوا کر بھجوا دیا کرتیں۔"

"شادی کا معاملہ بھی خود تمھاری دادی طے کرتیں۔ انھوں نے تمھارے باپ اور چچاؤں کی شادی اپنی مرضی سے کی تھی۔ بہوؤں کو بہت دبا کر رکھتیں مگر انھوں نے مجھ سے کبھی زیادتی نہ کی۔ میں اُن کی طرح بڑے گھر کی بیٹی تھی۔ میرا بھائی انگلینڈ میں پڑھتا تھا۔ مجھ میں تمھاری دادی جیسا رعب تھا۔ تمھاری بڑی اور منجھلی چچی اُن کے سامنے ہوں نہ کر پاتیں۔ تمھاری دادی اگر کسی کے سامنے جھکتی تھیں تو وہ تمھارے سب سے چھوٹے چچا تھے۔ جب خلافت کی تحریک چلی تو وہ ترکی چلے گئے۔ پھر اُن کا پتہ نہ چلا کہ کہاں چلے گئے۔ پھر بھی تمھاری دادی نے کسی کے

سامنے ایک آنسو نہ بہایا۔ بیٹے کو یاد کرکے ایک آہ نہ بھری کہ کہیں ان کے رعب داب کی نظریں نیچی نہ ہو جائیں مگر اللہ کو کچھ اور ہی منظور تھا تمھاری سلمہ پھوپھی نے چودہ سال کی عمر میں ان کا منھ کالا کر دیا تمھاری دادی نے ایک دن اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا کہ وہ صفدر کے باپ کا ہاتھ پکڑے سرگوشیاں کر رہی ہیں۔ اس دن دادی نے سلمہ پھوپھی کو کمرے میں بند کرکے اتنا مارا کہ سارا جسم نیلا ہو گیا۔ جب میں ان کے جسم پر ہلدی چونا لگانے بیٹھی تو کانپ گئی پھر بھی یہ سزا تمھاری سلمہ پھوپھی کے لیے کتنی کم تھی۔ انھیں تو زندہ دفنا دینا چاہیے تھا۔"

"دوسرے دن انھوں نے صفدر کے باپ دادا کو زمینوں سے نکال دیا اور دو چماروں کو بلا کر حکم دیا کہ انھیں سب کے سامنے جوتے مار کر گاؤں سے نکال دیں۔ اسی دن شام کو نائن نے آکر بتایا کہ جانے صفدر کے باپ دادا سے کیا قصور ہوا کہ سب کے سامنے جوتے سے مارے گئے۔ وہ دونوں گاؤں سے چلے گئے۔ اس خبر کو سن کر دادی ایسے بے پناہ رعب سے اٹھ کر چلیں کہ سب کانپ گئے مگر تمھاری سلمہ پھوپھی جیتے جی مر گئیں۔ اس قصے کے بعد انھوں نے نہ تو ڈھنگ سے کپڑے پہنے اور نہ بالوں کی کنگھی کی، تمھاری دادی انھیں ہر وقت نظروں میں رکھتیں۔"

"ایک دن میں نے ان کو بڑی عجیب حالت میں دیکھ لیا۔ سردیوں کے دن تھے، تمھاری سلمہ پھوپھی دھوپ کھانے چھت پر گئی ہوئی تھیں۔ ان کے قریب چھت کی منڈیر پر جنگلی کبوتر بیٹھا غٹرغوں کر رہا تھا۔ اور سلمہ اس سے کہہ رہی تھی۔ "اے کبوتر تو شہزادیوں کے پیغام لے جاتا ہو۔ میرے حال پر رحم کر۔ ایک پیغام میرا بھی لے جا ان سے کہیو کہ سلمہ تیرے فراق میں تڑپتی ہے۔"

کبوتر تو خیر یوں ہی پھر سے اڑ گیا، مگر میں نے تمھاری دادی کو یہ بے شرمی کی باتیں

کہہ سنائیں۔ انھوں نے بڑی شفقت سے میرے سر پر ہاتھ پھیرا اور کہا کہ دوسری بہوؤں کو یہ باتیں معلوم نہ ہوں پھر بھی یہ بات تو سب کو معلوم ہو کر رہی اللہ جانے وہ کبوتر تھا کہ جن۔

"اس دن تمھارے دادا کہیں باہر گئے تھے اور کہہ گئے تھے کہ رات مہمان خانے میں رہیں گے۔ دادی نے اس رات سونے سے پہلے گھر میں تالا لگا کر چابیاں اپنے سرہانے رکھ لی تھیں مگر جب صبح ان کی آنکھ کھلی تو چابیوں کا گچھا اور تمھاری سلمہ پھوپھی دونوں غائب تھے۔ تمھاری دادی دم بخود بیٹھی تھیں اُنھوں نے سب کو ایسی نظروں سے دیکھا جیسے کہہ رہی ہوں کہ اگر مُنھ سے اُف کی تو زندہ گاڑ دوں گی، کتوں سے نچوادوں گی۔ دوسرے دن شام کو دادا واپس آئے تو دادی نے بند کمرے میں دیر تک باتیں کیں۔ جب وہ باہر نکلے تو ان کا چہرہ شرم اور غصّہ سے سُرخ ہو رہا تھا۔"

اتنا قصّہ کہہ کر اماں نے بڑی حسرت سے کہا تھا کہ — "کاش سلمہ میری بیٹی ہوتی تو پہلے ہی دن اسے اپنے ہاتھوں سے زہر کھلادیتی۔"

"تمھارے دادا جانے کیا کرتے مگر اسی دن تمھارے ابا چند دن کی چھٹی لے کر آگئے اور بڑی بے شرمی سے سلمہ کے حق میں اپنے ابا سے لڑتے رہے۔ میرا غیرت سے بُرا حال تھا۔ کاش تمھارے باپ سے میری شادی نہ ہوئی ہوتی۔ تمھاری دادی غصّے سے ٹہلتی رہیں مگر تمھارے ابا کی مونچھوں کی لاج رکھتے ہوئے مُنھ سے کچھ نہ بولیں، مگر تمھارے دادا کو جانے کیا ہوا کہ اسی وقت اپنی داشتاؤں کو گھروں سے نکال دیا اور گاؤں سے چلے جانے کا حکم بھجوادیا۔ دادی کو جب یہ بات معلوم ہوئی تو انھوں نے حکم دیا کہ صرف داشتائیں جائیں گی۔ مگر ان کے بچے نہیں جائیں گے۔ اس لیے کہ وہ ان کے شوہر کا خون تھے۔

"تینوں لڑکے گھر آگئے۔ توبہ، اُن کی صورتیں دیکھ کر گھن آتی تھی۔ دونوں چھوٹے لڑکے سارا دن بلّیوں کی طرح روتے۔ بڑا لڑکا دوڑ دوڑ کر گھر کے کام کرتا۔ دونوں چھوٹے لڑکے

ایسے نڈر بڑے تھے کہ برسات کے دنوں میں مکھیوں کی بھنکی ہوئی جھوٹی گٹھلیاں چوس چوس کر ہیضے میں مر گئے۔ ورنہ کیا پتہ کہ تمھارے ابا انھیں بھی آج کلیجے سے لگا کر کسی کالج میں پڑھوا رہے ہوتے۔

سلمہ نے بھاگ کر نکاح کر لیا۔ تمھارے ابا کی دھمکیوں سے ڈر کر تمھارے دادا نے بظاہر کچھ نہ کیا مگر جہاں کہیں سلمہ کے میاں نوکری کرتے۔ اُسے چھڑوا دیتے۔ سلمہ اور وہ دونوں بھوکے مرتے۔ سچی بات تو یہ ہو کہ انھیں تو کتوں کی طرح بھوکا مرنا چاہیے تھا۔ مگر تمھارے ابا نے انھیں انسانوں کی طرح مر جانے دیا۔ صفدر کی پیدائش پر سلمہ کو دق ہوگئی اور کچھ دن بعد ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر گئی۔

"جب دادی کو سلمہ پھوپھی کی موت کی خبر لگی تو جانے ان کی شرم کہاں گئی۔ اپنی بے حیا بیٹی کی موت پر سینہ کوٹ کوٹ کر رونے لگیں۔ مجھ سے تو قسم لے لو جو میری آنکھ سے ایک آنسو بھی گرا ہو۔ حیران ہو کر تمھاری دادی کو دیکھ رہی تھی جو نوکروں چاکروں کے بیچ میں لوٹ لوٹ کر رُو رہی تھیں۔ اسی وقت انھوں نے اپنے تینوں بیٹوں کو تار کرا دیے۔ تمھارے ابا اور بڑے چچا اس کلموہی کی موت پر بھاگے چلے آئے مگر تمھارے منجھلے چچا نے سب کی عزت رکھ لی۔ انھوں نے اس جنم جلی کے سوتے پر آنے سے انکار کر دیا۔

"تمھاری دادی رو دھو کر چپ ہو گئیں مگر میری نظروں میں اُن کی ذرا بھی عزت نہ رہ گئی تھی۔ بس مجبور تھی جو خاموش رہی۔ تمھارے ابا اور بڑے چچا اس گاؤں چلے گئے جہاں سلمہ رہتی تھی۔ اور جب تمھارے ابا واپس آئے تو اس کلموہے صفدر کو سینے سے لگا لائے۔"

"سلمہ کو مرے چالیس دن بھی نہ ہوئے تھے کہ تمھارے دادا سجدے کے لیے جھکتے ہوئے اللہ کو پیارے ہو گئے۔ دیکھتے دیکھتے گھر تباہ ہو گیا۔ تینوں بیٹوں نے اس گاؤں

رہنا پسند نہ کیا اور جاگیر کو کھڑے کھڑے ایک نواب کے ہاتھوں بیچ کر اپنی ملازمتوں پر واپس چلے گئے۔ اگر وہ جائداد ہوتی تو آج میں دادی کی جگہ ملکہ بن کر بیٹھتی مگر نصیب میں تو یہ لکھا تھا اب تمھاری دادی اپنے بڑے بیٹے کے ٹکڑوں پر پڑی ایڑیاں رگڑ رہی ہیں اور اس فساد کی جڑ کی اولاد میری چھاتی پر مونگ دل رہی ہے۔ ہائے!"

اماں جب بھی آپا کو یہ قصہ سنائیں تو بڑے غور سے ان کی طرف دیکھتیں اور آپا جیسے گھبرا کر ان سے نظریں بچا لیتیں۔ اماں آپا سے تو کچھ نہ کہتیں مگر اُسے سمجھانے لگتیں "میری جان تم اس کلنک کے ٹیکے کے پاس زیادہ نہ اٹھا بیٹھا کرو۔ اس کے باپ دادا نے میرا راج پاٹ چھین لیا۔"

اماں کی اس نصیحت کا اُس پر ذرا بھی اثر نہ ہوا تھا۔ اُسے تو غصہ آتا کہ جب صفدر بھائی اتنے اچھے ہیں تو اماں اُن سے کیوں ناراض رہتی ہیں۔

ایک دن تو وہ اماں کی شکایت بھی کرنا چاہتی تھی مگر جب صفدر بھائی کے پاس گئی تو کچھ نہ کر سکی۔ "صفدر بھائی آپ مجھے بہت اچھے لگتے ہیں۔" وہ اُن کی تعریف کرنے لگی۔

"مگر میں بُرا کسے لگتا ہوں؟"

"کسی کو بھی نہیں!" اور وہ جلدی سے بھاگ آئی۔۔۔

جانے کون نچلی منزل کے دروازے کی زنجیر کھڑکھڑا رہا تھا۔ اس نے لحاف سے مُنھ نکال کر دیکھا۔ کمرے میں گھور اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ چچی جان کی آواز سُنائی دے رہی تھی۔

"ان شاعروں کا بُرا ہو، اتنی سردی میں لوگ اپنے گھروں سے کب نکلتے ہوں گے۔"

بادلوں کی گرج میں وہ اور کچھ نہ سن سکی۔

"اللہ!" اس نے جیسے بےچینی سے کروٹ بدلی۔ "ہو! اگر نیند آ ہی جائے تو کیا اچھا ہو۔"

(۳)

صحن میں کینوس کی آرام کرسیاں بچھ گئی تھیں۔ چھوٹی میز پر آپا کے ہاتھ کا کاڑھا ہوا میز پوشش پڑا تھا۔ ماما میز پر چائے کے برتن لگا رہی تھی۔ اور اماں ایک ساں ہدایتیں دیئے جا رہی تھیں۔ آپا مہندی کے چھوٹے سے پودے پر پانی چھڑکنے کے بعد اماں کے پاس آ بیٹھیں۔ صفدر بھائی ابا کے پاس والی کرسی پر بیٹھے تھے۔ وہ ابا کے پاس کھڑی تھی۔ مگر کوئی بھی تو اُس کی طرف متوجہ نہ تھا۔ سب بیزار تھے۔ اس نے کئی بار آپا کے ہاتھ پر ہاتھ رکھا لیکن وہ صرف مُسکرا کر رہ گئے۔ اماں صفدر بھائی کو گھور گھور کر دیکھ رہی تھیں

آپا نے اس طرح جلدی جلدی چائے پی جیسے کسی ضروری کام سے جا رہی ہوں، مگر اس کی چائے پڑی ٹھنڈی ہو رہی تھی۔ اس نے مارے غصّہ کے پیالی کو ہاتھ بھی نہ لگایا۔ وہ کتنی سخت رنجیدہ ہو رہی تھی۔ بھلا یہ بھی کوئی گھر ہے۔ جہاں سب لوگ منھ پھلائے بیٹھے ہیں۔ کیا اچھا ہوتا کہ وہ اس جگہ نہ آئی ہوتی۔ یہیں آ کر تو اُس نے سب کے پھولے ہوئے مُنھ دیکھے تھے۔ وہ نہ جانے اور کیا کیا سوچ کر سب سے ناراض ہو گئی تھی اور وہاں سے ہٹ کر مہندی کی پتیاں نوچنے لگی۔

تم چائے نہیں پیوگی بیٹی؟" ابا نے پوچھا مگر وہ چُپ رہ کر اپنی خفگی کا اظہار کر رہی تھی، اس کا جی چاہ رہا تھا کہ خوب زور سے چیخے۔ "نہیں پیتے، بلا سے ٹھنڈی ہو جائے کسی کا اجارہ ہے۔؟"

"کوڑا کیوں کر رہی ہو؟" اماں نے سختی سے پوچھا اور وہ اُٹھ کر آپا کے پیچھے ہولی جو لمبے لمبے قدم رکھتی اپنے کمرے کی طرف جا رہی تھیں۔

سب مُنھ بنائے بیٹھے رہتے ہیں آپا۔" اس نے بڑے دکھ سے فریاد کی۔ "یہاں تو لڑکیاں

بھی نہیں جن کے ساتھ کھیلوں کودوں تو جی بہل جائے۔"

"ارے ہو تم اتنی بڑی ہو رہی ہو اور تم کو اتنا بھی نہیں معلوم کہ جب گھر میں لڑائی ہو تو سب چُپ چُپ رہتے ہیں، دوپہر میں اماں اور ابا میں کھٹ پٹ ہو گئی تھی۔" اس دن پہلی بار آپا اس کو بڑا سمجھ کر سنجیدگی سے باتیں کر رہی تھیں۔

لڑائی ہوئی؟"

"بس یہی کہ اماں کو صفدر بھائی سے نفرت ہے جب تک وہ اس گھر سے نہیں جاتے یہ لڑائیاں بھی نہیں ختم ہوں گی۔"

پھر کمرے کے ہلکے سے اندھیرے میں آپا اسے اپنے پاس بٹھا کر سرگوشیاں کرنے لگیں۔ "جب تمہارے صفدر بھائی چھٹے درجے میں پڑھتے تھے تو میں بالکل چھوٹی سی تھی مگر مجھے سب یاد ہے، ایک بار اماں نے ان کو بے حد مارا تھا جب ابا کو معلوم ہوا تو وہ اماں سے روٹھ کر ٹھاکر صاحب کے گھر چلے گئے تھے پھر ٹھاکر صاحب نے بڑی مشکل سے ابا کو راضی کر کے گھر بھیجا تھا بس اس وقت سے اماں صفدر بھائی سے اور بھی نفرت کرنے لگیں۔ کیسے بے شرم ہیں یہ تمہارے صفدر بھائی بھی جو یہاں سے جاتے نہیں، اب تو اس لائق بھی ہو چکے ہیں کہ کما کھائیں، مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اماں کی ہدایت پر نوکرانی صفدر بھائی کو گرمیوں میں دو دو وقت کا سڑا ہوا کھانا کھلاتی تھی، چلو بھر دودھ میں ڈھیروں پانی ملا کر پینے کو دیتی اور گوشت پر کے چھیچھڑے کاٹ کر ان کے لیے قیمہ پکا دیتی۔ مگر صفدر بھائی نے کبھی ابا سے شکایت نہ کی۔ ایک دن خود ابا کو جانے کیا سوجھی کہ ان کا کھانا دیکھنے بیٹھ گئے۔ اس کے بعد صفدر بھائی کو اپنے ساتھ کھانا کھلانے لگے، اس کے بعد بھی صفدر بھائی کی صحت خراب ہی رہی۔"

"ہے، چھیچھڑے تو کتوں کو کھلاتے ہیں، وہ تھا نہ آپا ہمارا چھوٹا سا کتا ٹامی اُسے بھی تو چھیچھڑے اُبال کر دیے جاتے تھے؟" اس نے کہنے کو تو کہہ دیا مگر آپا ایک دم سسکنے

لگیں اور وہ حیران ہو کر رہ گئی۔

"تم صفدر بھائی سے زیادہ نہ بولا کرو۔" آپا نے آنسو پونچھ کر جلدی سے کہا اور پھر ہنسنے لگیں۔

وہ آپا کی ہدایت کی پروا کیے بغیر باہر آگئی۔ سب اسی طرح بیزار بیٹھے تھے اور کہیں بہت دور سے اذان کی آواز آ رہی تھی۔

"صفدر بھائی، باہر گھومنے چلیں؟" اس نے اماں کی طرف جا کر دیکھے بغیر کہا مگر صفدر بھائی بالکل خاموش رہے۔

"اب اسے اسکول میں داخل کرا دو، ورنہ یوں ہی ماری ماری پھرے گی۔" اماں نے تیز لہجے میں کہا۔

"معلوم کروں گا، سنا ہے یہاں بس ایک ہی مشن ہائی اسکول ہے اور وہاں صرف انگریزی پڑھائی جاتی ہے یا پھر اپنے مذہب کی تبلیغ ہوتی ہے۔ میں انگریزوں کے ان اسکولوں کے سخت خلاف ہوں یہ ہماری غلامی سے ہر طرح کا فائدہ اٹھاتے ہیں۔"

"بات تو ساری یہ ہے کہ تم انگریزوں کے خلاف ہو، ان کی نوکری کرو گے مگر بیٹی کو ان کے اسکول میں نہیں پڑھاؤ گے، بس اس خاندان میں تو صرف تمہاری بہن اور بھانجا پڑھے گا۔ تمہاری ایک صاحبزادی دس درجے پڑھ کر گھر بیٹھ رہیں، انھیں خیر سے قصے کہانیوں کی واہیات کتابیں دے دے کر تباہ کیا اب دوسری کو انگریز دشمنی کے سپرد کر دو۔" اماں ایک دم بپھر گئیں۔

اس نے گھبرا کر صفدر بھائی کی طرف دیکھا۔ وہی تو آپا کو کتابیں دیتے تھے۔ صفدر بھائی جیسے بوکھلا کر اپنے کمرے کی طرف بھاگے۔ اور ابا نے کرسی کی پشت سے سر لگا کر آنکھیں بند کر لیں۔ وہ اس وقت کتنے زخمی نظر آ رہے تھے۔

وہ لڑائی کے خوف سے باہر آ گئی۔ بیٹھک کے سامنے والے چبوترے پر دو آرام کرسیاں

پڑی تھیں ۔ وہ وہاں بیٹھ کر پاؤں ہلانے لگی ۔ دوسرے مکان سے ہارمونیم پر گانے کی آواز آ رہی تھی ۔

کون گلی گیو شیام، بتادے کوئی ـــــ کاشی ڈھونڈا ، بندرا ڈھونڈا

گوکل میں ہوگئی شام، بتادے کوئی ـــــ کون گلی گیو شیام ، بتادے کوئی

وہ چپکے چپکے بول دُہرانے لگی ۔ گانا بجانا اُسے کتنا اچھا لگتا مگر اماں کے ڈر سے کبھی گانے کا نام نہ لیا وہ تو اماں کے مُنھ سے یہی سُنتی رہتی تھی کہ شریفوں کے گھروں کی لڑکیاں نہیں گاتیں ۔

چبوترے پر بیٹھے بیٹھے شام کا اندھیرا چھانے لگا ۔ مندروں سے گھنٹوں کی آواز آ رہی تھی اور ڈھیروں پرندبسیرا لینے کے لیے درختوں پر شور مچا رہے تھے ۔ سامنے کچی سڑک پر بیلوں کا ریوڑ دھول اُڑاتا گزر رہا تھا ۔ وہ انھیں گننے لگی مگر جی نہ لگا ۔ گھر میں لڑائی دیکھ کر وہ کتنی رنجیدہ ہوگئی تھی ۔

" اندر چلو ، بٹو رات ہو رہی ہے " جب صفدر بھائی نے اُسے اٹھایا تو وہ اُن سے لپٹ کر رونے لگی ۔

" جب تم اسکول میں داخل ہو جاؤ گی تو دل بہل جائے گا " صفدر بھائی نے کس طرح اُسے سینے سے لگا یا ۔ جیسے مارے مامتا کے تڑپ رہے ہوں ۔

ماما لالٹین ہاتھ میں لیے جانے ادھر سے اُدھر کیا کرتی پھرتی تھی ۔ ابا اور اماں اس طرح بیزار بیٹھے تھے ۔

" گھوم آئیں ؟ " ماں نے سختی سے سوال کیا اور اس کے جواب کا انتظار کیے بغیر ابا سے مخاطب ہوگئیں

" میں کہتی ہوں کہ اسے فوراً اسکول میں داخل کراؤ ۔ مجھے تو اپنی اسی لڑکی پر ارمان

پورے کرنے ہیں۔ تمھارے ارمان تو بہن اور بھانجے پر پورے ہو گئے۔"

"صفدر میاں تم اپنے کمرے میں جاؤ۔" ابا نے نرمی سے کہا اور حسبِ معقدر بھائی اپنے کمرے میں چلے گئے۔ تو ابا ایک دم سخت ہو گئے۔ "مجھے مشن اسکولوں سے نفرت ہے، میں اسے نہیں پڑھاؤں گا۔ بے شک جاہل رہے گی۔"

"یہ تو میں دیکھوں گی کہ جاہل رہے گی یا پڑھے گی۔ تم کو تو اللہ واسطے کا بیر ہے انگریزوں سے جس تھالی میں کھایا اسی میں چھید کرو۔" اماں کی آواز میں اس بلا کا طنز تھا کہ ابا کرسی سے اچھل پڑے

"میں تو صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ تم نے میری اجازت کے بغیر اپنے بھائی کے پاس میرے روپے کیوں رکھائے؟ میں تو اپنے بچوں سے مجبور ہو کر نوکری کر رہا ہوں۔ اگر تم وہ روپے غائب نہ کیے ہوتے تو میں اُن سے کوئی تجارت کر لیتا۔"

"کون سے روپے؟" اماں جیسے بلبلا اٹھیں۔

"وہی جو زمین بیچنے کے بعد میرے حصے میں آئے تھے؟"

"خوب! وہ روپے تو عالیہ اور تہمینہ کے لیے ہیں، یہاں کیوں رکھتی؟ اسی لیے نا کہ تمھاری بہن اور بھانجے کے کام آ جاتے، میں اب ایسی بدھو نہیں ہوں۔" اماں ہنسیں

"میں تمھارے بھائی پر دعویٰ کر دوں گا۔"

"جانتے ہو میرے بھائی کی بیوی انگریز ہے۔" اماں نے بڑے غرور سے سر اونچا کر لیا۔

"وہ تو میں جانتا ہوں، تمھارے بھائی بے چارے یوں ہی پھرتے تھے، انگریزی بیوی لا کر بڑا عہدہ ملا ہے۔" ابا اس طرح بات کر رہے تھے جیسے گالی دے رہے ہوں۔

"تم کو نوکری کرتے بارہ پندرہ سال ہو گئے مگر بڑا عہدہ نہ ملا۔ اس لیے اب جلو گے نہیں تو اور کیا کرو گے۔" اماں نے حقارت سے جواب دیا۔

"اوہ!" ابا نے سخت بیزاری سے منھ پھیر لیا اور پھر دالان کے کونے میں کھڑی

ہوئی چھڑی اُٹھاکر باہر چلے گئے۔ اماں دوپٹے کا پلّو منھ پر ڈال کر دھیرے دھیرے رونے لگیں آپا آکر انھیں سمجھانے لگیں، تو اُنھوں نے آنسو پونچھ لیے۔

"میں نے وہ روپے تم دونوں بہنوں کے لیے جمع کرائے ہیں ورنہ صفدر اور نجمہ پڑھ جاتے"

اماں نے رندھی ہوئی آواز میں کہا اور لمبی لمبی آہیں بھرنے لگیں۔

اس وقت اُسے محسوس ہو رہا تھا کہ صفدر بھائی بھوت ہیں جو سب کچھ کھا جائیں گے اماں کے لیے اس کا جی تڑپ اٹھا تھا۔ یہ چاہتی تھی جاکر اماں کے لپٹ جائے مگر مارے گھبراہٹ کے اپنے بستر پر لیٹ گئی۔

پورا چاند بھر چکا تھا۔ ہارمونیم پر گانے کی مدھم مدھم آواز آرہی تھی۔

جو میں جانتی بچھڑت ہو پیا گھونگھٹ میں آگ لگا دیتی۔

وہ گیت سنتے سنتے سو گئی۔ سوتے میں ایک بار اُس نے محسوس کیا کہ کوئی اُسے اٹھا رہا ہے۔ مگر وہ نہ اٹھی۔ جانے رات سب نے کھانا بھی کھایا تھا کہ نہیں۔

(۴)

وہاں آئے کچھ ہی دن گزرے تھے کہ ابا کی بیٹھک آباد ہو گئی۔ کسم دیدی کے پتا جی بھی آنے لگے تھے۔ اماں ہر وقت غصّہ سے بھری رہتیں۔ "یہ سب بیکار لوگ ہیں انھیں دنیا کا کوئی کام نہیں بیٹی دن رات گاتی ہے اور باپ سیاست بگھارتا ہے۔"

کسم دیدی اماں کو ایک آنکھ نہ بھاتی تھیں۔ نفرت کی سب سے بڑی وجہ تو یہی تھی کہ اُن کے پتا جی انگریز راج کے خلاف تھے، اس پر ظلم یہ کہ ہندو تھے اور ان کی بیوہ بیٹی گاتی بجاتی رہتی تھی۔

اماں کو کسم دیدی سے ذرا بھی ہمدردی نہ تھی۔ حالانکہ انھوں نے دوسری ہی

ملاقات پر اپنی ساری بپتا کہہ سنائی تھی۔ "میں تو اس وقت چودہ پندرہ سال کی تھی۔ شادی کے صرف تین مہینے ہوئے تھے، "وہ" ان دنوں امرت سر میں بدلی ہو کر گئے تھے۔ جس دن وہ جلیاں والا باغ کے جلسے میں شریک ہونے گئے تو ساس سسر نے بہترا روکا مگر وہ اُن کی باتوں پر ہنستے رہے۔ میں اپنے ساس سسر کی باتیں سن سن کر پاگل ہوئی جا رہی تھی۔ پر مارے لاج کے کچھ نہ کہہ سکی۔ گھونگھٹ کے اندر سے اُن کے اُٹھتے ہوئے پاؤں دیکھتی رہی وہ تو کہتے تھے کہ مجھے تم سے بڑی محبت ہو گئی ہے پر جاتے سمے میرے دل کی مرضی نہ پوچھی وہ ہنستے ہوئے چلے گئے اور کبھی نہ مڑے۔ میں اُن کی راہ تک تک کر تھک گئی مجھے بیوہ جان کر سب میرے سائے سے بچتے ہیں۔ پر جانے کیا بات ہو کہ میں آج تک اپنے کو بیوہ نہیں سمجھتی۔ میں بیوہ ہوں موسی؟" کسم دیدی نے اماں کی طرف دیکھ کر پوچھا تھا اور پھر جانے کیوں چھت تکنے لگی تھی۔ اماں نے اپنے سامنے پاندان کھینچ لیا تھا اور وہ جانے کیوں اس وقت کسم دیدی سے لپٹ گئی تھی۔

"اگر انھیں مجھ سے محبت ہوتی تو کبھی نہ جاتے، انھیں تو صرف اپنے دیش سے محبت تھی۔ اب میں اپنی محبت کو کہاں لے جاؤں، انھوں نے تو یہ بھی نہ سوچا کہ میرے سینے میں بھی دل ہے۔" کسم دیدی نے جیسے فریاد کی اور پھر ساری کے پلو میں منھ چھپا لیا اماں نے شاید ان کی بے شرمی سے گھبرا کر منھ پھیر لیا تھا۔

کسم دیدی جب پہلی بار اس کے گھر آئی تھی تو اُسے ایسا محسوس ہوا تھا کہ کہانیوں کی پری آ گئی ہے۔ اس دن وہ گھر سے بیزار ہو کر باہر چبوترے پر بیٹھی تھی۔ ابھی دن تو سخت فساد کے بعد صفدر بھائی اُسے اسکول میں داخل کرا ئے تھے۔ صفدر بھائی نے شاید پہلی بار ابا کی مرضی کے خلاف کوئی حرکت کی تھی مگر ابا نے انھیں ایک لفظ نہ کہا تھا صرف اماں سے بات نہ کی۔ جب وہ بولتیں تو ابا منھ پھیر لیتے۔

کسم دیدی اپنے دو منزلہ مکان سے اُتر کر ان کے پاس آ کھڑی ہوئی تھیں۔ ننھے ننھے گورے پاؤں چاند کے دو ٹکڑے معلوم ہو رہے تھے اور ان کی لانبی موٹی آنکھوں میں کیسی آسیبی سی کیفیت تھی وہ اس کا ہاتھ تھام کر کتنے پیار سے مسکرائی تھیں۔

"میں رائے صاحب کی بیٹی ہوں، تمہاری اماں سے ملنے کو آئی ہوں۔" انھوں نے دھیرے سے کہا تھا اور اُسے کہانیوں کی وہ شہزادی یاد آگئی تھی جس کے منھ سے بات کرتے وقت پھول جھڑتے تھے۔

تہمینہ آپا اور کسم دیدی کی ایسی دوستی گٹھی کہ دونوں گھنٹوں کمرے میں جانے کیا کیا باتیں کیا کرتیں۔ اماں اتنی دیر تک جلی جلی پھرتیں اور جب کسم دیدی اپنے گھر چلی جاتیں تو اماں کو کوئی نہ کوئی بُری سی بات یاد آ جاتی۔ "کمبخت کافروں میں کیا بُرا طریقہ ہے کہ دوسرا نکاح نہیں کرتے۔ کیسا عذاب ہوتا ہے۔ جوان جہان عورت کو بٹھائے رکھنا، ہمیں پتہ ہے کہ یہ جوان جہان بیوائیں کس طرح ہنڈیا میں گڑ پھوڑتی ہیں۔"

آپا سر جھکا کر سب کچھ سُن لیتیں مگر اُسے ایسی باتیں بڑی بُری لگتیں۔ کسم دیدی تو چوری چھپے اسے ہارمونیم بھی سکھانے لگی تھیں۔

"کسم دیدی تو گڑ کھاتی ہی نہیں جو پھوڑیں گی۔ انھیں گڑ سے نفرت ہے" وہ غصہ سے چیخ پڑی تھی اور اماں کھل کھلا کر ہنس دیں۔ اس دن اس نے آپا سے بھی بات بھی نہ کی تھی۔ "ایسی خاموشی کس کام کی کہ اپنی سہیلی کی طرف سے بولتی تک نہیں۔ بڑی آپا میں کہیں کی۔" وہ چپکے چپکے بڑبڑاتی رہی۔

(۵)

اس روز شام کو زور سے آندھی چلی اور بادل گھر کر آ گئے۔ شاید جون کے آخری دن تھے

ساری رات بادل چھائے رہے اور کسی کسی وقت ہلکی سی بارش ہو جاتی۔ اماں اور ابا کمرے میں سو رہے تھے وہ آپا کے ساتھ برآمدے میں سو رہی تھی۔ کسی وقت ہوا تیز ہوتی تو بوچھار پائنتی تک آتی اور اس کی آنکھ کھل جاتی مگر ایک بار جو اس کی آنکھ کھلی تو آپا اپنے بستر میں نہ تھیں۔ بادل دھیرے دھیرے دھمک رہے تھے۔ اسے ڈر لگا مگر آپا چند ہی منٹ میں آ گئیں۔ پر وہ اکیلی نہ تھیں۔ صفدر بھائی بھی ساتھ تھے اسے سخت حیرت ہوئی کہ کیا آپا راتوں کو صفدر بھائی سے بات کرتی ہیں۔ کیا وہ اماں سے اتنا ڈرتی ہیں۔

آپا بلیوں جیسی چال سے آئیں اور جب اپنے بستر پر لیٹنے لگیں تو صفدر بھائی نے انہیں لپٹا لیا پھر ان کے چہرے پر جھکے رہے۔ اس نے مارے حیرت کے سانس تک روک لی تھی۔ سلمہ پھوپھی کی کہانی اسے یاد آ رہی تھی۔ اس وقت اس کے کتنے عجیب سے احساسات ہو رہے تھے۔

صبح جب آپا اسے اسکول جانے کے لیے تیار کر رہی تھیں تو اس نے دھیرے سے پوچھا تھا۔ "آپا رات تم کہاں چلی گئی تھیں؟"

"ایں!" مارے خوف کے آپا کے ہونٹ نیلے پڑ گئے تھے۔

"میں کوئی اماں سے تھوڑی کہوں گی، میں کسی سے نہیں کہوں گی۔" اس نے بوڑھی عورتوں کی طرح آپا کو تسلی دی تو انھوں نے اُسے لپٹا لیا۔ ان کا سارا جسم خوف سے کانپ رہا تھا۔

"اگر تم نے اماں سے کہہ دیا تو وہ جانے کیا کریں گی بسلمہ پھوپھی کے ساتھ بھی جو کچھ نہ ہوا ہوگا۔ بٹو تمہارے صفدر بھائی مجھے اچھے لگتے ہیں۔ بس اتنی سی بات ہو!"

"وہ خود مجھے اچھے لگتے ہیں، میں بھلا اماں سے کہہ سکتی ہوں۔ کہیں اماں بھی انھیں چھپکلی سے جوتے ——"

آپا نے جلدی سے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا - ان کا رنگ ہلدی کی طرح زرد ہو رہا تھا — "میں ان کو یہاں سے بھگا دوں گی۔"

"یہ بات ٹھیک ہے۔"

دالان میں صفدر بھائی کھڑے تھے - وہ ان کے ساتھ اسکول چلی گئی - مگر وہاں بھی اس کا جی نہ لگا - صفدر بھائی کہتے تھے کہ اسکول جا کر جی بہل جائے گا - مگر وہ تو بڑی ہوتی جا رہی تھی - ہر بات کا اس کے دماغ پر اثر ہوتا - رات کا قصہ بار بار یاد آتا اور وہ انجام کے خوف سے ایک لفظ بھی نہ پڑھ سکی تھی -

(۶)

اس دن اسکول کی نگراں نے گھر آنے کو کہا تھا - اماں اور آپا سارا دن گھر سجاتی رہیں - دیواروں میں تنے ہوئے مکڑی کے جالے تک صاف کیے گئے - صفدر بھائی گیندے اور گل عباسی کے پھول لے آئے جو نیلے گلدانوں میں سجا دیے گئے - ماما نے بالٹیاں بھر بھر کر صحن دھو دیا اور وہاں مہندی کے پودے کے پاس آرام کرسیاں اور میز بچھا دی گئی - میز پر آپا کے ہاتھوں کا کڑھا ہوا سب سے خوبصورت میز پوش بچھایا گیا - چائے کے لیے نیا جاپانی سٹ نکالا گیا - وہ سٹ بھی وقت نکالا جاتا جب خاص قسم کے مہمان آتے - چائے کے ساتھ کھانے کو کئی چیزیں تلی گئیں - اماں اس دن بے حد خوش اور مصروف نظر آ رہی تھیں - دوپہر میں انھوں نے نہ خود آرام کیا نہ ماما کو کمر ٹکانے دی -

"بھئی حد ہے، انگریز ہو کر خود ہمارے گھر آنے کو کہا" — اماں بار بار آپا سے کہتیں اور کھلی جاتیں -

اماں کی اس بات پر اس نے کئی بار محسوس کیا تھا کہ صفدر بھائی اپنی مسکراہٹ

روکنے کے لیے ہونٹ بھینچ لیتے ہیں۔

"میرا خیال ہے کہ زیادہ لوگوں کو چائے پر نہ شریک ہونا چاہیے، وہ انگریز ہے شاید اسے پسند نہ کرے" چار بجنے میں جب تھوڑی سی دیر رہ گئی تو اماں نے تیوری پر بل ڈال کر اپنے حساب بڑی عام سی بات کی اور صفدر بھائی اسی وقت اپنے کمرے میں چلے گئے۔

ٹھیک چار بجے مسز ہارروڈ آگئیں اماں اور آپا نے ان کا خیر مقدم کیا۔ مسز ہارروڈ کی نیلی کانچ کی گولیوں جیسی آنکھیں گھوم گھوم کر گھر کا جائزہ لے رہی تھیں وہ کرسی پر بیٹھتے ہی جلدی جلدی بولنے لگیں۔

"آپ لوگوں سے مل کر ہم بہت خوش ہوا ہے۔ آپ کا گھر بڑا اچھا ہے۔ بڑا صاف ہے۔ دوسرا یہاں کا لوگ تو بڑا گندا گھر رکھتا ہے، بڑا بیگم بھی گھر صاف نہیں رکھتا۔ ہم پھر جرور آئے گا۔ آپ لوگ کے پاس۔"

"ہاں!" اس ملک کے لوگ بڑے گندے ہوتے ہیں۔ ہماری بھابی یعنی ہمارے بھائی کی بیوی انگریز ہے" اماں نے بڑے فخر سے کہا۔

"اچھا!" نیلی کانچ کی دونوں گولیاں مارے حیرت کے ٹوٹتی نظر آنے لگی تھیں۔

مسز ہارروڈ کی گہری نیلی آنکھیں اُسے کتنی پیاری لگی تھیں۔ اسکول میں جب وہ اُن کے کمرے میں جاتی تو چپکے چپکے ان کی آنکھوں کو دیکھتی رہتی۔

"یہاں کی عورتیں مرغیاں پالتی ہیں اور ان کی گندگی ۔۔۔" اماں جانے اور کیا کہتیں کہ آپا بیچ میں بول اُٹھیں۔

"اب چائے پی جائے۔"

جب سے صفدر بھائی اماں کی بات پر اپنے کمرے میں چلے گئے تھے، اس وقت سے آپا بیزار ہو رہی تھیں۔ ان کے چہرے پر اچانک تھکن کے آثار پیدا ہو گئے تھے۔

"ہاں ہاں تہمینہ، بیٹی، ماما سے کہو۔" چائے کے نام پر اماں بوکھلا گئیں۔ ان کا چہرہ پھیکا پڑ گیا۔ جس وقت ابا دفتر جا رہے تھے تو اماں نے ان سے کئی بار کہا تھا کہ چائے کے وقت پہنچ جائیں تاکہ مسز ہارورڈ سے انگریزی میں باتیں کر کے اسے خوش کر سکیں۔

"تم ہمارے پاس بیٹھنا مانگتا ہو عالیہ؟" مسز ہارورڈ نے اس کو پیار سے دیکھا اور وہ آپا کے پاس سے سرک کر ان کے قریب بیٹھ گئی مگر جیسے ہی چائے پیالیوں میں انڈیلی گئی تو وہ جلدی سے ایک پیالی اٹھا کر کھڑی ہو گئی۔ اماں نے گھور کر دیکھا مگر وہ صفدر بھائی کے کمرے کی طرف لپک گئی۔

صفدر بھائی اپنے کمرے میں اوندھے منھ پڑے تھے وہ جانے اس وقت کیا سوچ رہے تھے۔ کمروں کے اندر کتنی جلدی شام ہو جاتی ہے۔ ان کے کمرے میں اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔۔۔"

صفدر بھائی چائے۔" اس نے پیالی میز پر رکھ دی۔

"ارے واہ۔" وہ اٹھ کر بیٹھ گئے۔ "عالیہ بو، تم بھی میرے ساتھ پیو۔"

"نہیں! مسز ہارورڈ کے ساتھ پیوں گی۔"

وہ باہر آ گئی۔ مسز ہارورڈ مزے لے لے کر شامی کباب کھا رہی تھیں اور مرچیں آنسو بن کر ٹپک رہی تھیں۔

"آپ کی لڑکی بڑی ہوشیار ہے، خوب پڑھتا ہے۔" مسز ہارورڈ نے اس کی تعریف کی تو وہ شرما گئی۔

"جی ہاں، ہماری لڑکی بڑی ہوشیار ہے۔ ویسے یہاں کی لڑکیاں بڑی کوڑھ مغز ہوتی ہیں، پڑھنے کے نام سے بھاگتی ہیں، ہندوستانی لوگ اپنی لڑکیوں کو جاہل رکھ کر خوش ہوتے ہیں۔" اماں پھر ترنگ میں آ گئی تھیں۔

"کوڑھ مغز؟" مسز ہارورڈ نے سمجھنا چاہا۔

"بس ہوتی رہیں"

"اور آپ کی اس لڑکی نے کتنا پڑھا ہے؟" مسز ہاورڈ نے ہنس کر پوچھا۔

"دس درجے، پھر بیمار ہوگئی۔" اماں نے کہا۔

آپا اس پورے وقت کو خاموشی سے گزارتی رہیں۔ انھوں نے مسز ہاورڈ سے ایک بات بھی نہ کی۔

شام سنولا چکی تھی بسیرا لینے والے پرندوں کی قطاریں جانے کس سمت اڑی جارہی تھیں، مسز ہاورڈ بوکھلا کر اٹھ گئیں۔

"آپ کا صاحب نہیں آیا۔ ہمارے کو اس سے ملنے کا بڑا شوک تھا۔ کہیں چلا گیا ہوگا دفتر کے کام کو؟"

"جی ہاں اجی ہاں۔ آج ان کے ایک دوست مر گئے تھے۔ اس لیے ان کے گھر گئے ہوں گے۔"

اماں اس سے بڑا اور بہانہ کیا کرسکتی تھیں۔ ایک انگریز عورت کے ساتھ چائے نہ پی سکنے کی کوئی بڑی وجہ ہی ہوسکتی تھی۔

مسز ہاورڈ کے جاتے ہی اماں جیسے جھنجھلا اٹھیں "دیکھا جائے پر نہیں آئے نادہ تو کہو مجھے اچھا بہانہ یاد آگیا ورنہ کیا کہتیں مسز ہاورڈ، دیکھ لینا یہ اپنی نفرت کے پیچھے کچھ کرکے رہیں گے۔ بھلا کوئی ان سے پوچھے کہ انگریز سے زیادہ اچھا حکمران کون ہوگا، اپنے لوگ تو ایسے ہیں کہ ایک دوسرے کا گلا کاٹتے رہتے ہیں، ارے کون سمجھائے اس شخص کو۔"

"کوئی کام لگ گیا ہوگا۔" آپا نے ابا کی صفائی پیش کی۔

"کام؟" اماں پھر اٹھیں "کوئی کام نہیں ہوگا۔ ارے وہ شخص۔"

اماں جانے اور کیا کچھ رہتیں۔ وہ جلدی سے صفدر بھائی کے پاس چلی گئی۔ جائے

کی پیالی اسی طرح میز پر رکھے رکھے ٹھنڈی ہوگئی۔ صفدر بھائی لالٹین کی پیلی پیلی روشنی میں عجب سے لگ رہے تھے۔

"صفدر بھائی آپ نے چائے نہیں پی؟"

"ارے تو کیا میں نے نہیں پی۔" وہ پیالی اُٹھا کر پانی کی طرح پی گئے۔

"میں نہیں بولتی آپ سے، اب پی ہے تو کیا؟" وہ کمرے سے نکل رہی تھی تو صفدر بھائی پکار رہے تھے مگر اس نے جواب تک نہ دیا۔

جب کافی اندھیرا ہو گیا تو ماما نے میز کرسیاں ہٹا کر پلنگ بچھا دیئے ماما تھکن سے چور ہو رہی تھی اور افیون کے نشے سے آنکھیں بند ہو رہی تھیں۔ ان کے ہر مرض کا علاج صرف افیون سے ہوتا تھا۔ ننھی سی کالی گولی نگلتے ہی وہ سارے دن کی ڈُر ڈُر پھٹ پھٹ بھول جاتی تھیں تھکن غائب ہو جاتی اور وہ ملکہ جیسی شان سے سو جاتیں۔

ماما بستر لگا کر باورچی خانے میں گئیں تو ابا آ گئے۔ اماں انھیں دیکھتے ہی بپھر گئیں "اب آئے ہیں خاں صاحب۔ کیا وہ نہ سمجھتی ہوں گی کہ آپ کو ان کا آنا بُرا لگا حد ہے، وہ انگریز ہو کر ہمارے گھر آئے اور صاحب بہادر پروا بھی نہ کریں اگر وہ رپورٹ کردے کہ جناب نے اس سے بدسلوکی کی ہے تو پھر ہوش ٹھیک ہو جائیں گے" اماں نے اتنے زور سے پاندان بند کیا کہ ماما گھبرا کر باورچی خانے سے باہر نکل آئیں۔

"اب وہ زمانے لد گئے جب تمھارے انگریز کے نام سے تھر تھری چھٹتی تھی بات یہ ہے کہ میں کچھ نہ کرسکوں تو کیا نفرت بھی نہیں کرسکتا۔" ابا نے سختی سے کہا۔ "یہ بد نیت تاجر، یہ حکمران کیا۔ مجھے تو ان کی ساری قوم سے نفرت ہے۔ اگر میرا دماغ بڑے بھائی جیسا ہوتا تو پھر دیکھتا، مگر میں تو بندھا ہوا ہوں، نوکری کرنے پر مجبور ہوں"

"ہوں! وہ تو میں جانتی ہوں کہ تم ہر وقت سب کو بھبو کا مارنے پر تُلتے ہوئے ہو۔"

"یہی تو وجہ ہے کہ نوکری کر رہا ہوں ورنہ میں تو بڑے بھائی کی طرح دوکان کر کے بیٹھ جاتا۔ مگر تم تو سب کچھ اپنے بھائی کے پاس رکھ آئیں، وہ بڑا دیانت دار آدمی ہے اس کی بیوی انگریز ہے۔"

"میں نے دس دفعہ کہا کہ میرے بھائی بھاوج کا نام مت لیا کرو۔" امّاں ایک دم سسکیاں بھر بھر کر رونے لگیں۔

آپا بڑی خاموشی سے پلنگ پر پاؤں لٹکائے بیٹھی تھیں، ان کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ میلی ملگجی چاندنی میں ان کے آنسو کتنے دردناک معلوم ہو رہے تھے۔

"سب رو۔ سب لڑو، وہ گھر سے بھاگ جائے گی۔" اس نے بڑے بوڑھوں کی طرح سوچا تھا۔ لڑائی اور آنسو اس کی روح میں لرز رہے تھے۔

وہ اپنے بستر پر اوندھی لیٹ گئی اور زور زور سے سسکیاں لے کر رونے لگی۔

"دیکھو بیگم، ان بچوں پر کیا اثر پڑ رہا ہے، یہ سب تباہ ہو جائیں گے اور۔"

ابا کپڑے تبدیل کرنے کے لیے اپنے کمرے میں چلے گئے۔ امّاں نے آنسو پونچھ لیے۔

"ماما کھانا لے آؤ، عالیہ سو نہ جائے۔" اماں نے آواز دی۔

"میں نہیں کھاؤں گی۔" وہ زور سے چیخی اور پھر رونے لگی۔

کھانا آیا تو اس نے ابا کی نرم نرم ہتھیلیوں والے ہاتھ اپنی پیشانی پر محسوس کیے مگر وہ سوتی بن گئی۔ وہ تو اس دن اعلانیہ سب سے روٹھ گئی تھی۔

دن گزرتے جا رہے تھے۔ گھر کی فضا دھوپ چھاؤں کی طرح بدلتی رہتی۔ ابا کی شامیں بیٹھک میں گزرتیں۔ دوستوں کے جمگھٹ میں وہ زور زور سے باتیں کرتے

ماما جائے بنا بنا کر باہر لے جاتے ہوئے چپکے چپکے بڑبڑاتی رہتیں اور اماں جیسے بڑے اضطراب کے ساتھ ادھر اُدھر پھرتی رہتیں یا کبھی کے کیے ہوئے کام کو پھر سے کرنے لگتیں۔ آپا بدستور خاموش تماشا رہتیں اور کسی کتاب کے ایک ہی صفحہ کو پڑھے چلی جاتیں۔

خدا جانے آپا اتنا کم کیوں بولتی تھیں۔ کیا محبت لوگوں کو گونگا بنا دیتی ہے؟ کیا محبت کا نام الفاظ کی موت ہوتا ہے۔؟ پھر لوگ اتنی گھٹیا چیز کے پیچھے کیوں بھاگتے ہیں؟ آپا تم کتنی معصوم تھیں۔

گھر کے اسی دردناک ماحول سے گھبرا کر وہ بیٹھک کے دروازے پر جا کھڑی ہوتی۔ نہرو جناح گاندھی وغیرہ کے سُنے ہوئے ناموں کے علاوہ اس کی سمجھ میں صرف اتنا آتا تھا کہ سب انگریزوں کی برائی کر رہے ہیں اسے کوئی بھی مزے کی بات نہ سُنائی دیتی۔ اس پر ابا اسے دیکھتے ہی اندر جانے کا حکم دیتے۔ صفدر بھائی اس کے آنکھوں آنکھوں میں کیے ہوئے اشارے سمجھنے سے انکار کر دیتے۔ وہ بھی تو شام کے وقت بیٹھک سے اُٹھنے کا نام نہ لیتے تھے۔

وہ رنجیدہ ہو کر باہر چبوترے پر جا بیٹھتی اور اُسے اپنی پہلی جگہ یاد آنے لگتی۔ کتنی دُور رہ گئی تھی وہ جگہ، وہاں سے آتے ہوئے ٹرین کی کھڑکی کے پاس بیٹھ کر اس نے اتنے درخت گنے تھے کہ سارے حساب نے دم توڑ دیا تھا۔

جیٹھ کا مہینہ تھا۔ لو چلتی رہتی۔ آموں اور پیپل کے درختوں میں چھپے ہوئے پرندے سارا دن شور مچاتے رہتے۔ صحن میں لگا ہوا مہندی کا پودا چھوٹا سا سوکھ چلا تھا۔ ماما لاکھ پانی ڈالتیں مگر اس کی پتیوں پر رونق نہ آتی۔ چاندنی راتوں میں ٹھاکر صاحب کے گھر سے کسم ودیدی کے ہارمونیم پر گانے کی آواز آتی تو آپا اُٹھ کر ٹہلنے لگتیں۔ کسم ودیدی ان دنوں ایک ہی گیت کو رٹتے جاتیں۔

اماں ابا کے انتظار سے تھک کر آپا سے باتیں شروع کر دیتیں، اِدھر صفدر کے

خاندان سے دشمنی کی داستانیں۔ نجمہ پھوپھی کی خود غرضی کے قصے بھائی اور بھاوج کے محبت بھرے گیت۔ آپا پلکیں جھپکا جھپکا کر سب کچھ سنتیں، مگر خود کچھ نہ کہتیں۔ ابا کی بیٹھک جب سونی ہوتی تو کسی دوست کے گھر چلے جاتے تھے اور دس گیارہ سے پہلے واپس آتے۔

رات سونے سے پہلے وہ صفدر بھائی کے پاس چلی جاتی۔ باہر چبوترے پر ان کا پلنگ بچھا ہوتا۔ جہاں وہ خاموش پڑے کچھ سوچتے رہتے۔

صفدر بھائی کہانی سنائیے یا وہ جاتے ہی فرمائش کرتی اور ان کی کمر سے ٹیک لگا کر بیٹھ جاتی۔ صفدر بھائی اپنے بچپن میں سنی ہوئی کہانیاں یاد کرنے لگتے اور جب کہانی یاد آ جاتی تو زور سے ہنستے۔ وہ ہمیشہ ایک شہزادی اور ایک غریب آدمی سے کہانی شروع کرتے تھے اور غریب آدمی شہزادی کو نہ پا سکنے کے غم میں ہمیشہ مر جاتا تھا۔

"صفدر بھائی آپ تو کسی شہزادی سے شادی نہیں کریں گے؟" ایک بار اس نے بڑی فکر سے پوچھا تھا۔

"لاحول ولا قوۃ، میں کیوں مروں گا بھئی۔" اور وہ اس قدر ہنستے تھے کہ وہ چڑ کر رہ گئی تھی۔

گرمیوں کی چھٹیاں گزرتی جا رہی تھیں۔ وہ خوش تھی کہ اسکول کھلنے کے دن قریب آ رہے تھے۔ جتنا وقت اسکول میں گزرتا وہ خوش رہتی۔ ساری دنیا کو بھول جاتی۔

اس دن دوپہر میں جب وہ سو رہی تھی تو اماں کے زور زور سے باتیں کرنے کی آواز نے اسے جگا دیا تھا۔ ابا کی آواز مدھم مگر جھلائی ہوئی تھی۔ وہ گھبرا کر دالان میں آ گئی جہاں آپا پہلے سے کھڑی تھیں۔ اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ آخر کیا بات ہے۔

ذرا دیر بعد باہر سے رائے صاحب کی آواز آئی۔ اور ابا باہر چلے گئے۔ آپا ابا کے جانے سے پہلے ہی اپنے کمرے میں چلی گئیں۔

"اس گھر میں صفدر دولہا بن کر اسی وقت آئے گا۔ جب میری لاش جائے گی۔"

ابّا نے جاتے جاتے امّاں کی بات ایک لمحے کو رک کر سُنی اور پھر چلے گئے۔
ابا جیسے ہی بیٹھک میں گئے، امّاں نے آکر آپا کو لپٹا لیا۔

"دیکھ لینا میں زہر کھالوں گی، وہ تم کو اس کمینے صفدر کے ساتھ بیاہنے کی سوچ رہے ہیں، ہائے ان کا تو دماغ خراب ہو گیا ہے، یہ اس شخص سے شادی کریں گے جس کے باپ دادا نے خاندانی عزت لوٹ لی، میرا راج پاٹ چھین لیا۔" امّاں روتے روتے پلنگ پر بیٹھ گئیں۔ "اب اس کمینے کو بی اے کرنے کے لیے علی گڑھ بھیج رہے ہیں، میں آج ہی تمہارے ماموں کو خط لکھوں گی، پھر دیکھوں گی کہ سب کچھ کیسے ہوتا ہے۔"

وہ ڈر گئی کہ ماموں میاں جانے کیا کریں گے، مگر پھر یہ سوچ کر اُسے تسلی ہوئی کہ امّاں تو ہمیشہ ہی ماموں میاں کو خط لکھا کرتی ہیں مگر وہ دو تین مہینے بعد ہی جواب دیتے ہیں۔

"تمہاری دادی بے شرم تھیں جو صفدر کے باپ کو داماد بنا کر اب تک زندہ بیٹھی رہیں میں تو اسی وقت زہر کھالوں گی۔"

"آپ کیوں پریشان ہوتی ہیں۔ کچھ بھی نہ ہوگا۔" آپا جیسے کنوئیں کی تہ سے بولیں۔ اُن کا چہرہ سفید ہو رہا تھا۔

ارے ہمارے آسمانی باپ تو ہمارے گھر سے لڑائیاں ختم کرادے! صفدر بھائی کے کمرے میں جاتے ہوئے وہ چپکے چپکے دعا کر رہی تھی۔ مس مرسی کی یاد کرائی ہوئی یہ دعا اُسے بہت دُکھوں سے نجات دلا دیتی تھی۔

کمرے میں جا کر دیکھا کہ وہاں تو صفدر بھائی بھی رو رہے تھے۔ کچھ نہیں کرتا یہ آسمانی باپ بھی، وہ آسمانی باپ سے بھی روٹھ گئی تھی۔ اور روتے ہوئے صفدر بھائی سے لپٹ گئی۔

"سب رو رہے ہیں۔ اللہ کرے میں مرجاؤں۔" وہ بہت سنجیدہ ہو رہی تھی۔

"ارے میں تو علی گڑھ جا رہا ہوں نا، اس لیے رو رہا ہوں۔ مجھے اپنی عالیہ بٹو یاد

آئے گی۔" اُنھوں نے ہنستے ہوئے آنسو پونچھ لیے "تم دس گیارہ سال کی ہو کر کتنی بڑی ہوگئی
اُنھوں نے قہقہہ لگایا۔

"مجھے معلوم ہو سب جھوٹ بول رہی ہیں۔"

صفدر بھائی صرف ایک ہفتہ بعد علی گڑھ جا رہے ہیں

ایک ہفتہ ماہ پوس کے سورج کی طرح جلدی جلدی ڈوبا جا رہا تھا اور وہ بیتے ہوئے دنوں کو انگلیوں پر گنتی رہ جاتی۔ وہ کتنی رنجیدہ رہنے لگی تھی۔ اُسے یقین تھا کہ آپا کے بعد صرف صفدر بھائی اس کا خیال کرتے ہیں۔ آپا خاموشی سے محبت کرتی ہیں مگر صفدر بھائی تو اس کے ساتھی ہیں۔ جن سے وہ کھیلتی ہے۔ کہانیاں سنتی ہے۔ وہ چلے جائیں گے تو پھر وہ کیا کرے گی؟

صفدر بھائی نے یہ دن اپنے کمرے میں بند ہو کر گزار دیئے۔ ان دنوں آسمان پر بادل چھانے لگے تھے۔ بھیگی بھیگی ہوائیں چلتی رہتیں۔

امّاں نے صفدر بھائی کی صورت دیکھنے سے انکار کر دیا تھا۔ ابا نے امّاں سے بات کرنی چھوڑ دی تھی۔ وہ دس گیارہ بجے رات تک انگریز دشمنی کے زبانی اظہار میں مصروف رہتے آپا کا مطالعہ بہت ترقی کر گیا تھا۔ وہ جو کچھ پڑھتیں اُسے حفظ کرنے لگیں تھیں۔ گھنٹوں گزر جاتے مگر صفحہ اُلٹنے کی نوبت نہ آتی۔

وہ گھر کے ماحول سے گھبرا کر باہر چبوترے پر جا بیٹھتی جہاں چپراسی بیٹھا گڑگڑی پیا کرتا وہ چپراسی سے باتیں کرنے لگتی۔

"تمھاری کتنی تنخواہ ہے؟"

"پندرہ روپے"

تم نے اپنا گھر اینٹوں کا کیوں نہیں بنایا؟"

ہم غریب جو ہیں بٹیا، پکا گھر بنا کر لوگوں کی برابری تھوڑی کر سکتے ہیں۔"

اسے ایک دم صفدر بھائی کے ابا یاد آجاتے جو جیتے جی کسی سے عزت نہ کرا سکے۔ اُسے وہ ساری کہانی یاد آنے لگتی۔ جو اماں نے کتنی بار آپا کو سنائی تھی۔ اس کا کلیجہ دکھتا تو وہ اُٹھ کر صفدر بھائی کے پاس چلی جاتی۔ مگر وہ تو ان دنوں بات کرنا بھول گئے تھے۔

دوسرے دن صبح صفدر بھائی علی گڑھ جا رہے تھے۔ ان کا سامان بندھا رکھا تھا کمرہ بالکل اُجاڑ معلوم ہو رہا تھا۔ اماں اس دن بڑی بیتابی سے سارے گھر میں ٹہلتی رہیں" گھر سے نکالنے کے بجائے اُسے پڑھنے کو بھیجا جا رہا ہے۔ اس مردود کو ہماری دولت سے پڑھا کر ہمارے سر پر بٹھانا چاہتے ہیں۔ اللہ اسے وہی نصیب کرے۔"

شام کو ابا صفدر بھائی کے کمرے میں گئے اور بڑی دیر بعد باہر نکلے۔ پھر بیٹھک میں چلے گئے۔ اتنی دیر اماں تلملائی تلملائی پھرتی رہیں۔

وہ رات بڑی اندھیری تھی۔ آندھی بارش کے آثار تھے اس رات دالان میں بستر لگائے گئے تھے۔ کھانے کے بعد سب لوگ لیٹ گئے۔ بڑے طاق میں رکھی ہوئی لالٹین کی بتی نیچی کر دی گئی۔ سونے سے پہلے اس نے بڑے انہماک سے دعا کی تھی۔ کہ سانی بابا صفدر بھائی کو روک لے اور صبح کبھی بھی نہ ہو۔ اس دعا کے بعد وہ سو گئی تھی۔

صبح کے خوف نے ایک بار اس کی آنکھ کھول دی تھی۔ اس نے دیکھا کہ آپا صفدر بھائی کے کمرے کی طرف سے دبے قدموں آ رہی ہیں۔ پھر وہ اپنے بستر پر لیٹ گئیں۔ اس نے ان کی دھیمی سی سسکی کی آواز سُنی اور پھر سو گئی۔

صفدر بھائی صبح تانگے پر بیٹھ کر چلے گئے۔ جانے سے پہلے وہ اماں کے پاس آئے تھے ذرا دیر کھڑے رہے مگر جب اماں نے اُن کی طرف دیکھا تک نہیں تو ماما کی دعائیں لیتے چلے گئے۔

وہ دروازے تک ان کے ساتھ گئی مگر جب تانگہ کچی سڑک پر دھول اُڑاتا چل دیا تو وہ ابا کی ٹانگوں سے لپٹ کر رونے لگی۔ یہ پہلا موقع تھا کہ وہ ابا کی ٹانگوں سے لپٹ گئی تھی۔ اور وہ سر پر

ہاتھ پھیر رہے تھے ورنہ ابا کو فرصت ہی کب ملتی جو کسی سے محبت کا اظہار کرتے۔

دوپہر کو کسم دیدی آگئیں جو چپکے چپکے آپا سے باتیں کرتی رہیں۔ شام کو چائے کے بعد ابا نے

اماں سے پورے ہفتے کے بعد بات کی تھی۔

"جب وہ بی۔ اے کرے گا تو وہ کام ضرور ہوگا۔ سمجھ گئیں؟" — "ہم بھی دیکھیں گے"۔

"اماں کی آواز میں چیلنج تھا۔

(۷)

دن گزرتے گئے۔ صفدر بھائی کی یاد مدھم پڑنے لگی۔ اسکول سے آکر وہ کسم دیدی

کے گھر چلی جاتی۔ اور وہاں ہارمونیم پر "کون گلی گیو مورے شیام" کی مشق کرتی رہتی۔ وہ

ان کے گھر میں کتنی خوش رہتی۔ اسے اپنے گھر کی فضا راس نہ آتی۔ اماں اب بھی ہر وقت فکرمند اور

بکھری ہوئی نظر آتیں۔ آپا اسی طرح یا تو کتاب کے ایک ہی صفحہ پر نظریں گاڑے پڑی رہتیں یا پھر

نظریں جھکائے کسی نہ کسی کام میں اماں کا ہاتھ بٹاتی رہتیں۔ اس نے جی میں فیصلہ کر لیا کہ صفدر

بھائی کے علاوہ بھی یہاں کچھ گڑبڑ ہے۔

صفدر بھائی کے کمرے میں بڑا سا تخت ڈال دیا گیا تھا جس پر سفید چاندنی بچھی ہوئی

تھی۔ کھانے کے لیے اسی پر دسترخوان سج جاتا۔ جب سے صفدر بھائی کے کمرے میں کھانا

شروع ہوا تھا آپا کی خوراک بہت کم ہو گئی۔

صفدر بھائی نے علی گڑھ جا کر صرف ایک خط لکھا تھا اس کے بعد انھوں نے کوئی

خط نہ لکھا۔ ابا نے منی آرڈر سے روپے بھیجے تو وہ بھی واپس کر دیے تھے۔ اس روز ابا

بہت رنجیدہ تھے مگر اماں بے حد خوش نظر آ رہی تھیں۔ وہ بڑے طنز سے ہنس رہی تھیں

اور ابا نظریں چرا رہے تھے۔

"وہ جانتا ہے کہ تم ان ہی رویوں کی وجہ سے اس سے نفرت کرتی ہو۔" آخر ابا کو بولنا ہی پڑا۔

اماں مارے غصے کے بکھر گئیں۔ "تو کیا میں اس نیچ کسان کے بیٹے کو سینے سے لگائے رکھتی، کیا ہماری اولاد نہیں جو اس پر دولت خرچ کی جائے، وہ احسان فراموش کمینہ اس نے روپے واپس کر کے تمھارے مُنھ پر مارے ہیں۔ اسے اب تمھاری ضرورت ہی کیا ہو بی اے کر کے یا تو عیش کرے گا۔ سچ کہا ہے کسی نے، اصل سے خطا نہیں کم اصل سے وفا نہیں"

"میری بہن کا بیٹا کم اصل ہے اور تمھارے بھائی کی بیوی، پتہ نہیں کسی بھنگی کی اولاد ہوگی۔ تمھارے بھائی نے اس سے شادی کر کے تمھاری قوم کے مُنھ پر تھپڑ مارا ہے۔ خدا کی شان ہے انگریز بھنگی بھی ہمارے حکمران ہیں۔"

میرے بھائی بھاوج کو کچھ کہا تو اچھا نہ ہوگا۔ وہ تم کو جانتی ہے نا ہی لیے مُنھ نہیں لگاتی۔ میری وجہ سے چُپ رہتی ہے ورنہ کب کا تم کو جیل بھجوا دیتی۔" اماں کی آواز بھرا رہی تھی۔

"وہ بھنگن مجھے جیل بھجوا دیتی ؟" ابا غصے سے چیخے۔

اماں زور زور سے رونے لگیں۔ آپا کا چہرہ سفید ہو رہا تھا اور وہ دل ہی دل میں بلک رہی تھیں۔ وہ جتنی بڑی ہوتی جاتی۔ اتنی زیادہ حساس۔ اسے ابا سے شدید محبت ہوتی جا رہی تھی اور اماں کی جھگڑالو طبیعت سے بیزاری بڑھتی جا رہی تھی۔ مگر اماں کو روتے دیکھتی تو اس کا دل تڑپ اٹھتا۔ یہی جی چاہتا کہ اماں کو کلیجے میں چھپا لے۔

"اب آئے تمھارا وہ نیچ بھانجہ، اگر بھنگی سے جوتے نہ لگوائے ہوں تو میرا نام نہیں" اماں نے روتے ہوئے چیلنج کیا۔

ضرور آئے گا اور یہیں اس کی بارات آئے گی۔" ابا جلدی سے باہر چلے گئے۔

اماں دیر تک بڑبڑاتی رہیں۔ ایک دن اس گھر کا انجام بہت بُرا ہوگا۔"

وہ کمرے میں چلی گئی۔ آپا کھرّے پلنگ پر اوندھی پڑی تھیں۔ "عالیہ بٹو، میں انھیں خط لکھ دونگی کہ اب وہ یہاں کبھی نہ آئیں۔" آپا نے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا، ماں کا چہرہ کتنا زرد ہو رہا تھا۔

"مگر ابا جو کہتے تھے کہ تمھاری شادی ہوگی صفدر بھائی سے!" اس نے آپا پر جُھک کر کہا۔

"اوہ! اماں یہ شادی کبھی نہ ہونے دینگی اور مجھے بدنامی سے بھی بہت ڈر لگتا ہے۔ اس لیے کچھ نہیں ہو سکتا۔" آپا نے بازوؤں میں مُنھ چھپا لیا۔ وہ چپ چاپ بیٹھی آپا کا ہاتھ سہلاتی رہی۔ اس وقت وہ کیسی کچی کچی باتیں سوچ رہی تھی۔ صفدر بھائی تو مزے سے پڑھتے ہوں گے اور انھیں کوئی یاد بھی نہ آتا ہوگا۔ مگر یہاں سب انھیں یاد کر کے لڑے مرتے ہیں۔ سب کتنی فضول باتیں ہیں۔ صفدر بھائی نے اسے بھی تو ایک خط نہ لکھا۔ کیا وہ آپا کو یاد کرتے ہوں گے۔

"اماں سے نہ کہنا کہ میں رو رہی تھی۔" آپا نے آنسوؤں سے بھیگا ہوا چہرہ اُٹھا کر کہا۔

"میں نے کب کبھی کچھ کہا ہے اماں سے۔" وہ جل ہی تو گئی۔

کسم دیدی کمرے میں آگئیں تو وہ اُٹھ کر دالان میں چلی گئی۔ اُسے معلوم تھا کہ اب وہ دونوں کس قسم کی باتیں کریں گی۔ پھر بھی سب اس سے ہر بات چھپاتے۔ صرف اس لیے کہ خاصی بڑی ہونے کے باوجود وہ سب سے چھوٹی تھی۔ کوئی بھی اس کی دلی کیفیت نہ جانتا تھا۔ کوئی بھی تو یہ نہ سوچتا تھا کہ اس کے دماغ کی کیا حالت ہے۔ کوئی اسے سمجھنے کی کوشش نہ کرتا۔ کوئی یہ نہ جانتا تھا کہ وہ تو اب اسکول میں دعا کرتے ہوئے آسمانی باپ تک سے اپنے گھر میں رحمتیں نازل کرنے کی دعائیں کیا کرتی تھی۔

(۸)

کئی خزائیں اور بہاریں آ آ کر گزر گئیں پر اس کے گھر کی خزاں بہار میں نہ بدلی۔ صحن میں لگے ہوئے مہندی کے پودے کو آپا کتنا ہی پانی دیتیں مگر اس کی پیاس نہ بجھتی۔ پتلی پتلی ہری شاخیں سیاہ پڑ گئی تھیں۔ آپا ان کئی برسوں میں کتنی کمزور ہو گئی تھی۔ ابا گھر سے بالکل بے تعلق سے نظر آتے تھے دفتر سے آنے کے بعد بیٹھک آباد ہو جاتی اور انگریز حکمرانوں سے نفرت کے اظہار میں ابا کی آواز اب سب سے اونچی ہوتی۔ اماں اس وقت بڑی بے چینی سے صحن میں ٹہلتی رہتیں۔

"ہائے وہ کون سا منحوس دن تھا جب میری شادی ہوئی تھی۔ سب کچھ ختم ہو گیا۔ جو رہا ہے وہ بھی ختم ہو جائے گا" وہ ٹہلتے ٹہلتے رک کر آپا سے کہتیں اور جواب نہ پا کر پھر بڑبڑانے لگتیں۔

ویسے اب وہ صفدر بھائی کی طرف سے کسی قدر مطمئن تھیں، علی گڑھ سے بی اے کرنے کے بعد وہ نہ جانے کہاں چلے گئے تھے۔ ابا نے بہت سر مارا مگر ان کا پتہ نہ معلوم ہوا۔ اماں بہت جلدی میں تھیں کہ کسی طرح آپا کی شادی کر دی جائے۔ انھیں خطرہ تھا کہ صفدر بھائی کا بھوت پھر کہیں سے نہ آ نکلے۔

ماما جب کھانا پکا چکتی تو اماں اس سے شادی کے متعلق باتیں کرتی رہتیں۔ ابا کو تو گھر کی کسی بات سے دلچسپی ہی نہ تھی۔ رات جب وہ بستر پر آتے تو کوئی کتاب اُٹھا لیتے۔ شادی کی بات ہوتی تو ہوں ہاں کر کے ٹال دیتے۔

اس دن جب اماں نے کسم دیدی سے سُنا کہ ابا کے ایک دوست گرفتار کر لیے گئے تو اماں مارے دہشت کے کانپ گئیں۔

"تم ہم سب کو بھیک منگوا دو گے۔ اگر دشمنوں کو کسی نے پکڑ لیا تو کیا ہو گا؟" رات اماں بلک بلک کر روئیں۔

ابا کچھ بے چین سے ہو کر اٹھ بیٹھے "میں تو تم لوگوں کی وجہ سے خود ہی کچھ نہ کرتا اور مجھے تو کچھ کرنا بھی نہیں تھا۔ بس یہ نفرت ہی جو چھپائے نہیں چھپتی۔"

اس کے بعد اماں دیر تک روتی اور بولتی رہیں۔ مگر ابا ایک لفظ بھی نہ بولے۔

دہشت کی گرفتاری کے بعد اماں کو آپا کی شادی کی فکر اور بھی بری طرح ستانے لگی۔ ایک بھائی اور بھاوج کے سوا ان کا اپنا تو کوئی بھی نہ تھا۔ ہاں ابا کے عزیزوں میں ڈھیر والے لڑکے تھے۔ اماں نے ان دنوں اپنے بھائی کو بھی خط لکھا تھا کہ آپا کی شادی کا ٹھکانہ کر دیں۔ ان کے بھائی نے جواب میں لکھا تھا کہ تمھاری بھابھی کہتی ہیں کہ شادی لڑکی کی پسند سے ہونی چاہیے اس لیے آپ خاندان کے لڑکوں کو تہمینہ سے ملائیں اور وہ جسے پسند کرے شادی کر دیں۔ اور وہ کہتی ہیں کہ ہم تہمینہ کی شادی میں ضرور آئیں گے۔

یہ خط پڑھ کر سب کی تو جان پھنک گئی تھی مگر اماں سارا دن مسکراتی رہیں وہ بار بار خوش ہو کر کہتی تھیں۔ "لو بھلا بے چاری بھابھی کو کیا خبر کہ یہاں ایسی رسمیں نہیں ہوتیں"

اماں یہ خط پڑھ کر خود ہی خوش ہوتی رہیں۔ مگر ابا سے ذکر تک نہ کیا۔ ہاں ابا کے پیچھے پڑی رہتیں کہ تہمینہ کی شادی کا انتظام کرو۔

ابا یا تو چپ رہتے یا پھر یہ کہہ کر جان چھڑا لیتے کہ جہاں جی چاہے کر دو۔

اماں یہ جواب سنکر لڑنے بیٹھ جاتیں "پھر تم یہ کہہ دو کہ باپ نہیں ہو تو میں خود ہی باہر نکل کر لڑکا ڈھونڈ لوں گی۔"

ابا ان باتوں سے بچنے کے لیے آواز دے کر آپا کو اپنے پاس بلا لیتے تو اماں کو مجبوراً خاموش ہونا پڑتا۔

انھیں دنوں بڑی چچی کا خط آگیا۔ وہ چھبّن بھیا کے لیے تہمینہ آپا کو مانگ رہی تھیں۔ اماں کو ایسے وقت میں یہی پیغام غنیمت لگا اور ابا سے پوچھ کر منظوری کا خط لکھ دیا۔

اُنھی دن ہولی چلی تھی۔ دوسرے دن کسم دیدی ہمارے ہاں بہت سا پکوان لے کر آئیں اور جب آپا سے گلے ملنے لگیں تو اُن کے مُنھ پر ڈھیر سا عبیر مل دیا۔ پھر اسما کی طرف جھپٹیں مگر وہ کسم دیدی کے ہتھے نہ چڑھی۔ آپا کی رنگی ہوئی صورت دیکھ کر اماں کو بے ساختہ ہنسی آگئی شاید اس وقت وہ رنگ کھیلنے کو گناہ سمجھنا بھول گئی تھیں۔

تم نے ہولی نہیں کھیلی کسم؟ اماں نے پوچھا۔

"میں بدھوا جو ہوں موسی" کسم دیدی کی ہنستی ہوئی صورت کمھلا گئی۔

"ہوں" اماں نے شاید پہلی بار انھیں ہمدردی سے دیکھا تھا۔

"جی چاہتا ہے کہ خوب رنگ کھیلوں موسی، رنگین ساری پہنوں، من کو مارنا کتنا مشکل کام ہوتا ہے، پرپتی نے تو یہ کچھ نہ سوچا تھا" کسم دیدی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔

"چپ رہو کسم تہوار کے دن رونا منحوس ہوتا ہے" اماں نے انھیں سمجھانا چاہا تو کسم دیدی نے جلدی سے آنسو پونچھ لیے اور پھر آپا سے باتیں کرنے لگیں۔

دوسرے دن دوپہر میں ماما نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اماں کو بتایا کہ کسم دیدی بھاگ گئیں۔ مارے حیرت کے اماں کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔

"ارے کیا سچ مچ کسم دیدی بھاگ گئیں؟" وہ خود بھی چونک کر اماں کا مُنھ تکنے لگی تھی مگر آپا کے چہرے پر ذرا سی بھی حیرت کے آثار نہ تھے۔ وہ مہندی میں پانی دے رہی تھیں جس کی پتیاں اب ہری ہو چلی تھیں۔

"ہے، رائے صاحب کی ناک کٹ گئی، کیسے عزت والے لوگ تھے؟" ماما ماتھا پیٹ پیٹ کر باتیں کیے جا رہی تھی۔

"اب خوب ہولی کھیلے گی۔ رنگین ساریاں پہنے گی، اماں باوا کی ناک کٹ گئی تو کیا ہوا ارے میں ہوتی تو بھاگنے والوں کو زندہ دفنا دیتی۔ سگی بہن نکلی سلمہ کی، توبہ! اور نہ کریں دوسری شادی اپنے دھرم کو لے کر جائیں اب۔ بیٹی ہر وقت گاتی رہتی تھی۔ تب کسی کو پتہ نہ چلا۔" اماں باتیں کرتے ہوئے آپا کو بڑے غور سے دیکھ رہی تھیں۔ "ارے اگر مجھے پتہ ہوتا تو اپنی تہمینہ کے پاس ایک منٹ کو نہ بیٹھنے دیتی۔"

"میرے پاس بیٹھنے سے کیا ہوتا ہے اماں؟" آپا نے شاید زندگی میں پہلی بار تلخی سے جواب دیا تھا۔!

"اللہ کرے کسم دیدی اپنے گھر خوش رہیں!" وہ برابر دعائیں کیے جا رہی تھی اور اسے بار بار سلمیٰ پھوپھی یاد آ رہی تھیں۔

چند دن تک رائے صاحب ابا کی بیٹھک میں بھی نہیں آئے تھے اور جب آئے تو سب سے یہی کہتے رہے کہ کسم اپنی نانی کے گھر گئی ہے۔ روٹھ کر گئی ہے اس لیے مارے اداسی کے کہیں نہیں آیا گیا۔

کسم دیدی کی ماتا جی نے بھی تو اماں سے یہی کہا تھا کہ کسم روٹھ کر اپنی نانی کے گھر ہردوار چلی گئی ہے۔ جب وہ واپس آئے گی تو پھر اپنے اڑانے والوں سے پوچھوں گی۔"

مگر جب اس نے یہی بات آپا سے کہی تو ان کا چہرہ فق پڑ گیا۔ "خدا نہ کرے وہ واپس آئے۔" انھوں نے دھیرے سے کہا۔

کسم دیدی کے بھاگنے کے بعد اماں کی فکروں میں اور بھی اضافہ ہو گیا۔ وہ چاہتی تھیں کہ کسی طرح بھی آپا کو ان کے گھر کا کر دیا جائے۔ اماں سارا دن جمیل بھیا کے حسن اور لیاقت کا ذکر کرتی رہتیں۔ وہ ان باتوں کو بڑی دلچسپی سے سنتی مگر آپا کو جانے کیا ہو گیا تھا کہ ایک دم گھر کے کام میں جٹ گئی تھیں۔ سارے کمروں کا سامان الٹ کر پھر سے سجا گیا۔

"آپا تم نے جمیل بھیا کو دیکھا تھا وہ کیسے ہیں؟" اسے اپنی آپا کے ہونے والے شوہر سخت

دل چسپی ہوتی جا رہی تھی۔

"پتہ نہیں" آپا اس کے سوال پر ہنس پڑیں وہ خاموش نظر آ رہی تھیں۔

"عائشہ اب تم کو مصطفیٰ بھائی نہیں یاد آتے؟"

"نظمی نہیں، سخت بے مروت آدمی نکلا، جو مجھے یاد کرے میں اُسے یاد کرتی ہوں" اس نے بڑے کھرے پن سے جواب دیا۔ "میں تو صرف اپنے جمیل بھیا کو یاد کرتی ہوں" اس نے شرارت سے آپا کو دیکھا تو وہ بڑے زور سے ہنسنے لگیں۔

"آپا، اللہ کرے میرے امتحان کے بعد آپ کی شادی ہو۔ ورنہ سارا مزا کرکرا ہو جائے گا" اس نے بڑی فکر سے کہا۔ نویں کلاس کی پڑھائی نے اس کو کس قدر سنجیدہ بنا دیا تھا۔

"میں تمھارے امتحان سے پہلے شادی کر ہی نہیں سکتی، مجھے دلہن تو تم ہی بناؤ گی" آپا نے اُسے غور سے دیکھا اور پھر کمرے سے نکل گئیں۔

(۹)

ان دنوں مہندی کی پتیوں کا رنگ کتنا گہرا سبز ہو رہا تھا آپا صبح و شام لوٹے بھر بھر کر پانی ڈالتیں مامائیں دیکھ کر بڑی محبت سے ہنستیں "خوب سینچو بیٹا۔ یہ مہندی تمھارے ہاتھوں میں لگنی ہے"

آپا بڑی ڈھٹائی سے مسکرائیں۔ کیا مجال تھی جو وہ کسی کی بات پر ذرا سا شرمائیں۔ اماں کے سامنے اپنے جہیز کی تیاریوں میں مگن رہتیں۔ ملیحے خوبصورت میز پوش اور تکیہ کے غلاف کاڑھ رہی تھیں کہ ہاتھ چوم لینے کو جی چاہتا۔ اس سے کسی کام کو نہ کہا جاتا کیونکہ وہ تو نویں کلاس کی تعلیم کے پہاڑ کو سر کر رہی تھیں۔ ان دنوں گھر کی فضا میں چاندنی کی ٹھنڈک محسوس ہوتی۔ اماں، ابا کے وجود کو اس طرح بھول گئی تھیں کہ لڑنے کا نام بھی نہ لیتیں درزی اور سنار سارا دن گھر کے چکر لگاتے رہتے۔ نمونوں کی کتابوں کو دیکھ دیکھ کر اماں کی آنکھیں نہ تھکتیں اور وہ بڑے سکون سے اپنی کتابیں پڑھتی رہتیں۔

پر ہائے یہ سکون کتنا عارضی تھا۔ ایک دن صبح صبح ماما نے آکر بتایا کہ اپنی تہمینہ ٹیا کی سہیلی کسم واپس آگئی ہے۔

"چل جھوٹی!" اماں مارے حیرت کے چیخ پڑیں۔

"اللہ قسم بی بی جی وہ واپس آگئی ہے میری نند نے خود اسے دیکھا ہے اس کے ساتھ ایک آدمی بھی ہے مکان لے رکھا ہے کرایہ پر۔"

"ہے اتنی بے شرمی۔ ایک تو بھاگ گئی اور پھر ماں باپ کے سینے پر مونگ دلنے یہیں آگئی، ارے اسے رہنے کو کوئی اور جگہ نہ جڑی تھی۔ اگر اس نے میرے گھر کا رخ کیا تو ٹانگیں چیر کر پھینک دوں گی۔" اماں نے آپا کی طرف دیکھ کر کہا اور آپا کا چہرہ ہلدی کی طرح زرد ہو گیا وہ میز پوش چھوڑ کر اٹھیں۔ اور جلدی سے اپنے کمرے میں چلی گئیں۔

جب وہ ان کے پاس گئی تو آپا بڑی بے چینی سے ہاتھ مل رہی تھیں۔

"اری عالیہ، وہ یہاں کیوں آگئی۔ یہاں تو سب اسے ذلیل کریں گے وہ بیوقوف اسے یہاں کیوں لے آیا۔"

"شاید وہ اپنے ماں باپ سے ملنے آئی ہوں چھ مہینے بھی تو ہو گئے شاید وہ معافی مانگنا چاہتی ہوں۔" اس نے کہا۔

"اری بے وقوف!" آپا کچھ سوچنے لگیں۔

جانے کسم دیدی کس گھر میں ہوں گی۔ کیسے ملوں ان سے جو اماں کو بھی پتہ نہ چلے۔" اس کا جی چاہ رہا تھا کہ کسی طرح کسم دیدی سے مل لے۔

"تم ان سے نہ ملنا ورنہ اماں مار ہی ڈالیں گی۔" آپا نے ہدایت کی مگر وہ برابر یہی سوچ رہی تھی کہ اگر مکان معلوم ہو جائے تو اسکول جاتے ہوئے ضرور ملے گی۔

اس رات آپا سخت بے چین رہیں۔ رائے صاحب کے گھر میں ایسا سناٹا تھا کہ

کسی کے بولنے کی آواز نہ آتی تھی۔ آپا شاید ساری رات نہ سوئی تھیں۔ صبح ان کی آنکھیں سُرخ ہو رہی تھیں۔

ماما کام کرنے آئی تو اس نے پھر بے حد اہم خبر سنائی کہ وہ آدمی ماتوں رات کسم دیدی کو چھوڑ کر چلا گیا۔ باقی رات کسم دیدی روتی رہی۔ آس پاس کے سارے لوگ جمع ہو گئے ماں باپ سے ملانے کے بہانے اور معافی دلانے کے لیے لایا تھا۔ رائے صاحب نے انکار کر دیا تھا مگر ان کی بیوی آج صبح منہ اندھیرے کسم کے گھر گئی تھیں۔

"یہی سزا ہوتی ہے ایسی حرافاؤں کی۔ بہت اچھا ہوا جو چھوڑ کر چلا گیا۔ لو بھلا، گھر سے بھاگ کر بیوی بننے کے خواب دیکھ رہی تھی۔ کر لیے مزے اب بھگتے" اماں زہر میں بجھی باتیں کر رہی تھیں اور آپا پر جیسے سکتہ طاری ہو گیا تھا۔

میں ابا سے کہوں گی کہ رائے صاحب کو سمجھائیں، وہ کسم دیدی کو گھر لے آئیں ہائے وہ اکیلے کیا کرے گی" اس نے بڑے جوش سے کہا تھا۔ اس مرد کی طرف سے اُسے کیسی سخت نفرت محسوس ہو رہی تھی۔ یہاں لا کر اس نے کون سا کارنامہ انجام دیا۔ وہیں کہیں دیار غیر میں چھوڑ کر بھاگ جاتا تاکہ وہ سر ٹپک ٹپک کر مر جاتیں یہ اپنوں کی ذلت تو نہ نصیب ہوتی۔

"کیا کہو گی تم اپنے ابا سے یہی نا کہ بھاگی ہوئی بیٹی کو گھر بٹھا لیں، شرم نہیں آئے گی تم کو ایسی باتیں کرتے؟" اماں نے سخت غصہ سے پوچھا تھا۔

"ہاں یہی کہوں گی!" وہ اماں کے سامنے سے ہٹ گئی۔

شام کو جب ابا دفتر سے آئے تو وہ اُن کے سامنے جا کر کھڑی ہو گئی۔ "ابا کسم دیدی اکیلی گھر میں رو رہی ہے، ابا بو رائے صاحب کو سمجھائیے وہ اسے لے آئیں۔ کوئی نہیں چھوڑ کر بھاگ گیا مجھے سب معلوم ہو گیا ہے تمہارے کہنے سے پہلے ہی رائے صاحب کو سمجھاتا۔ بڑی سمجھدار ہے میری بیٹی" ابا نے اس کے سر پہ ہاتھ پھیرا اور مسکرانے لگے۔

"اسے کیا ضرورت ہے کہ ایسی بے شرمی کی باتوں میں حصہ لے؟" اماں غصہ سے جتیا بن رہی تھیں

"کیوں نہ حصہ لے مشن اسکول میں پڑھاتی ہو اور بولنے تک کا حق نہیں دیتیں،

"صاف بات کیوں نہیں کرتے کہ انگریز بے شرم ہوتے ہیں؟" اماں لڑنے پر تل گئیں تو ابا جلدی سے بیٹھک میں چلے گئے۔

رات ابا نے چپکے سے اُس کو بتایا کہ "رائے صاحب نے بات مان لی ہے وہ کسم کو گھر لے آئیں گے اور شاید لے بھی آئے ہوں۔"

ابا کے اس سلوک پر وہ کتنی خوش ہوئی تھی۔ اس دن اُسے اپنی اہمیت کا اندازہ ہوا تھا۔

پھر بھی وہ باوجود کوشش کے کسم دیدی سے ملنے نہ جا سکی۔

وہ رات کتنی لمبی ہو گئی تھی اسے نیند نہ آ رہی تھی کب صبح ہو اور وہ اسکول جاتے ہوئے کسم دیدی سے ملے آوارہ کتوں نے بھونک بھونک کر رات کو اور بھی ویران کر دیا تھا۔

اسکول جانے سے پہلے وہ کسم دیدی کے گھر پہنچ گئی۔ ماں جی رسوئی میں تھیں رائے صاحب آرام کرسی پر آنکھیں بند کئے لیٹے تھے اُنھوں نے اُنگلی کے اشارے سے بتایا کہ کسم ادھر ہے۔

وہ کمرے میں گئی مگر کسم دیدی وہاں نہ تھیں کوٹھری میں جھانکی وہاں وہ کھرے پلنگ پر گٹھڑی سی پڑی ہوئی تھیں اسے دیکھ کر وہ جھجک گئیں تو وہ خود ہی آگے بڑھ کر ان سے لپٹ گئیں۔

"بہت یاد آتی تھیں کسم دیدی" اس نے غور سے انھیں دیکھا فصل کٹ چکی تھی۔ کھیت ویران پڑا تھا

اس نے ہاتھ پکڑ کر انھیں اُٹھانا چاہا۔ "یہاں اندھیری کوٹھری میں کیوں گھسی ہیں باہر چل کر بیٹھئے نا۔"

"وہاں بیٹھوں تو سب لوگ مجھے دیکھنے آتے ہیں۔ ماں جی نے کہا ہو کہ چھپ کر بیٹھو پھر تیا جی میری صورت دیکھ کر دکھی ہوتے ہیں، میں بدنام ہوگئی ہوں نا۔ تہمینہ کیسی ہو؟"

"گھر چل کر دیکھ لو دیدی۔"

"اب میں کہیں نہیں جا سکتی۔" ان کی آنکھوں میں ویرانیاں رو رہی تھیں۔

"میں اپنی دیدی کو خود لے جاؤں گی۔"

اسکول کا وقت قریب تھا اس لیے وہ شام کو آنے کا وعدہ کر کے چلی گئی راستے بھر کسم دیدی کے عاشق کو کوستی رہی تھی۔

جب گھر آئی تو آپا نے اُسے پکڑ لیا اور کسم دیدی کے لیے اکٹھے بہت سے سوال کر ڈالے مگر وہ کیا بتاتی۔ کسم دیدی سے تو کوئی بات ہی نہ ہوئی تھی۔

"ان سے جا کر مل لو نا آپا۔"

"اب اگر ان سے ملی تو لوگ انگلیاں اُٹھائیں گے۔ وہ بدمعاش جو مشہور ہوگئیں۔"

مگر لوگ اس آدمی کو برا کیوں نہیں کہتے جو انہیں چھوڑ کر بھاگ گیا۔؟"

"بس نہیں کہتے، لڑکی ہی کو برا سمجھتے ہیں۔ تم بھی اب بڑی ہوگئی ہو ان کے گھر نہ جانا ورنہ لوگ انگلیاں اُٹھائیں گے۔"

اس شام اس نے پہلی بار محسوس کیا کہ اس کی عجیب سی کیفیت ہو رہی ہے عشق و عاشقی کے اُلجھے اُلجھے سے خیالات اُسے چکرائے دیتے تھے۔ یہ عشق و محبت کیا ہے جس کے لیے انسان بڑے سے بڑا گھاٹا اُٹھا لیتا ہے آخر کیوں، کس لیے۔ اس کی سمجھ میں کچھ بھی نہ آ رہا تھا۔

سوچتے سوچتے وہ تھک گئی تھی۔ اس نے سب سے پہلے کھانا کھا لیا اور اپنے بستر پر لیٹ کر کورس کی کتابوں سے اُلجھنے لگی، پھر اُسے پتہ بھی نہ چلا کہ کس وقت سو گئی۔

سوتے سوتے ایک بار اس کی آنکھ کھل گئی۔ باہر سے کتوں کے بھونکنے اور رونے کی آوازیں

آ رہی تھیں۔ رات سچ مچ منحوس ہو رہی تھی اچانک اس کی نظر سامنے اُٹھ گئی۔ چاندنی رات میں رائے صاحب کی چھت کا کمرہ صاف نظر آ رہا تھا اور اس میں دیئے کی روشنی ادھر سے اُدھر پھیر رہی تھی۔ پھر اسے کوئی نظر آیا جو سر سے پاؤں تک سفید کپڑوں میں لپٹا ہوا تھا اس نے مارے خوف کے آنکھیں بند کر لیں اس کمرے میں تو کوئی بھی نہ رہتا تھا خود کسم دیدی نے اسے بتایا تھا کہ جب سے دادا جی اس کمرے میں مرے ہیں تب سے یہ بند پڑا ہوا ہے وہاں جاتے ہوئے سب لوگ ڈرتے ہیں۔

اس نے ڈر کر سوچا کہ شاید کسم دیدی کے دادا کی روح آ گئی ہو مگر پھر اسے یاد آیا کہ ہندوؤں کے گھروں میں بھوت آتے ہیں اس نے ڈر کر اماں کو پکارا لیکن وہ کروٹ لے کر پھر سو گئیں۔

ذرا دیر بعد روشنی بجھ گئی اور یہ سایہ غائب ہو گیا تو اس نے اطمینان کی سانس لی۔

صبح سب لوگ چائے پی رہے تھے کہ رائے صاحب کے گھر سے رونے پیٹنے کی آواز آنے لگی۔

"میں جانوں وہ کسم پھر بھاگ گئی" ! بڑے چاؤ سے باہر بھاگی۔ ساتھ ہی ابا بھی باہر لپکے۔

"چلو فرصت ہوئی۔ کسم تالاب میں جا ڈوبی، پتہ نہیں چلا کہ رات کس وقت گھر سے نکل گئی۔"

ابا چند منٹ بعد واپس آ کر چپکے کرسی پر گر پڑے۔ یہ سارا دن لوگ اُسے دیکھنے اور معلومات حاصل کرنے آتے رہے شاید وہ دیکھنا چاہتے تھے کہ بھاگنے والی کے سر پر سینگ تو نہیں نکل آئے ہیں۔ "میرے کپڑے لاؤ مجھے رائے صاحب کے گھر جانا ہے۔"

اماں بالکل دم بخود تھیں۔ آپا رو رہی تھیں۔ اور وہ آپا کے کندھے پر سر رکھے سر سے پاؤں تک لرز رہی تھی۔ ابا اُس کا سر سہلا رہے تھے۔ اسے تھپک رہے تھے مگر اسے جانے کیا ہو گیا تھا کہ رویا بھی نہ جاتا تھا۔

کسم دیدی کھاٹ پر ڈال کر گھر لائی جا چکی تھیں۔ عورتوں کے ہجوم کو چیر کر جب اس نے اس کے کھلے ہوئے چہرے کو دیکھا تو چیخ پڑی۔ سوجا ہوا نیلا چہرہ جذبات سے خالی تھا

سب ان کو دیکھ رہی تھے مگر انھوں نے سب کو دیکھنے سے انکار کر دیا تھا۔ ان کے ہونٹ عجیب انداز سے کھلے ہوئے تھے جیسے "کون گلی گئیو شیام" کے بول ہمیشہ کے لیے ٹوٹ گئے ہوں۔ کھاٹ سے لٹکی ہوئی سفید ساری کے پلّو سے پانی کی آخری بوند بھی ٹپک کر کچے صحن میں جذب ہو چکی تھی۔

(۱۰)

اکتوبر کا مہینہ تھا۔ ہلکی ہلکی سردی پڑنی شروع ہو گئی تھی۔ دُلائیاں اوڑھ اوڑھ کر سب لوگ اندر سونے لگے تھے۔ سردیوں میں اسے کیسے مزے کی نیند آتی مگر آپا کو جانے کیا ہو گیا زیادہ حصّہ جاگ کر گزار دیتیں ان کی صحت خراب ہو رہی تھی رنگ ماند پڑ گیا تھا۔ اور چہرے پر خشکی دوڑ گئی تھی اماں ان کی غذا کا خاص طریقے سے خیال رکھتیں صبح جانے کے بجائے بادام کا حریرا پلایا جاتا۔

آپا کا جہیز سِل گیا تھا اور اماں بے چین تھیں کہ کسی طرح شادی کی تاریخ مقرر ہو جائے ادھر بڑی چچی کے خط پہ خط آ رہے تھے کہ جلدی سے تاریخ مقرر کر دی جائے مگر ابّا ڈھیل دے رہے تھے۔ کہتے تھے تہمینہ کی صحت ٹھیک ہو گی جب دیکھیں گے۔

ایک بار بڑی چچی کا خط آیا تو اس میں جمیل بھیا کی تصویر بھی۔ وہ تصویر لے کر آپا کے پاس گئی تو انھوں نے منھ پھیر لیا۔

"انسان صرف ایک ہی بار کسی کا ہوتا ہے۔" انھوں نے غصّے سے کہا پھر ایک دم ہنس دیں "اب اکٹھے ہی لیں گے۔" ان کی ہنسی میں کتنی بے بسی تھی۔

"کیا آپ کو صفدر بھائی یاد آتے ہیں آپا؟" اس نے گھبرا کر پوچھا تھا۔

"تو یہ کیوں یاد آنے لگے" آپا نے سرہانے رکھی ہوئی کتاب اٹھالی۔

ابّا دفتر سے آئے تو بہت رنجیدہ نظر آ رہے تھے۔ اماں نے میز پر چائے کا سامان لگا دیا مگر ابّا ای

طرح آرام کرسی پر لیٹے رہے۔

"کیا آج چائے نہیں پیو گے۔ ٹھنڈی ہو رہی ہے، پھر آج تم کوئی اچھا سا دن دیکھ کر شادی کی تاریخ بھی مقرر کر دو، تمھاری بھابھی کے خط پہ خط آ رہے ہیں" اماں نے اپنی کرسی ابا کے قریب کھسکا لی۔

"تمھاری وجہ سے وہ اس گھر کو چھوڑ گیا، وہ غلط قسم کی پارٹی کے ساتھ ہو گیا اس لیے اپنے آپ کو تباہ کر لیا ہے اس کی تباہی کی ذمہ دار تم ہو۔

آپا کا چہرہ فق پڑ گیا۔ سب سمجھ گئے تھے کہ ابا کس کی بات کر رہے ہیں۔

کس کمبخت کو تباہ کیا ہے میں نے" اماں بولیں۔

"صفدر کی بات کر رہا ہوں۔ اب آیا عقل میں؟" ابا نے تڑسے جواب دیا

"ہائے وہ اس گھر سے جا کر بھی نہیں گیا وہ یہاں سے کبھی نہیں جائے گا" اماں نے رونے کا حربہ استعمال کر دیا۔

"تم اطمینان رکھو اب وہ کبھی نہ آئے گا" ابا نے آہستہ سے کہا اور چائے پیے بغیر بیٹھک میں چلے گئے جب وہ ابا کے لیے چائے لیکر بیٹھک میں گئی تو وہ آنکھیں بند کیے تخت پر لیٹے تھے۔ اسے دیکھ کر اٹھ گئے اور مسکرانے لگے۔ "تمھاری ماں کو میں کیسے سمجھاؤں۔ انھوں نے تمھارے بھائی کو تباہ کر دیا ہے کلکتے سے اس کا ایک دوست آیا ہے اس نے یہ سب کچھ بتایا ہے۔ تمھارا بھائی تم کو بہت پوچھ رہا تھا"

ابا وہ کون سی پارٹی ہے۔؟"

"بیٹیا وہ دہریوں کی پارٹی ہے" ابا نے ٹھنڈی سانس بھری۔ میں تو اسی کو اپنا بیٹا سمجھتا تھا۔"

"وہ کب کسی کو باپ سمجھتے تھے۔ جا کے ایک خط بھی نہ لکھا کسی کی محبت کی قدر نہ کی۔ ابا خواہ مخواہ ان کے پیچھے دیوانے ہو رہے ہیں" اس نے دل ہی دل میں سوچا مگر ابا سے کچھ نہ کہہ سکی۔

"تمھاری پڑھائی کا کیا حال ہے۔؟"

"ٹھیک ہے ابا۔"

"تم انگریزوں کے مذہب سے تو متاثر نہیں ہو؟"

"توبہ توبہ!"

"شاباش تم بڑی سمجھدار ہو۔ میری ساری اُمیدیں تم سے وابستہ ہیں تم کو پتہ ہے نا کہ مجھے ان بے ایمان تاجروں سے نفرت ہے انھوں نے ہمیں غلام بنا لیا ہے۔"

"مجھے بھی نفرت ہے انھوں نے ہمیں غلام بنا لیا ہے۔"

"مجھے بھی نفرت ہے ابا۔" اس نے ابا کو خوش کرنے کے لیے کہا تھا۔

ابا نے تپائی پر پیالی رکھتے ہوئے اس کی طرف دیکھا اُن کی آنکھیں خوشی سے چمک رہی تھیں اور وہ سوچ رہی تھی کہ ابا آخر سارے انگریزوں سے کیوں نفرت کرتے ہیں۔ خود اس کے اسکول کی نگراں کتنی اچھی اور پیاری وہ آخر کب ملک پر حکومت کر رہی ہیں۔

"انشاء اللہ ایک دن یہ سب اپنے ملک واپس چلے جائیں گے، میں تم لوگوں کے خیال سے کچھ نہیں کر سکتا مگر اتنا بڑا ملک تو بڑا ہو نا۔؟"

"جی ہاں بہت بڑا ملک ہے۔" اس نے کس قدر احمقوں کی طرح کہا تھا کہ ابا بھی مسکرا پڑے جانے کس نے دروازہ کھٹکھٹایا تو وہ کشتی اُٹھا کر جلدی سے اندر آگئی۔

"مجھے سب معلوم ہے کہ وہ اپنے آپ کو کیوں تباہ کر رہی ہیں؟" رات کو آپا نے اس سے سرگوشیوں میں کہا تھا مگر وہ چپ رہی، گم دیدی ڈوب مری۔ پھر بھی آپا کو صفدر بھائی یاد آتے ہیں۔ اس نے بڑی نفرت سے سوچا۔

اماں برآمدے میں بیٹھی بڑی چچی کے خط کا جواب لکھ رہی تھیں۔ ابا جب کھانا کھانے آئے تو اماں نے جیسے اعلان کیا۔ "میں نے تمھاری بھاوج کو عید کی دس تاریخ لکھ دی ہے۔"

آپا چپ رہیں انھوں نے کوئی جواب دیا۔ لالٹین کی پیلی پیلی روشنی میں وہ کس قدر دکھی نظر آ رہی تھیں

(۱۱)

شادی کی تاریخ قریب آتی جا رہی تھی اماں کی مصروفیت بڑھ گئی تھی۔ بارہ ایک بجے کے قریب چپراسی کی بیوی برقع اوڑھ کر آ جاتی اور چاولوں کے دھان صاف کرنے لگتی۔ ادھر سیکڑوں خشک میوے کاٹنے کو پڑے تھے اماں اس سے کام لیتے ہوئے کس قدر بے رحم نظر آتی تھیں سارے دن کی تھکی ہاری چپراسی کی بیوی جب شام کو اپنے گھر جانے کیلئے اٹھتی تو لڑکھڑا جاتی۔

جنوری کے آخری دن تھے ایک روز پہلے بارش کے ساتھ اولے پڑے تھے رت اس قدر سرد ہو گئی تھی کہ معلوم ہوتا تھا کہ برف کی سل پر لیٹے ہیں۔ مندروں سے آتی ہوئی گھنٹوں کی صدائیں جیسے ٹھٹھر کر رہ گئی تھیں۔

بڑی دیر تک باتیں کرنے کے بعد آپا نے اس کی طرف سے کروٹ لے لی تھی۔ وہ سونے ہی والی تھی کہ آپا نے پھر باتیں شروع کر دیں جانے ان کی نیند کو کیا ہو گیا تھا۔

"ایسا لگتا ہے کہ مسافروں کی طرح بیٹھی ہوں" انھوں نے بڑے کھوئے ہوئے انداز میں کہا۔

"مسافر تو ہیں ہی، کچھ دن بعد دلھن بن کر چلی جائیں گی۔ دلھن بن کر آپ کیسی خوبصورت لگیں گی۔"

"اور میرے ہاتھ ہیں نا خوبصورت؟" آپا نے اپنے ننھے ننھے ہاتھ لحاف سے نکال کر لہرائے

"ان میں مہندی رچے گی، اسی دن کے لیے تو میں نے مہندی کے ذرا سے پودے کو سینچا تھا اب وہ کتنا بڑا ہو گیا ہے جی چاہتا ہے کہ اس کے سایہ میں پڑ کر سو رہوں۔ یہ مہندی بھی کیسی عجیب چیز ہوتی ہے اس سے سہاگ کی مہک ہوتی ہے۔ محبت کی ٹھنڈک محسوس ہوتی ہے اور یہ بات بھی ہے کہ اس کی سرخی سے تمناؤں کے خون کا پتہ چلتا ہے۔"

"اوہ! آپ بھی کیسی باتیں کرتی ہیں آپا" اس نے گھبرا کر آپا کی طرف دیکھا اس وقت

اُسے خیال آیا تھا کہ اماں ٹھیک ہی تو کہتی ہیں کہ صفدر بھائی نے الم غلم کتابیں دے کر آپا کو تباہ کر دیا ہے۔

"میں کیسی باتیں کرتی ہوں" وہ مسکرائیں "باتیں ہی تو سب کچھ ہوتی ہیں۔ انہیں باتوں نے مجھے مسافر بنا دیا ہے۔ اور یہی باتیں میرے سفر کو ختم کر سکتی ہیں۔"

"آپا آپ کو صفدر بھائی یاد آتے ہیں، سچ بتایئے۔؟"

"کون صفدر بھائی۔ اری بیوقوف تیرے پاس تو عقل نام کو نہیں" آپا نے ہنستے ہوئے اس کے ہاتھ پر ہاتھ مارا، "چلو اب سو جائیں۔ اتنی رات ہوگئی۔"

شادی میں صرف چند دن رہ گئے تھے اماں سخت مصروف تھیں اور خوش تھیں کبھی کبھی وقت انھیں یہ فکر بھی ستانے لگتی کہ ان کے بھائی اور بھاوج نے ہفتے پہلے بہو بچے کو لکھا تھا مگر کسی وجہ سے نہ پہونچ سکے وہ برابر ان کا ذکر کرتی رہتیں۔ "اس ملک کی بدلتی ہوئی رتیں بھی تو بھابھی کی طبیعت کو راس نہیں آتیں۔ ذرا میں انھیں زکام ہو جاتا ہے۔ معدہ الگ خراب رہتا ہے کہیں نہ کہیں دعوت میں اس غریب کو مرچیں کھانا پڑ جاتی ہیں۔ بھلا مرچ بھی کھانے کی چیز ہے؟" اماں آپا سے جواب چاہتیں مگر وہ خاموش رہتیں۔

آپا نے اپنے کمرے سے نکلنا چھوڑ دیا تھا۔ ابا گھر میں آتے تو اپنے کمرے کے دروازے بھیڑ لیتیں۔ اماں کو ان کی شرمانے کی ادا پر بڑا پیار آتا وہ بڑے فخر سے کہتیں کہ شرم ہو تو ایسی ہو۔

اس نے آپا کے چہرے پر شرم و حیا تلاش کرنے کی لاکھ کوشش کی پر رتی بھر نہ ملی آپا کو تو جب شرم آتی تو جاپانی گڑیا کی طرح گلابی پڑ جاتیں مگر وہ تو بالکل سفید ہو رہی تھیں ان کی آنکھوں میں ایسی گہرائی تھی ایسا اندھیرا تھا کہ ان کی طرف دیکھ کر لگتا کنوئیں میں جھانک رہی ہوں۔

بارات آنے میں جب سات دن رہ گئے تو آپا کو نہلا دھلا کر اور پیلے کپڑے پہنا کر مانجھے بٹھا دیا گیا رات میراثنیں اور ڈومنیاں ڈھول لے کر آگئیں اور برآمدے میں بچھی ہوئی دری پر

بیٹھ کر قسم قسم کی آوازوں میں گانے لگیں۔ کتنا ارمان، کتنی آرزوئیں تھیں ان گانوں میں جو کچھ کنواری زندگی میں نصیب ہوا تھا اُسے پا لینے کی تمنا میں گیت کا ایک ایک بول ہاتھ پھیلائے ہوئے تھا۔

گیت ہوتے رہے اور آپا پیلے دوپٹے کی اوٹ سے آنسو پونچھتی رہیں ابا کے دوستوں کی بیویاں ایک ایک گیت کو دو دو بار سننے کی فرمائش کرتیں مگر گانے والیوں کے گلے نہ تھکتے۔ دیر دیر وقفے وقفے سے دو دو چار چار آنے داد کے طور پر گرتے رہے۔

رات دیر تک جاگنے کی وجہ سے اماں دوپہر میں تھک کر گہری نیند سو رہی تھیں۔ ماما بہت دنوں بعد دو گھنٹے کی چھٹی لے کر اپنے گھر چلی گئی تھی۔ آپا لیٹی تھیں انھیں نیند نہ آ رہی تھی وہ بار بار کروٹیں بدلتیں۔ سامنے صحن کی نیچی سی دیوار پر کوا بیٹھا ایک ساں بولے جا رہا تھا اس کی آواز سے دوپہر کا سناٹا اور بھی گہرا ہو گیا تھا۔

"مہمان آنے والے ہیں اس لیے کوا بول رہا ہے" اس نے خوش ہو کر آپا سے کہا۔

"اور مہمان جانے والے بھی تو ہیں" آپا بڑی مدت کے بعد خوش اور مطمئن نظر آ رہی تھیں مگر پھر ایک دم کچھ سوچ کر مضطرب سی اٹھ بیٹھیں۔ "عالیہ تم کو کیا پتہ میری اتنی عمر کچھوے کی طرح رینگ رینگ کر گزری ہے" ان کا چہرہ سرخ پڑ گیا۔ "تم مجھ سے اچھی رہیں، میری حیثیت تو ایسی رہی جیسے کوٹھری میں کوئی کباڑ ڈال کر بھول جائے۔" "اماں" ان کے ہونٹ کانپنے لگے۔

"اماں مجھے بھی تو ڈانٹتی ہیں مگر میں تو خوش رہتی ہوں"

"ان لوگوں نے تو سب کچھ صفدر بھائی کی دشمنی میں کیا انھیں مجھ سے خطرہ تھا نا"

"مگر اب تو آپ آزاد ہو جائیں گی صفدر بھائی اب آپ کی زندگی تلخ کرنے نہ آئیں گے خدا بچے ان سے بھی"

"ارے کوسو تو نہیں!" وہ ننگے پاؤں باہر پانی پینے چلی گئیں۔

جب وہ پانی پی کر آئیں تو اُن کی پلکیں بھیگی ہوئی تھیں اُنھوں نے لیٹتے ہوئے آنکھیں بند کرلیں
حد ہو۔ آپا اب تک اس کمینے کے لیے سوچتی ہیں کم دیدی کا انجام سوچنے کے بعد بھی عقل ٹھکانے
نہ آئی۔

وہ سونے کی کوشش کر رہی تھی کہ چپراسی ڈاک لے کر آگیا۔ آپا بھی اُٹھ گئیں اس نے خط اُلٹ کر
دیکھا۔ اماں کے نام تھا اور ایک کونے میں صفدر لکھا ہوا تھا۔ آپا نے تڑپ کر خط کھول لیا اور پڑھنے کے
بعد اس کی طرف بڑھا دیا۔ پڑھ کر وہ مارے خوف کے لرزنے لگی تھی۔ "چچی تہمینہ کی شادی
مبارک ہو۔ آپ اُسے کسی کا بھی بنا دیں پھر بھی وہ میری رہے گی، وہ صرف میری ہے۔"
آپا کے چہرے پر ایسا سکون تھا جیسے دنیا جہان کی دولت مل گئی ہو اس نے جلدی سے خط پھاڑ
اس کی کرچیاں چولھے میں ڈال دیں۔ دوسرا خط ماموں کا تھا جو اس نے احتیاط سے سرہانے رکھ لیا
"بھیا ہم تو سوتے ہیں، سخت نیند آرہی ہے۔" آپا بڑی چالاکی سے سوتی بن گئیں مگر وہ صفدر
بھائی کو دل ہی دل میں گالیاں دے رہی تھی۔ اگر یہ خط اماں کو مل جاتا تو پھر کیا ہوتا؟ اس خیال
ہی سے اس کا دل ڈوبنے لگا۔

"آپا کتنے کمینے ہیں صفدر بھائی" اس نے آپا کو ہلایا۔

"اور نہیں تو کیا ہیں۔ خدا کے لیے اماں سے ذکر نہ کرنا ورنہ جانے کیا ہوگا۔" اُنھوں نے
دھیرے سے کہا۔

رات کھانے پینے کے بعد دالان میں دری بچھا دی گئی۔ ماما نے ڈھول کس کر بیچ میں لڑھکا دی
اور رانگے کا گیس کا ہنڈا دالان کے درمیان لٹکا دیا۔ ذرا دیر بعد مہمان آنے لگے۔

رات گیارہ بجے کے بعد جب میراثنیں گا بجا کر چلی گئیں تو آپا ہولے ہولے کمرے سے نکل کر
دالان میں آ گئیں شکنیں پڑی ہوئی دری پر لڑھکتی ہوئی ڈھول بڑی موٹی معلوم ہو رہی تھی۔
ماما کرسیاں اُٹھا اُٹھا کر کمرے میں رکھ رہی تھی اور ساتھ ہی جانے کیا تلاش کیے جا رہی تھی۔

"ہائے جانے کہاں گئی، ملتی ہی نہیں،" نا معلوم جانے کس یاد کا۔

"عالیہ بٹو۔ سنو جب میں چلی جاؤں اور تم کو صفدر ملیں تو میرا ایک پیغام کہہ دینا۔ کہہ دوگی نا؟" بستر پر لیٹے ہی آپا نے بڑی بے چارگی سے کہا۔

"کیا آپا؟" آپا کو عجیب سی حالت میں دیکھ کر اس کا دل ٹوٹ گیا تھا۔

"یہی کہ میں ان کو کبھی نہیں بھولی اور بس۔"

"اب سو جائیے آپا۔"

باہر کتوں کے بھونکنے کی آواز آرہی تھی۔ وہ جانے کس وقت سو گئی۔

(۱۲)

صبح جب اس کی آنکھ کھلی تو آپا بے خبر سوئی ہوئی تھیں۔ وہ اسکول جانے کے لیے تیار ہوتی رہی مگر آپا نہ اٹھیں۔ جب سب لوگ چائے پینے کے لیے اٹھے تو اماں نے ماما کو بھیجا کہ آپا کو جگا کر چائے دے دے۔

ماما کی چیخ کی آواز سن کر ابا اور اماں آپا کے کمرے کی طرف بھاگے۔ ماما سینے پہ دو ہتھڑ مار کر کہہ رہی تھی۔ "تہمینہ بٹیا نہیں رہیں۔"

"کہاں گئیں، کہاں چلی گئیں۔" وہ مارے خوف کے کانپنے لگیں۔ وہ جانے کیسے کمرے تک گئی۔ جہاں آپا بے ہوش اماں کو تھامے کھڑے تھے مگر ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ وہ گر پڑیں گے۔

آپا سچ مچ نہیں رہی تھیں۔ ان کے مہندی رچے ہاتھ بڑی بے بسی سے پھیلے ہوئے تھے۔ ہونٹ اس طرح سیاہ ہو رہے تھے جیسے کسی نے مِسّی لگا دی ہو۔

اماں ہوش میں آتے ہی پچھاڑیں کھا رہی تھیں۔ ابا بچوں کی طرح رو رہے تھے اور وہ آپا کے ٹھنڈے جسم سے لپٹی لرز رہی تھی۔

ابا نے جلدی سے آنسو پونچھ لیے۔ "ہمیشہ سے دل کمزور تھا اس لیے دل کی حرکت بند ہوگئی ہے۔ ماماتم جاکر پانی گرم کرنے کا انتظام کرو۔ اللہ کو یہی منظور تھا۔" ابا کی آواز کانپ رہی تھی۔ ماما کے باہر جاتے ہی ابا نے اماں سے سرگوشی کی "تم ہمت سے کام لو۔ ہم مصیبت میں پھنس گئے ہیں۔ میت کو جلدی سے اٹھانا ہے۔ اماں کو چھوڑ کر انھوں نے اسے لپٹا لیا اور دوسرے کمرے میں لے گئے۔" تم تو بڑی سمجھدار ہو تم یہیں بیٹھو۔

ابا اسے اکیلے کمرے میں چھوڑ کر چلے گئے مگر اس وقت تو ابا کا حکم ماننا اس کے بس میں نہ تھا وہ جاکر دروازہ کی اوٹ میں کھڑی ہوگئی۔ ابا اماں کو سمجھا رہے تھے۔ ان کے ہاتھ میں کاغذ کا ایک پرزہ تھا جسے انھوں نے ماچس سے جلا دیا تھا۔ اور پھر اماں کو تھام کر دالان میں لے آئے ماما نے پتیلے میں پانی چڑھا کر اس وقت صبح ہی صبح دری بچھا دی پر ڈھول کس کر نہ ڈالی ابا کے دوستوں کی بیویاں آ رہی تھیں پر کوئی دری پر بیٹھے نہ پھٹک رہا تھا۔ سب رو رہی تھیں اور ان کے بیچ میں بیٹھی ہوئی اماں کو بار بار غش آ رہا تھا۔

آپا کو جلدی جلدی نہلا دھلا کر رخصت کر دیا گیا۔ اماں پاگلوں کی طرح ان کے پیچھے بھاگ رہی تھیں۔

"ارے بٹیا، بڑی بٹیا رخصت ہوگئیں۔ تم گاؤ نا، کاہے کو بیاہی بدیس لکھیا بابل مورے"

اماں کی بات پر جیسے کہرام مچ گیا۔ وہ آپا کے کمرے میں بھاگ گئی تھی۔ اور زمین پر بیٹھ کر دل کی بھڑاس نکال رہی تھی۔ جلے ہوئے کاغذ کے ٹکڑے ادھر ادھر اڑتے پھر رہے تھے

"ہائے کیسی ارمانوں بھری چلی گئی۔" ماما بولائی ہوئی کمرے میں آئی اور ادھر ادھر کچھ تلاش کرنے لگی۔ "کل سے افیم کی ڈبیہ کھوئی تو پھر نہ ملی۔ ایک ذرا سی کھا لیتی تو دل ٹھہر جاتا۔

---

(١٣)

بڑے چچا اور بڑی چچی اور ماموں آئے دو دن رہ کر پھر سب رو پیٹ کر چلے گئے۔ ماموں کی انگریز بیوی نہ آ سکی تھی کیونکہ ان دنوں وہ ماں بننے والی تھی اور جمیل بھیا بھی تو نہ آ سکے تھے ذرا اپنی ہونے والی دولھن کی تربت ہی دیکھ لیتے۔

اس حادثہ کے بعد اماں کیسی چپ اور گھٹی گھٹی رہتیں۔ اس کے بعد تو صرف وہی ان کی محبت کا مرکز رہ گئی تھی۔ ہر وقت نظروں میں رکھتیں۔ ذرا دیر کو پاس سے ہٹتی تو اماں کو اختلاج کے دورے پڑنے لگتے۔

ابا اماں سے کتنے دور ہو گئے تھے۔ دفتر سے آکر بیٹھک ہی میں ہاتھ منھ دھوتے ہیں چائے پیتے اور کھانا کھا کر رات کے گیارہ بجے تک دوستوں کے جمگھٹ میں بحث و مباحثہ کرتے رات جب سب سو جاتے تو چپکے سے آکر اپنے بستر میں دبک جاتے۔ آپا کے مرنے کے بعد سناٹا ہر طرف ڈراتا پھرتا اور کوئی بھی نظر نہ آتا۔ جو اس سناٹے کو توڑ دے۔

صفدر بھائی کی پھر خبر نہ لگی۔ انھیں زمین نگل گئی یا آسمان وہ تو ان کے پتے کیلئے تڑپتی تھی وہ انھیں لکھنا چاہتی تھی کہ قبر کے پاس کافی جگہ ہے اگر محبت کرتے ہو تو پھر آ جاؤ۔

اس دن جب ابا بیٹھک میں آئے تو کوئی ساتھ نہ تھا۔ وہ جلدی سے ان کے پاس چلی گئی۔ کتنی مدت ہو گئی تھی کہ وہ ابا کے پاس نہ بیٹھ سکی تھی ان سے کوئی بات نہ کر سکی تھی۔

"ابا آپ گھر میں نہیں آتے۔ کسی سے نہیں بولتے" اس نے جاتے ہی ابا سے کہا تھا، اس کی آواز بھرا رہی تھی۔ ابا نے گھبرا کر اس کا سر سینہ سے لگا لیا تھا۔

"تمھاری ماں نے مجھے گھر سے دور کر دیا ہے تم کو سب کچھ معلوم ہے"

اس کا کتنا جی چاہا تھا کہ ابا سے کہے کہ اماں نے کسی کو گھر سے دور نہیں کیا صفدر بھائی

نے سب کو ایک دوسرے سے جدا کر دیا ہے، پھر آپ تو انگریز دشمنی میں ایسے مصروف ہیں کہ پیچھے مڑ کر دیکھتے ہی نہیں۔ آپ محبت کو پہچانتے ہی نہیں۔ مگر وہ یہ سب کچھ نہ کہہ سکی اُسے خود حیرت تھی کہ ابا کی بے اعتنائیوں کے باوجود وہ انھیں سب سے زیادہ کیوں چاہتی تھی۔ کیسا جہاں آباد تھا، ابا کی شفیق آنکھوں میں وہ ابا کے خلاف کبھی ایک لفظ بھی تو نہ کہہ سکی۔

'تمھاری ماں نے مجھے کبھی نہ سمجھا۔ انھوں نے میری کسی خواہش کا ساتھ نہ دیا۔ اگر مجھ میں بھی تمھارے بڑے چچا جیسی جرأت ہوتی تو آج میں اتنا مجبور نہ ہوتا۔' ابا جانے کیا کہنے والے تھے کہ رائے صاحب آ گئے۔

ابا کی موت نے اسے اپنی عمر سے آگے بڑھا دیا تھا۔ وہ اماں کی دلجوئی کرنا چاہتی تھی۔ ابا کو گھر واپس لانے کے لیے بے قرار تھی۔ وہ انھیں سیاست بازی سے ہٹانا چاہتی تھی۔ اس کی شکایت کے بعد ابا تھوڑی دیر کے لیے گھر میں بیٹھنے لگے مگر ایسا لگتا کہ اماں سے کترا رہے ہیں اور اماں جب اُن سے آنکھیں چار کرتیں تو چہرے پر بیتے ہوئے دنوں کی یاد لرزنے لگتی اور وہ صفدر بھائی کے لیے سوچتی رہ جاتی۔ کس قدر ٹھاٹ سے اس شخص نے ایک خط لکھ کر ابا کو موت کے منھ میں ڈھکیل دیا تھا۔

ابا کی موت کو کئی مہینے ہو گئے تھے مگر اماں نے اُن کی کسی چیز کو ادھر سے اُدھر نہ کیا تھا۔ ابا کا پلنگ اُسی طرح پڑا تھا۔ ان کی کتابیں اُسی طرح رکھی تھیں وہ جب اُن کے کمرے میں جاتی تو ایسا محسوس ہوتا کہ دل ڈوب جائے گا۔ اماں نے اُن کے جہیز کے بکس کو بھی اسی کمرے میں لگوا دیے تھے۔ انھیں دیکھ کر اُسے عجیب سی بے بسی کا احساس ہوتا کچھ دن بعد آپا کے جہیز کے بکس میں جھینگر گھس کر سب کچھ چاٹ جائیں گے۔ برسات میں لچکا گوٹا سیاہ پڑ جائے گا وہ سوچا کرتی تھی۔

میٹرک کا امتحان دینے کے بعد وہ بالکل بے کار ہو گئی تھی۔ دن کاٹے نہ کٹتے۔ بس ان

دونوں آپا کی کتابیں اُٹھا کر پڑھنے لگی۔ کتنے عشق و محبت سے بھرپور قصے تھے۔ عورتیں محبت میں خودکشی کر کے مثالی وفا پیش کر جاتیں، اور مرد کسی تاریک رات میں قبر پر شمع روشن کر کے چلے جاتے اور بس۔

کتابوں کو الماری میں پٹخ کر وہ مارے جھنجھلاہٹ کے روتی رہی تھی۔ اور آپا آنسوؤں کے پردوں کے اس پار کھڑی بڑی حقارت سے اس کو دیکھتی رہی تھیں۔

(۱۴)

دو تین دن سے ابا سخت مصروف تھے۔ دفتر سے بھی بڑی دیر میں آتے۔ ان کا انگریز افسر معائنے کے لیے آنے والا تھا۔ ابا ہر چیز ٹھیک کرانے کے علاوہ ڈاک بنگلے میں اس کے رہنے کا انتظام بھی کرا رہے تھے۔ آپا کے ہاتھوں کے کڑھے ہوئے کئی میز پوش اور گلدان بھی چپراسی مانگ لے گیا تھا۔

"خوب انگریزوں کو گالیاں دیتے ہیں اور اب وہ آ رہا ہے تو مارے ڈر کے سٹی گم ہو رہی ہے۔ ہمیشہ کی زبانی جمع خرچ کرنے میں کیسے تیز ہوتے ہیں لوگ بھی" اماں بڑے فخر اور طنز سے ہنستیں تو اس کے تن بدن میں آگ لگ جاتی۔ کاش وہ ایک ذرا دیر کو اماں کی آواز بن سکتی تو پھر بتاتی کہ چھیڑ خانی کرنے کا کیا فائدہ ہوتا ہے۔ ابا گھر سے دور ہوتے جا رہے تھے اور اماں اپنے حال میں مست تھیں۔

رات ابا تھکے ہارے جب آئے تو اس سے کہا تھا "بیٹی تم رات کے کھانے کا ذرا اچھا سا انتظام کرا دینا۔ ایک چھ سات آدمیوں کا کھانا لے جانا ہے۔ صبح وہ معائنے کو آ رہا ہے۔ رات ہمارے گھر دعوت ہو گی۔" اماں بھی ہنس کر بولی تھیں "ویسے تو بڑی نفرت کرتے ہو اور خوشامد میں لگے ہو اس کی۔ ارے مجھ سے کہو میں خود دعوت کا انتظام کر دوں گی۔" پھر اماں آپا کے سامنے بھی شروع ہوئیں۔

"تم نے خوشامد نہ کی تو پھر تم بھیک بھی مانگنے لگو گی" ابا جلدی سے باہر چلے گئے اور

وہ اماں سے ایک لفظ نہ کہہ سکی۔ ان کی اُجاڑ صورت دیکھ کر رحم آنے لگا۔

دوسرے دن ابا تاروں کی چھاؤں میں اُٹھ کر اسٹیشن چلے گئے۔ اماں اپنے پلنگ پر پاؤں لٹکائے بیٹھی بڑے طنز سے ہنستی رہیں مگر ابا نے ان کی طرف نہ دیکھا۔

دن کا ایک رہ گیا مگر ابا کھانے پر بھی نہ آئے۔ وہ اماں کے ساتھ رات کی دعوت کے انتظام میں مصروف رہی، اس نے بیٹھک کو بڑے نئے طریقے سے سجایا تھا اور گیس کے دو دو ہنڈے منگوا کر اچھی طرح صاف کرالیے تھے۔

اماں کئی قسم کے کوفتے اور کباب تیار کرا رہی تھیں اور ایک سال پیچھے جا رہی تھیں کہ مصالحہ بغیر مرچ کے پیا جائے۔ اماں نے اتنی لگن سے کبھی کسی دعوت کا انتظام نہ کیا تھا

کھانا بس تیار ہی تھا کہ چپراسی بوکھلایا ہوا بغیر آواز دیے گھر میں گھس آیا ایسا معلوم ہوتا ہوا کہ بڑی دور سے بھاگتا ہوا آ رہا تھا۔

"بیگم صاحب اپنے بابو جی کو پولیس پکڑ لے گئی۔ مال لینے کے وقت افسر سے جھگڑا ہو گیا۔ اور اپنے بابو جی نے رُول سے اس کا سر پھاڑ دیا۔"

اماں نے آنکھیں پھاڑ کر اس طرح دیکھا جیسے اُن کے چاروں اور اندھیرا چھا گیا ہو۔ پھر انھوں نے چیخنا چاہا تو بس منہ کھول کر رہ گئیں۔ دعوت کے سامان پر مکھیاں بھنک رہی تھیں۔

"کہاں ہیں ابا۔ میں اُن کے پاس جاؤں گی" وہ پاگلوں کی طرح اُٹھ کر بھاگی تھی۔ مگر چپراسی اس کے سامنے دیوار بن گیا تھا۔ "آپ کہاں جائیں گی بٹیا بی بی؟"

"تو میرے سر چڑھتا ہے" اُس نے چپراسی کو مارنے کے لیے دونوں ہاتھ اٹھا دیے تھے

"میں تو بٹیا بی بی کا غلام ہوں، آپ کہاں جائیں گی، بابو جی تو تھانے میں ہیں" چپراسی نے صافے کا پلو آنکھوں پر رکھ لیا۔ "ڈیم فول کہتا تھا اپنے بابو جی کو۔ حرام زادہ" چپراسی نے سُرخ سُرخ آنکھوں سے اس کی طرف دیکھا۔ "مجھے مل جائے تو ایک ہزار ایک انگریز

صدقے کر کے پھینکوں اپنے بابو جی پر سے۔ خون چڑھ گیا ہے۔ میری آنکھوں میں خون"

ذرا دیر میں رائے صاحب آ گئے۔ اماں دروازے کی اوٹ میں کھڑے ہو کر ان سے باتیں کر رہی تھیں انھوں نے ماموں کا پتہ دے دیا تھا کہ انھیں تار کر دیا جائے گا۔ اس نے جلدی سے بڑے چچا کا پتہ بھی دے دیا۔ وہ تو بڑے چچا کو صرف دو ہی بار دیکھ کر ان کی گرویدہ ہو گئی تھی۔ اگر بڑے چچا نہ ہوتے تو پھر کیا ہوتا۔ ماموں کتنی صفائی سے کہہ گئے تھے کہ اقدام قتل بہت بڑا جرم ہے۔ ایسے آدمی کے بیوی بچوں کی سرپرستی کرنے میں انھیں بھی خطرہ تھا۔

اماں تو اس سے یہ بات صاف چھپا گئی تھیں۔ مگر اس نے برآمدے میں کھڑے ہو کر خود اپنے کانوں سے سنا تھا۔ اسے ماموں اور انگریزوں سے اس دن اتنی نفرت ہوئی تھی کہ جی چاہتا سب کی بوٹیاں چبا ڈالے۔

بڑے چچا نے آ کر سب کے سروں پر ہاتھ رکھ دیا۔ وہ دن کے اندر اندر سامان بندھوا کر تانگوں پر لدوا دیا۔ بڑے چچا کھلے خزانے انگریزوں کو گالیاں دے رہے تھے ابا کے انجام سے اُن کا جوش اور بھی بڑھ گیا تھا۔

جب بڑے چچا ابا کے دوستوں سے رخصت ہو رہے تھے اور اس کا تانگہ آہستہ آہستہ رینگنے لگا تھا تو اس نے دیکھا کہ اس کے محلے کی نگواں بڑی تیزی سے چلی آ رہی ہے

تانگے کے پاس آ کر اس نے اپنی پھولی ہوئی سانس درست کی اور پھر پیار سے اس کا ہاتھ تھام لیا "اے تم لوگ کھوش رہنا۔ غم نہ کرنا۔ تمھارا ابا بہت اچھا آدمی تھا۔ تمھارا ابا جرور آجاد ہوگا" نگواں روتے ہوئے تانگے سے الگ ہو گئی۔ وہ گڑ بانی، کھڑ بانی۔

"ابا جیل کی سلاخوں کے پیچھے تمھارا کیا حال ہوگا؟" وہ اپنے بستر پر اٹھ کر بیٹھ گئی کھڑکی کے پٹ کھول دیے تو ہوا کا ایک سرد جھونکا اسے چھو کر گزر گیا اس کا سارا درد کے بیٹھا جا رہا تھا کاش نیند آ جائے، یا پھر صبح ہو جائے۔ وہ پھر سونے کے لیے لیٹ گئی۔

(۱۵)

صبح ہو گئی۔ بادل پھٹ گئے تھے اور ادھر کھلی کھڑکی سے سورج کی کرنیں اندر داخل ہو رہی تھیں۔ رات صرف ایک گھنٹہ سونے کی وجہ سے آنکھوں میں کھٹک ہو رہی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا جیسے آنکھ میں پلک ٹوٹ کر گر پڑی ہو۔

"ارے واہ آپ ابھی تک سو رہی ہیں؟" شمیمہ کا رنگ اس وقت بڑا نکھرا ہوا لگ رہا تھا۔ عالیہ نے اسے بڑے غور سے دیکھا۔ ایسی معصوم صورت کہ لگتا فرشتوں نے سایہ کر رکھا ہو۔

"میں تو دیر سے جاگ رہی ہوں۔" وہ ہمیشہ کی طرح بستر سے اچھل کر اٹھی، لیکن ایک دم سے اسے یاد آیا کہ وہ نئی جگہ پر ہے، یہ نئی دنیا ہے اور آپا کا مشفقانہ ٹھنڈا سایہ اس سے بہت دور ہے۔

"میں نے ابھی ناشتہ نہیں کیا، آپ کا انتظار کر رہی تھی اور سب لوگ تو کھا پی چکے۔" شمیمہ نے بڑے فخر سے کہا

"بھئی تم نے بھی ناشتہ کر لیا ہوتا چھمی۔" وہ جلدی سے اس کے ساتھ ہو لی۔

"واہ میں کیوں ناشتہ کرتی آپ کے بغیر، یہاں تو کسی کو کسی کا خیال نہیں، سب کے سب خود غرض ہیں۔" چھمی نے برا سا منہ بنا لیا۔

سیڑھیاں طے کر کے دونوں نچلی منزل میں آ گئیں۔ برآمدے میں پڑے ہوئے ٹاٹ کے پردوں کے سوراخوں سے دھواں نکل رہا تھا۔ اماں اور بڑی چچی تخت پر بیٹھی بد قلعی پاندان سے پان بنا بنا کر کھا رہی تھیں۔ تخت پر بچھی ہوئی میلی چادر پر کتھے چونے کے بے شمار دھبے لگے ہوئے تھے اور کریمن بوا چولھے کے پاس سیڑھی پر بیٹھی دھواں دھار قسم کی باتوں میں مصروف تھیں۔

"اٹھ گئیں عالیہ! میں نے تم کو اس لیے جلدی نہیں اٹھایا کہ جانے نئی جگہ پر اچھی نیند آئی ہو کہ نہیں۔" بڑی چچی نے اسے اپنے پاس بٹھا لیا۔

"میں تو خوب سوئی تھی بڑی چچی۔" اس نے اپنی اماں کی طرف دیکھا۔ ان کے چہرے

پر شب بیداری اور فکروں کی دھول اُڑ رہی تھی۔

'' اللہ مارا پراٹھا تو رکھے رکھے سوکھ گیا۔ اب کیا سواد رہ گیا ہوگا'' کریمن بوا نے توا چڑھا کر پراٹھا گرم ہونے کے لیے ڈال دیا۔ '' گھی میں گندھی ہوئی پوریاں ہوں تو دس دن بھی نہ سوکھیں، بس زمانے والے کی بات ہے'' کریمن بوا نے ٹھنڈی سانس بھری۔

'' سارا سامان اسی طرح بندھا پڑا ہے ناشتہ کرکے تو اسے کھلواؤ'' اماں نے آہستہ سے کہا

'' لو بھلا، یہ کیا کھلوائے گی۔ جمیل اور شکیل آکر سب کرلیں گے'' عالیہ تو اوپر کا کمرہ پسند کرے گی اکیلے میں مزے سے پڑھے گی۔ پہلے وہاں جمیل رہتا تھا مگر اس نے رات ہی کہہ دیا کہ وہ کمرہ عالیہ کو دے دو اور دلہن تم تو یہیں نیچے میرے پاس رہو گی نا!'' بڑی چچی نے اماں سے پوچھا

'' ہاں یہیں رہوں گی'' اماں ایک لمحہ تک کچھ سوچنے کے بعد بولیں۔ شاید انھیں وہ زمانہ یاد آگیا ہوگا جب وہ بڑی چچی کو منھ لگانا پسند نہ کرتی تھیں، بے چاری بڑی چچی لٹے پٹے گھر کی لڑکی تھیں منگنی ہوگئی تھی اس لیے دادی نے مجبور ہو کر بیاہ لیا تھا کیونکہ بڑے چچا ضد کر رہے تھے، ورنہ دادی کا تو پکا ارادہ تھا کہ جب دولت نہ رہی تو منگنی بھی توڑ دی جائے۔

سوکھی ہوئی گھی چپڑی روٹی اور تھوڑے سے دودھ میں اونٹی ہوئی چائے پیتے ہوئے عالیہ کو احساس ہوا کہ گھر کی اقتصادی حالت اچھی نہیں ہے۔

'' کیسے مزے کا پراٹھا ہے، واہ واہ، بالکل کریمن بوا کی کھال کی طرح خشک ہے نا بھیا؟''

آخری بات جمیل نے اتنے دھیرے سے کہی کہ کریمن بوا نہ سن سکیں۔

'' مزے کے ہیں تو جمیل'' عالیہ نے اپنی ہنسی روکی۔

'' اللہ نے چاہا تو عالیہ کو اور مظہر کی دلہن کو یہاں کوئی تکلیف نہ ہوگی۔ اچھے دن نہیں رہے مگر جمیل پاس ہوگیا تو پھر اس گھر کے دن پلٹ جائیں گے اور پھر اپنا مظہر بھی تو چھوٹ کر آجائے گا'' بڑی چچی کچھ کہتے کہتے چپ ہوگئیں۔

"انھیں اگر اپنے بال بچوں کی فکر ہوتی تو آج جیل میں کیوں ہوتے، انگریزوں نے ان کا کیا بگاڑا تھا بھلا؟" اماں نے لمبی سانس بھری اور پھر سر نیچا کر کے چپکے سے آنسو پونچھ لیے۔ ذرا دیر کے لیے سب چپ ہو گئے جیسے کچھ سوچنے لگے۔

"اللہ تو اس گھر کو بھی مصیبت سے بچانا" کریمن بوا آہستہ سے بڑبڑائیں۔

"کریمن بوا، دوکان جانے کی دیر ہو رہی ہے، ناشتہ بھجوادو" بیٹھک سے ایک بڑی نحیف سی آواز آئی۔ کریمن بوا نے جھلا کر جھاڑو پٹکا، پھر دوڑ لیا سے ایک روٹی کھینچ کر نکالی، میلی کچیلی پیالی میں چائے انڈیل کر ٹیڑھی ٹیڑھی کیسے برآمدے سے نکل گئیں۔

"خوب ہیں یہ اسرار میاں بھی، اجی حد ہے بے شرمی کی، جب تک کھانا کو نہ مل جائے مجال ہے کہ چین لے لیں۔ انھیں تو بس کریمن بوا ٹھیک کرتی ہیں" چھمی زور سے ہنسیں۔

"اچھا تو یہ اب تک یہیں ہے، یہ بڑے بھائی کا کارنامہ ہوگا۔"

"ہاں اور کیا ہے۔ کہاں جائے یہ بے چارہ بھی، پھر دوکان بھی تو دیکھتا ہے" بڑی چچی نے مجرموں کی طرح سر جھکا کر اماں کو نیچی نیچی نظروں سے دیکھا۔

"خوب" اماں نے بڑے معنی خیز انداز سے کہا اور چھالیہ کاٹنے لگیں۔ یہاں وہ کس قدر الگ تھلگ اور اونچے پر بیٹھی ہوئی نظر آرہی تھیں۔

عالیہ نے سب کچھ خاموشی سے سُنا اور ہمدردی کی ایک لہر اس کے سینے کے پار ہو گئی۔ ہائے اگر یہ بے چارے اسرار میاں کے دوسرے بھائی آموں کی مکھیاں بھنکی گٹھلیاں نہ چوستے تو شاید آج زندہ ہوتے۔ اسرار میاں کے ساتھی تو ہوتے۔ اب یہ بے چارے تنہا اتنے بہت سے جائز لوگوں کے بیچ میں کیسے زندہ ہوں گے۔

"ذرا دیر اپنی دادی کے پاس جا کر بیٹھو" اماں نے اُسے حکم دیا۔ اور وہ جاریوں سے جانے کے لیے اُٹھ کھڑی ہوئی۔ ابا کی موت، اور ابا کی گرفتاری نے اُسے بڑا سعادت مند بنا دیا تھا۔

شاید اس طرح اماں کو خوشی محسوس ہو۔

شام کے وقت تو دادی سے کوئی بات ہی نہ ہوئی تھی۔ ایک تو سفر کی تکان تھی دوسرے دادی پر دمے نے حملہ کر رکھا تھا۔

عالیہ کو دیکھتے ہی دادی نے اپنے دونوں ہاتھ پھیلا دیے۔ دُبلے دُبلے مُرجھائے ہوئے ہاتھوں کی کھال لٹکی ہوئی تھی مگر انتہائی کمزوری کے باوجود ان کے چہرے سے رعب داب برس رہا تھا۔ عالیہ نے بڑی عقیدت سے اُن کے پھیلے ہوئے ہاتھ تھام لیے اور اپنا سر ہولے سے ان کے سینے پر ٹکا دیا۔ چھمی اپنے اُکڑوں بیٹھے بستر کو ٹھیک کر رہی تھی۔ طاق میں رکھی ہوئی لالٹین کو کسی نے اب تک نہ بجھایا تھا۔

"مظہر تو پھر کبھی نہ آیا۔ میری آنکھیں اُسے دیکھنے کو ترس رہی ہیں۔" دادی نے ٹھنڈی سانس بھری اور عالیہ نے ہونٹ بھینچ لیے۔ دادی سے تو سب نے چھپایا تھا کہ اُن کا بیٹا جیل میں ہے اور وہ بھی اقدامِ قتل کے سلسلہ میں۔

"چھٹی نہیں ملتی دادی، اب ان کا کام بہت بڑھ گیا ہے۔ اسی لیے تو انھوں نے ہم سب کو یہاں رہنے کے لیے بھیج دیا ہے۔" وہ دادی کی نظروں سے بچنے کے لیے اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔

"شکر ہے کہ پھر سب اکٹھے ہو رہے ہیں، کیا پتہ تمھارا چھوٹا چچا بھی آ جائے۔" دادی کی آنکھوں میں ہلکی سی چمک آ گئی۔

چھمی نے لالٹین کی چمنی اونچی کر کے پھونک مار دی۔ لمبے سے کمرے میں دو اونچی اونچی سیاہ رنگ کی مسہریوں اور دو کرسیوں کے سوا کچھ بھی نہ تھا۔ دیوار پر مولانا محمد علی جوہر کی ایک تصویر لگی ہوئی تھی جس کے فریم پر جانے کتنی آندھیوں کا غبار جمع تھا۔

"مظہر بیٹے کا کوئی خط بھی آیا۔؟"

"نہیں دادی، وہ بہت مصروف رہتے ہیں۔" ابا کی یاد سے اس کا دل کٹ رہا تھا۔

"ٹھیک ہے۔ مردوں کی یہی شان ہے کہ کام کریں۔ تمھارا چھوٹا چچا۔" دادی تکیے

کے سہارے ذرا سی اونچی ہوگئیں۔ "تم کو پتہ ہی نا کہ وہ خلافت کے زمانے میں چلا گیا پھر نہیں آیا۔ اس وقت خلافت کا بڑا زور تھا۔ مجھے ایسی باتیں پسند نہیں مگر دوسرے گھروں میں عورتیں ٹوپیاں کاڑھ کاڑھ کر چندے دیتی تھیں۔ انھوں نے گانے بنا رکھے تھے۔ کیا تھا وہ بھلا سا گانا۔" دادی تیوریوں پر بل ڈال کر سوچنے لگیں۔ "ہاں وہ یاد آیا ؏

بوڑھی اماں کا کچھ غم نہ کرنا

جان بیٹا خلافت پہ دے دو

یہ سب فضول باتیں ہیں۔ اسی طرح تمھارے بڑے چچا بے وقوفی میں پھنس گئے ہیں۔ مگر اب میری بات سنتا کون ہے، خیر کبھی تو عقل آئے گی۔ اور ۔۔"

"اف کتنا گندہ کمرہ ہو رہا ہے، اس پر دادی کے تھوک اور پیشاب کی بو۔ مگر میں اپنی دادی کو کسی اور کمرے میں تھوڑی رہنے دوں گی۔ یہ تو میرا اپنا کمرہ ہے۔ بڑی چچی کہتی ہیں کہ میں اسی کمرے میں پیدا ہوئی تھی۔" چھمی جلدی سے کمرے سے چلی گئی اور پھر جھاڑو لیے ہوئے واپس آگئی۔ آج اسے صفائی کا بہت خیال آ رہا تھا۔ گندے کمرے کی وجہ سے شرما شرما کر عالیہ کی طرف دیکھ رہی تھی کہ ابا کہاں ہوں گے، کس جیل میں ہوں گے، ان کا خط کب آئے گا۔

اتنی سی باتیں کرنے سے دادی کی سانس پھولنے لگی مگر جب چھمی نے جھاڑو دے کر دھول اڑانی شروع کی تو انھیں زور کا دورہ پڑ گیا۔ مارے کھانسی کے اُن سے سانس نہ لی جاتی۔ عالیہ گھبرا کر ان کا سینہ سہلا رہی تھی مگر چھمی بڑے اطمینان سے جھاڑو دے رہی تھی۔

دادی کے چہرے سے پسینہ بہہ رہا تھا۔ اور مارے کرب کے آنکھیں اُبلی پڑتی تھیں۔ عالیہ گھبرا کر کھڑی ہو گئی۔ کریمن بوا جھپٹ کر اندر آئیں اور دادی کے پاس بیٹھ گئیں۔ ان کے دونوں ہاتھ آٹے سے بھرے ہوئے تھے۔

"مالکن ۔ مالکن۔" کریمن بوا عجیب سی بیتابی کے ساتھ دادی کو سہلا رہی تھیں اور ایک

ہاتھ اپنے سینے پر رکھے جیسے اپنے ڈوبتے ہوئے دل کو روک رہی تھیں۔

"ارے چھمی بڑی بچی سے کہو جلدی سے ڈاکٹر کو بلائیں۔" عالیہ پہلی دفعہ دمے کا اتنا شدید حملہ دیکھ رہی تھی۔

"حد کر دی بجیا، بھلا اتنی سی بات پر ڈاکٹر آیا کرتے ہیں۔ دادی کو تو اسی طرح دورہ پڑتا ہے۔ سرہانے خمیرے کی ڈبیا رکھی ہے، ذرا سا چٹا دیجئے۔ اتنے پیسے کہاں کہ ہر وقت ڈاکٹر کو بلایا جائے آپ تو خواہ مخواہ گھبرا گئیں۔" چھمی دوپٹے میں منہ چھپا کر ہنسی روکنے لگی۔

عالیہ نے حیران ہو کر چھمی کو دیکھا، وہ دہلیز سے باہر کوڑا پھینک رہی تھی۔ کیا وہ بھی یہاں بیمار پڑے گی؟ اس نے ڈر کر سوچا۔ ابا تو ذرا سی چھینک پر ڈاکٹر کو بلوا لیتے تھے لیکن یہاں تو چھمی ڈاکٹر کے نام پر ہنستی ہے۔ کھانسی کی آواز سارے گھر میں گونج رہی ہے مگر یہ آواز صرف کریمن بوا کو سنائی دیتی ہے، سب اپنے کاموں میں لگے ہیں۔ کوئی ادھر نہیں آتا۔

ذرا دیر بعد دادی کی سانس ٹھیک ہو گئی اور وہ جیسے تھک کر لیٹ گئیں اور کریمن بوا ان کے چہرے سے پسینہ پونچھ رہی تھیں۔ "اب کیا حال ہے مالکن؟" کیسی تڑپ تھی کریمن بوا کی آنکھوں میں۔ دادی نے "ہوں" کر کے آنکھیں بند کر لیں، تو پھر کریمن بوا کو آٹا گوندھنا یاد آ گیا۔

"چھمی کو بلاؤ۔" دادی نے آہستہ سے کہا تو وہ کمرے کی دہلیز پر کھڑے ہو کر چھمی کو آواز دینے لگی۔

"کہہ دیجئے جب منہ دھو لوں گی تو آؤں گی۔ ہر وقت بلاتی رہتی ہیں۔" صحن میں بیٹھی ہوئی چھمی منہ ہاتھ دھو رہی تھی۔ جانے وہ اور کیا بڑبڑاتی رہی۔ دادی کے رعب کی ساری کہانیاں اس کی آنکھوں کے سامنے اُڑ اُڑ کر ختم ہو گئیں۔

"جلدی چلو عالیہ۔ سامان ٹھیک کر لو۔ بڑے ابا آ رہے ہیں۔" امّاں کی آواز آئی تو وہ

چپکے سے دادی کے پاس سے سرک آئی وہ اس وقت آنکھیں بند کیے سکون سے سو رہی تھیں۔

(۱۶)

جمیل بھیا کو اس وقت اس نے بڑے غور سے دیکھا وہ اچھے خاصے تھے مگر ان کی آنکھیں چھوٹی اور اندر کو دھنسی ہوئی تھیں۔ پھر ان کی آنکھوں میں ایسی گہرائی تھی کہ غور سے دیکھتے ہوئے جھجک محسوس ہوتی۔ اس وقت وہ سب سامان ٹھکانے لگانے کے بعد جیسے تھک کر دالان کی محراب کے بیچوں بیچ اکڑوں بیٹھے تھے اماں بہت بیزار نظر آ رہی تھیں بس کچھ ایسی کیفیت جیسے کسی طویل سفر سے دوچار ہو گئی ہوں۔ اور منزل بہت دُور ہو۔

"یہ سفر کب ختم ہو گا؟" عالیہ نے اپنے آپ سے پوچھا اور پھر اپنے بستر بند کی طرف بڑھی جو صحن میں ایک طرف پڑا ہوا تھا۔ اس کا بکس اور بستر اوپر کی منزل کے چھوٹے کمرے میں جانا تھا۔

"میں لے چلتی ہوں بجیا" چھمی کے غرارے کی پھٹی ہوئی گوٹ زمین پر لوٹ رہی تھی۔ وہ بستر بند کے تسمے گھسیٹنے لگی "تم ہٹ جاؤ بے وقوف" جمیل بھیا بڑی تندی سے اُٹھ کر چھمی کے ہاتھ سے تسمے کھینچنے لگے۔

ذرا ہوش میں رہیے گا بھیا۔ میں بجیا کی وجہ سے آپ کو جواب دینا نہیں چاہتی۔ ورنہ ــ" چھمی کا چہرہ سُرخ ہو گیا "ہٹ جائیے میں خود لے جاؤں گی بجیا کا بستر۔" چھمی نے جمیل بھیا کا ہاتھ جھٹک دیا۔ اور بستر بند گھسیٹ کر زینوں پر چڑھنے لگی جمیل بھیا چوکی پر بیٹھ کر جیسے بڑے مزے سے تماشہ دیکھنے لگے۔ بستر بند کی رگڑ سے ڈھیروں دھول اُڑ رہی تھی۔

"ارے چھمی گر جائے گی۔ دیکھو ذرا اپنی جان کے لاگو رہتی ہے۔" بڑی چچی پان لگاتے لگاتے

گھبرا کر اُٹھ گئیں

"گرنے دو اماں، کبھی تو میں بھی اسے بے بس دیکھوں۔" جمیل بھیا کھسیا کر ہنسے۔

"واہ کیا بات ہو، بے بس دیکھ کر خوش ہوتے ہیں جمیل بھیا، پھر اس سے اور اماں سے تو بہت خوش ہوں گے۔ عالیہ نے ذرا طنز سے جمیل بھیا کی طرف دیکھا اور پھر نظریں جھکا لیں۔ وہ تو پہلے ہی اُسے کنکھیوں سے دیکھ رہی تھی، وہ جلدی سے تہمی کے پیچھے ہو لی مگر بستر بند پہلے ہی اوپر جا چکا تھا۔ تہمی اسے دیکھ بڑے فخر سے مُسکرائی۔

"دیکھئے بجیا میں لے آئی نا اکیلے، بڑے آئے جمیل بھیا، ذرا سا سامان اُٹھا کر تھک بیٹھے تھے۔ بستر بند اوپر چڑھاتے تو ہانپنے لگتے۔" وہ زور سے ہنسی۔ "ارے یہ گوٹ بھی پھٹ گئی۔" اس نے پاجامے کی گوٹ اس طرح دیکھی جیسے ابھی دیکھ رہی ہو اب بھلا وہ کیسے کہتی کہ گوٹ تو اس وقت بھی پھٹی ہوئی تھی جب اسے پہننے کے لئے بکس سے نکالا تھا۔ یہ برسوں پُرانے کپڑے اس کی اماں مرحومہ کے تھے جو اب اس کا تن ڈھانک رہے تھے۔

عالیہ تہمی کے ساتھ مل کر بستر بند کھولنے لگی رشام کا جھٹ پٹا ہو چلا تھا۔ مگر ابھی گلی میں روشنی نہ ہوئی تھی۔

رات کو وہ جس بستر پر لیٹی تھی اُسے سمیٹ کر اپنا بستر لگا دیا اتنے میں جمیل بھیا اس کا بکس اٹھائے آ گئے۔ "عالیہ یہ کمرہ تمھارے لئے ٹھیک رہے گا نا، پہلے میں اس کمرے میں رہتا تھا۔ اس کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہو کہ گلی سے بجلی کی خیراتی روشنی بھی مل جاتی ہو۔ میں نے یہیں بی اے کی تیاری کی ورنہ لالٹین کی روشنی میں تو آنکھیں پھوٹ جاتیں یہ بڑا کمرہ بھی خالی رہتا تھا۔ یہاں کوئی نہ آتا تھا بس کبھی کسی وقت کوئی چمگادڑ آ جاتی تھی۔" جمیل بھیا نے کنکھیوں سے تہمی کو دیکھا مگر وہ بڑی خاموشی سے کمرے کے باہر کھلی چھت پر جا کر بکھر دی

ہو رہی تھی۔

کیا آپا کی شادی ابھی بد تمیز سے ہو رہی تھی۔ اس نے سخت ناگواری سے سوچا۔ ارے وہ تو اس کے ساتھ چند دن بھی نہ جیتیں۔ کیا یہ وہی شخص ہے جس کا نام آپا کے ساتھ لے کر وہ خوش ہوتی تھی۔

عالیہ نے اپنا بکس ٹھکانے لگا دیا اور جمیل بھیا سے کوئی بات کیے بغیر چھمی کے پاس چلی گئی۔

جاتے ہوئے اس نے مڑ کر دیکھا۔ جمیل بھیا جہاں کھڑے تھے وہیں کھڑے رہ گئے تھے۔

”آپ سے ملنے کا اتنا شوق تھا بجیا کہ بس کیا بتاؤں۔“ چھمی بولی۔ ”بڑے چچا اور بڑی چچی آپ کی بڑی تعریف کرتے تھے آپ پڑھی ہوئی ہیں نا۔ اسی لیے بڑے چچا تہمینہ آپا سے جمیل بھیا کی شادی کرنا چاہتے تھے۔ میں تو جاہل ہوں نا بجیا۔؟“

”تم تو بغیر پڑھے اتنی پیاری ہو چھمی۔ میں تو تم سے مل کر سب سے زیادہ خوش ہوں۔“ اس نے کہا۔

”میں خط بھی لکھ لیتی ہوں اور پڑھ بھی لیتی ہوں، بس اسکول نہیں گئی نا۔“ چھمی نے بڑے غرور سے بتایا۔

”تم اس سے مل کر ذرا بھی خوش نہیں ہو، تم یہاں کسی سے بھی مل کر خوش نہیں ہو گی، تم تو محض پڑھی لکھی لڑکیوں والا اخلاق دکھا رہی ہو۔“ جمیل بھیا نے بڑے مزے میں کہا اور ہاتھ ہلا ہلا کر چھت پر ٹہلنے لگے۔ کسی نے دیکھا ہی نہیں کہ وہ کب آ کر پیچھے کھڑے ہو گئے تھے۔

”پتہ نہیں آج جمیل بھیا کو کیا ہو گیا ہے، آپ کو دیکھ کر ان میں کچھ شان آ گئی ہے بجیا ویسے تو یہ حال تھا کہ میرے بغیر کوئی کام نہ ہوتا۔“ چھمی نے ترچھی نظروں سے جمیل بھیا کو دیکھا۔

”میں کہہ رہا ہوں چھمی کہ اب تم نیچے چلی جاؤ۔“ جمیل بھیا جانے کیوں ایک دم سنجیدہ ہو گئے۔

”کیوں جاؤں، اس گھر میں میرے باپ کا بھی حصہ ہے، جہاں چاہوں گی۔ بیٹھوں گی، بڑے آئے۔“

”اچھا تو پھر میں ہی چلا جاتا ہوں۔“ جمیل بھیا بڑی تیزی سے سیڑھیاں طے کرنے لگے۔

عالیہ کے لیے یہ ساری باتیں کتنی عجیب تھیں۔ اس نے حیران ہو کر چھمی کو دیکھا۔

"بجیا آپ پروا نہ کریں۔ یہاں تو ہر دم ایسی باتیں ہوتی رہتی ہیں" چھمی سخت شرمندہ نظر آرہی تھی
"چلو میں اپنی کتابیں ٹھیک کرلوں" اُسے اچانک اپنی تعلیم کا خیال ستانے لگا۔ اللہ میاں اب وہ کیسے پڑھے گی۔ روپے کہاں سے آئیں گے۔ مگر جیسے ہی اُسے یاد آیا کہ ماموں کے پاس اماں نے ڈھیر سے روپے جمع کرا رکھے ہیں تو اس نے اطمینان کی ایک لمبی سانس لی۔

چھمی کو دادی کا کام یاد آگیا۔ اور وہ جلدی سے نیچے بھاگ گئی۔ عالیہ جب اپنی کتابیں میز پر رکھ رہی تھی تو اُسے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ جمیل بھیا اس کا میز پوش بچھا گئے تھے۔ یہ وہی میز پوش تھا جو رات جمیل بھیا کی میز پر بچھا ہوا تھا۔ چلو جمیل بھیا اس کی تو عزت کرتے ہیں۔

کتابیں ٹھیک کرکے وہ کھڑکی سے نیچے گلی میں جھانکنے لگی۔ بجلی کے کھمبے کے تلے روشنی کا گول دائرہ پڑ رہا تھا اور گلی کے دوسرے سرے سے کوئی پھیری والا آرہا تھا۔ اس کے سر پر رکھے ہوئے تھال میں دو لونوں والا چراغ جل رہا تھا۔

"نیچے آؤ عالیہ بٹیا" بڑی چچی کی بھاری سی آواز سُن کر وہ جلدی سے اُٹھ پڑی۔

اماں نے دادی کے کمرے سے نکلتے ہوئے کہا "رات کی بارش سے سردی بڑھ گئی تھی اس لئے تمھاری دادی کی طبیعت زیادہ خراب ہے، سردی تو اس مرض کی دشمن ہوتی ہے"

وہ بھی دادی کے کمرے میں چلی گئی۔ چھمی اپنی مسہری پر بیٹھی پرانے کپڑوں کی مرمت کر رہی تھی اور بڑے مزے میں کوئی پرانی غزل گنگنا رہی تھی۔ ؎

جگر کے ٹکڑے ہیں یہ ہمارے جو بن کے آنسو نکل رہے ہیں

عالیہ کو دیکھ کر وہ گانا بھول گئی اور پرانے کپڑوں کے ڈھیر کو لحاف کے اندر چھپانے لگی۔ "اب تو دادی بالکل ٹھیک ہیں بجیا؟"

عالیہ دادی کی پٹی پر ٹک گئی۔ وہ آنکھیں بند کیے بے سُدھ پڑی تھیں۔ ان کا سینہ اب تک اُبھر اُبھر کر ڈوب رہا تھا۔ اُسے بچپن میں دیکھی ہوئی لوہار کی دھونکنی یاد آگئی۔ جانے یہ زندگی

کی آگ کب بجھ جائے۔ مارے ہمدردی کے اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ بڑے طاق میں رکھی ہوئی لالٹین کی روشنی ایک دم مدھم گھٹنے لگی۔ عالیہ نے دادی کے کھلے ہوئے ہاتھ کو چپکے سے لحاف میں چھپا دیا۔

کریمن بوا کمر ٹیڑھی کیے ہوئے کمرے میں آئیں اور جھک کر دادی کو دیکھنے لگیں۔ "مالکن۔" انھوں نے دھیرے سے پکارا۔ اور جواب نہ پاکر دبے قدموں چلی گئیں۔ ان کے ہاتھوں میں گیلی راکھ بھری ہوئی تھی۔

"کیا دادی سو رہی ہیں؟" شکیل دہلیز پر کھڑے کھڑے کمرے میں جھانکا۔

"سو رہی ہیں۔ پھر تم کو کیا؟" چھمی نے اسے چڑانے کے انداز سے جواب دیا۔

"بکو مت، بڑی آئیں۔" شکیل ہنکارا۔

"ارے دادی سو رہی ہیں، چپ رہو شکیل، میرے بھیا۔" عالیہ گھبرا کر کھڑی ہو گئی۔

"مجھے کچھ پیسے چاہئیں۔ عالیہ بجیا۔ کتابیں خریدنی ہیں۔"

"دادی کی طبیعت خراب ہے اس وقت۔" عالیہ نے اسے سمجھانا چاہا۔

"اب دھری ہی ہو نا ان کے پاس رو کر، سب کچھ تو لے گیا، پاؤں دبا دبا کر چالاک۔" چھمی مارے غصّہ کے بولا رہی تھی۔ "اتنی بہت سی تھیں گنیاں، کھا گئے سب مل کر۔"

"تم سے تو کبھی پاؤں بھی نہ دابے گئے۔ بے چاری دادی پڑی تڑپتی ہوتی ہیں اور یہ لاٹ صاحب مزے کرتی ہیں۔" شکیل نے جواب دیا۔

"میرے منھ نہ لگا کر کمینے، دیکھ تو ابھی بتاتی ہوں۔" چھمی اپنی مسہری سے کودی۔ دادی نے ایک لمحے کو آنکھیں کھولیں اور پھر کراہ کر کروٹ بدلی۔

عالیہ شکیل کو کھینچتی ہوئی باہر لے آئی۔ کریمن بوا صحن میں بجھی ہوئی چوکی پر لالٹین رکھ رہی تھیں۔ انھوں نے منھ ہی منھ میں کچھ کہا اور پھر برآمدے میں چلی گئیں۔

"ارے شکیل اب تو تم بڑے ہو رہے ہو پھر بھی لڑتے ہو، چھمی بھی تو تم سے کتنی بڑی ہے۔"

عالیہ نے اس کے شانے کو دبایا مگر وہ کچھ بھی نہ بولا۔ آستین سے آنسو پونچھ کر سر جھکائے کھڑا رہا۔

"لڑنا بُری بات ہے میرے بھیّا۔" عالیہ نے اُسے لپٹا لیا۔

"دادی مجھ سے محبت کرتی ہیں۔ وہ کہتی ہیں کہ میں چھوٹے چچا کی طرح ہوں۔ بس اسی لیے چھمی مجھ سے جلتی ہے۔ پھر دادی مجھے اب تک کتابوں کے لیے پیسے دیتی رہیں یہ بات چھمی کو سب سے زیادہ بُری لگتی ہے۔ آپ ہی بتائیے کہ میں کس سے مانگوں۔ ابا، جمیل بھیا، اماں، سب پیسوں کے نام پر چیخنے لگتے ہیں۔" شکیل نے معصوم بچوں کی طرح سسکی بھری۔

"میرے پاس دو روپے ہیں۔ لو گے؟" عالیہ نے پوچھا تو شکیل مارے خوشی کے اور زور سے لپٹ گیا۔ "صبح مجھ سے روپے لے کر کتابیں لے آنا۔"

"اچھا بجیا۔"

ٹاٹ کا پردہ سرکا کر وہ دالان میں چلی گئی۔ اماں اور بڑی چچی تخت پر بیٹھی تھیں اماں بالکل چپ تھیں مگر بڑی چچی بڑی خندہ پیشانی سے باتیں کرتے ہوئے چھالیہ کاٹ رہی تھیں شکیل کو دیکھتے ہی اس کی طرف پلٹیں۔ "پڑھتا بھی ہے یا گھومتا پھرتا ہے۔ امتحان میں فیل نہ ہو تو عجب کی بات ہے۔"

"کہاں گھومتا ہوں، پڑھتا ہوں اپنے دوستوں کے ساتھ، میرے پاس تو پوری کتابیں بھی نہیں۔ خواہ مخواہ ٹوکتی رہتی ہیں۔" شکیل نے بھی سختی سے جواب دیا عالیہ نے دیکھا کہ اماں حیرت اور نفرت سے شکیل کو گھور رہی ہیں۔

"بجیا جب میں مڈل کر لوں گا تو اسی سامنے والے اسکول میں پڑھوں گا۔ کتنا بڑا اسکول ہے۔" شکیل کریمن بوا کے پاس چولھے کے سامنے بیٹھ گیا۔

"بسنت آنے والا ہے۔" کریمن بوا لالٹین جلا کر بیٹھک میں رکھنے کو چلی گئیں۔ پھر واپس آ کر آٹا گوندھنے بیٹھ گئیں۔ "اللہ سلامت رکھے بڑے میاں کو، زیادہ ہوں

نہ ہوں۔ کمرے میں روشنی تو رہے۔"

"بڑے چچا کب آئیں گے۔" عالیہ نے پوچھا۔

"جب ان کا جلسہ ختم ہوگا۔" بڑی چچی بے بسی سے ہنسیں۔ "جمیل بھی آجاتا تو گرم روٹی کھالیتا۔"

"اللہ کرے مظہر میاں کا جیل سے خیریت کا خط آجائے۔ مولا تو ہی اپنی امان میں رکھنے والا ہے۔" کریمن بوا نے آٹا گوندھ کر توا چولھے پر رکھدیا۔

عالیہ کے دل میں ہوک سی اٹھی۔ اسے ابا سے کتنی محبت تھی۔ حالانکہ اس نے اپنے گھر میں کبھی ہنستی کھیلتی زندگی نہ دیکھی تھی۔ وہ ابا کو اماں کی تلخ زندگی کا ذمہ دار سمجھتی تھی اُسے سیاست سے نفرت ہوگئی تھی۔ ابا کے مقاصد اس کی نظر میں کتنے بھونڈے تھے پھر بھی وہ انہیں بے تحاشہ چاہتی تھی۔ ابا کی حفاظت میں کتنا سکون محسوس کرتی تھی۔ مگر اب وہ اس محبت کی حفاظت سے محروم ہوگئی تھی۔

"بجیا اب آپ کالج میں نہیں پڑھیں گی؟" شکیل دو روٹیوں کے تصور سے کتنا خوش نظر آرہا تھا۔ گھر کے سامنے، گلی کے اس پار بڑے سے میدان میں بنی ہوئی اسکول کی لال عمارت اس کی تمناؤں کا مرکز تھی۔ اپنے گھٹیا سے مڈل اسکول سے بھاگ جانے کی کتنی خواہش تھی۔

عالیہ چپ رہی۔ اماں نے اسے بڑی دکھی نظروں سے دیکھا مگر ایسی نظریں جن میں عزم بھی تھا ابا کی یاد نے اسے اتنا بے کل کردیا تھا کہ وہ کریمن بوا اور بڑی چچی کے اصرار کے باوجود اچھی طرح کھانا بھی نہ کھا سکی اور جلدی سے اٹھ گئی۔ کریمن بوا بڑبڑاتی رہ گئیں۔ "گھر والوں کی یہ تو بوڑھیوں جیسی خوراکیں رہ گئی ہیں۔ اور اسرار میاں اتنا کھا رہے کہ پکا پکا کر ہاتھ ٹوٹ جائیں اور ——"

(۱۷)

تھوڑے دنوں میں عالیہ کو گھر کے سارے حالات معلوم ہوگئے۔ بڑے چچا نے جاگیر چھننے کے بعد کپڑے کی دو بڑی بڑی دکانیں کھول لی تھیں جن کی نگرانی کسی زمانے میں وہ خود کرتے تھے، انھوں نے یہ خوبصورت سا گھر بڑے چاؤ سے بنوایا تھا۔ گھر میں مثالی خوش حالی تھی مگر جب وہ بڑی سرگرمی سے سیاست میں حصہ لینے لگے تو دو دکانیں اسرار میاں کی نگرانی میں لشتم پشتم چلنے لگیں وہ بھی ان کی آمدنی چندوں اور سیاسی نذرانوں پر خرچ ہو جاتی۔ بڑے چچا کئی بار جیل جا چکے تھے۔ انھیں قید تنہائی اور بیڑیاں پہننے کی سزا بھی مل چکی تھی۔ ان کے پیروں میں سیاہ گھٹے پڑے ہوئے تھے۔ پاؤں دھوتے ہوئے وہ ان سیاہ گھٹوں کو بڑے فخر و پیار سے دیکھا کرتے تھے وہ اس قدر کٹر کانگرسی تھے کہ خالص مسلمانوں کی کسی بھی جماعت کو برداشت نہ کرسکتے تھے، انھیں تو ان کے مسلمان ہونے پر بھی شبہ رہتا۔ کانگریس کے سوا ہر جماعت کے لوگ ان کی نظر میں ملک سے غدّار تھے۔

بڑے چچا اپنی دُنیا میں اس قدر مگن رہتے کہ اپنے گھر کی دنیا کو بھول چکے تھے۔ اپنی بڈھی کی اکلوتی بیٹی کو ایک معمولی سے لڑکے سے بیاہ دیا تھا وہ بھی صرف اس لیے کہ لڑکا کانگرسی تھا اس وقت تک اب تک اُن کی بیٹی چار عدد بچوں کی ساتھ اپنے آنگن میں گر بر بتاب بھاپ کر زندگی گزار رہی تھی۔ بڑے چچا کو بھلا اتنی فرصت کہاں تھی کہ اپنی بیٹی کے مستقبل کی فکر کرتے یا کوئی کھاتا پیتا گھرانہ تلاش کرتے۔ بڑی چچی نے جب بیٹی کی جوانی کی بہت دہائی دی تو انھیں اپنے سیاسی کارکن سے زیادہ بہتر کوئی نظر نہ آیا مگر چند ہی دنوں بعد بڑے چچا کو اس بہتر آدمی سے بھی نفرت ہوگئی کیونکہ وہ سیاست سے الگ ہو کر اپنے چند بیگھے زمین اور بیوی بچوں میں کھو گیا تھا۔ بڑے چچا پھر کبھی اپنی بیٹی کے گھر نہ گئے۔

جمیل بھیا کو انھوں نے ایک مُفت کے پرائمری اسکول میں داخل کرادیا تھا۔ جمیل بھیا نے بی اے تک کس طرح پڑھا۔ اس کی انھیں کوئی خبر نہ تھی۔ شکیل جب پڑھنے کے لائق ہوا تو جمیل بھیا نے اس کو مار مار کر اسی پرائمری اسکول میں پڑھنے کو بٹھادیا۔ جہاں خود پڑھا تھا۔

جمیل بھیا کی اپنے باپ سے نہ بنتی تھی، وہ خالص عشقیہ تک بندی کرتے تھے۔ مشاعروں میں جاتے تھے اور رسالوں میں بھیجی ہوئی غزلیں واپس پاکر ایڈیٹروں کو بُرا بھلا کہتے تھے۔

بڑے چچا جب تک گھر میں رہتے بڑی چچی اور کریمن بوا مہمانوں کے کھانے کا انتظام میں سارا دن گزار دیتیں۔ بڑے سے پتیلے میں بڑا گوشت سرسوں کے تیل میں پکایا جاتا۔ ہندوؤں کے لیے دکان سے پوری ترکاری خریدی جاتی۔ کریمن بوا ڈھیروں روٹیاں پکاتے ہوئے بڑبڑاتی رہتیں خالص گھی کی خوشبو یاد کر کے ان کی آنکھوں میں آنسو رہتے، پھر بھی یہ گھر چل رہا تھا۔ سب کو پیٹ بھر روٹی ضرور مل جاتی۔

بڑے چچا سے جب گھر کی ضرورتوں کا ذکر کیا جاتا تو وہ سُرخ پڑجاتے جانے کیوں جھینپ کر سب کی طرف دیکھتے، اپنے بڑھے ہوئے پیٹ پر ہاتھ پھیرتے اور پھر بڑی اُمنگ سے سب کو سمجھانا چاہتے۔ "جب ملک آزاد ہو جائے گا تو سب کی تکلیفیں دُور ہو جائیں گی، تم لوگ ذرا گہرائی میں جاکر سوچو"

"کہاں تک جائیں گہرائی میں" بڑی چچی کبھی کبھی جھلا اٹھتیں۔

"بڑے چچا کا مطلب ہے کہ کنویں میں گر جاؤ" چھمی ایسی باتیں سُن کر ضرور مذاق اُڑاتی اور وہ اس کی باتیں اس طرح نظر انداز کر جاتے جیسے کچھ سُنا ہی نہیں۔ جانے بڑے چچا میں اتنا صبر کہاں سے آگیا تھا۔ وہ گھر میں ہوتے تو کوئی نہ کوئی تیر و نشتر بنا رہتا۔ مگر وہ ہنس ہنس کر سہتے، یا پھر بیٹھک کی راہ لیتے۔

بڑی چچی اس گھر میں اسے عبرت کی لاش معلوم ہوتیں ان کی آنکھوں میں جیسے صدیوں کا دُکھ سمایا ہوا تھا اتنی بہت سی جانوں کی فکر صرف ان کے کاندھوں پر سوار رہتی۔ اسرار میاں کا ذکر

سے کچھ کاٹ پیٹ کر بڑی چچی کی نکروں کو کبھی کبھی کم کر دیا کرتے، مگر خود دیر تک مٹھیک میں پڑے، سائنوں کی طرح چند روٹیوں کے لیے آوازیں لگاتے رہتے۔

ان سب باتوں کے باوجود عالیہ کو بڑے چچا بہت اچھے لگتے تھے۔ بس بالکل اسی طرح جیسے اپنے ابا سے شکایتوں کے بعد بھی آفاقی سی محبت تھی۔ اسکی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ یہ گھروں کے دکھوں اور تباہیوں کے علمبردار اس کے دل میں محبت کی ہلچل کیوں مچاتے رہتے ہیں، یہ کیسا خلوص تھا۔ کیسی محبت تھی کہ وہ ذرا سی بات پہ ان کے لیے تڑپ اُٹھتی۔ بڑے چچا جب گھر میں آتے تو وہ سب کام چھوڑ کر ان کے ہاتھ منھ دھونے کے لیے چوکی پہ پانی رکھ دیتی۔ جب وہ ہاتھ منھ دھو کے تھکے تھکے سے اپنے بستر پر لیٹ جاتے تو وہ ان کے سرہانے بیٹھ کر ہولے ہولے ان کا سر سہلانے لگتی۔ بڑے چچا اس کا سر اپنے سینے سے لگا کر لمبے دعائیں دیتے اور پھر سکون سے آنکھیں بند کر لیتے اور چھمی دوپٹے کے پلو کو منھ میں اڑس کر اپنی ہنسی روکنے لگتی۔ "ہائے بڑے چچا بے چارے تھک کر چور ہو جاتے ہیں، کام ایسا ہی ٹھہرا نا۔"

عالیہ کو اس گھر کی زندگی اپنے گھر سے زیادہ جھگڑالو اور تھکی ہوئی معلوم ہوئی مگر وہ کسی طرح خود کو بہلا رہی تھی۔ بڑے چچا نے اس کو اپنی کتابوں کی الماریوں کی چابیاں دے دی تھیں کہ وہ انھیں پڑھے اور دل و دماغ روشن کرے۔ ساتھ ہی یہ بھی ہدایت کر دی تھی کہ یہ چابی جمیل بھیا کے ہاتھ نہ لگنے پائے۔ اس بے کار تنگ نظری کے لیے یہ کتابیں کوئی حیثیت نہیں رکھتیں۔ دوپہر کے سناٹوں میں وہ بڑی احتیاط سے ایک ایک کتاب نکال کر لاتی اور پڑھتی۔ اس کا دل ان کتابوں کے ہر اس کردار سے ہمدردی رکھتا تھا جنھوں نے آزادی اور انسان کی فلاح و بہبود کے لیے گولیاں کھائیں مگر وہ ان سے خوف بھی محسوس کرتی تھی۔ اسے یقین تھا کہ ایسے لوگ کسی سے محبت نہیں کرتے، یہ لوگ شادیاں کرتے ہیں، بچے ہوتے ہیں اور انھیں تباہ کر دیتے ہیں، ان کا اپنا گھر دنیا کے کسی حصے میں شامل نہیں ہوتا۔ ان کے گھر والے انسان نہیں ہوتے

یہ محبت کے قدموں کے کانٹوں ہوتے ہیں جو ذرا دیر میں لہو لہان کر دیتے ہیں۔ اماں، بڑی چچی، کلثوم دیدی اور تہمینہ آپا کا انجام اس کے سامنے تھا۔ سترہ اٹھارہ سال کی عمر میں وہ کتنی سمجھ دار ہو گئی تھی۔ فکروں اور غموں نے اس کا بچپن کتنے جلدی چھین لیا تھا۔

(۱۸)

ماموں کا خط آیا تھا۔ انھوں نے اماں کو لکھا تھا کہ ان کی بھابی کے مشورے کے مطابق وہ سارا روپیہ اکٹھے نہیں بھیجیں گے بلکہ تیس روپیہ مہینہ عالیہ کی تعلیم کے لیے بھیجتے رہیں گے جس سے کپڑا وغیرہ بھی بن جائے گا۔ بُرے وقت میں زیادہ روپیہ پاس نہیں رکھنا چاہیے ہر ایک کی نظر پڑتی ہے۔

اماں یہ خط پا کر بہت خوش تھیں اور تین مہینے بعد منی آرڈر وصول کرتے ہوئے ان کے ہاتھ خوشی سے کانپ رہے تھے مگر عالیہ کو غصہ آ رہا تھا کہ ایک تو تین مہینے کے بعد پوچھا ہے اس پر سے صرف تیس روپیہ مہینہ بھیجنے کا فیصلہ۔ کیا وہ ان خراب حالات میں بھی بڑے چچا پر بوجھ بنی رہے گی۔ اماں سے کچھ کہنا بے کار تھا۔ ماموں کے خلاف کچھ کہہ کر وہ اماں کا دل نہ دکھانا چاہتی تھی۔ وہ بڑی خاموشی سے اپنے کمرے میں چلی گئی۔ ماموں کے خط سے ان کی جان جل گئی جس کے خط کا بے چینی سے انتظار تھا وہ نہ آیا۔ ان تین مہینوں میں ابا نے صرف ایک خط لکھا تھا جس میں چچا کے پاس آ جانے پر اظہار خوشی کیا اور عالیہ کو تعلیم جاری رکھنے کی ہدایت کی تھی۔ اپنے لیے ایک لفظ بھی نہ لکھا تھا۔

ابھی وہ سوچ ہی رہی تھی کہ اماں اوپر آ گئیں۔ سیڑھیاں چڑھنے کی وجہ سے وہ ہانپ رہی تھیں۔ مگر ان کا چہرہ خوشی سے سُرخ ہو رہا تھا۔ "بھابی کتنی ہوشیار ہیں انھیں تو معلوم ہی ہو گیا تھا کہ یہاں سب ننگے بھوکے ہیں۔ لوٹ کھائیں گے۔" اماں

سرگوشیوں میں باتیں کر رہی تھیں "جمیل سے کہہ کر ایک ماسٹر کا انتظام کروا دو گھر بیٹھے امتحان دے"

مگر اماں ان روپوں سے کیا ہوگا۔ ہمیں اپنے سارے اخراجات برداشت کرنے چاہئیں کچھ دن کی بات ہے پھر ابا آجائیں گے۔ بڑے چچا نے بہت اچھا وکیل کیا ہے۔ ابا کو کم سے کم سزا ہوگی۔"

"کیا پتہ وہ افسر مرا تو نہیں مگر الزام تو قتل کا ہے، جانے وہ کب آئیں۔ ہائے اگر ان میں ذرا بھی متانت ہوتی تو اپنے گھر کا خیال کرتے۔" اماں کو شاید بیتے ہوئے تلخ دن یاد آرہے تھے۔ وہ سہانے دن! سوچ رہی تھیں۔

"دلھن، اے دلھن!" نیچے صحن میں کھڑی ہوئی بڑی چچی اماں کو آواز دے رہی تھیں۔ ساتھ ہی شکیل اور چھمی کی تو تو میں میں کرنے کی آوازیں آرہی تھیں۔

"آئی ہوں! اللہ کس مصیبت میں پھنس گئے" اماں بڑبڑائیں۔ "ہم اس سے زیادہ روپے نہیں منگائیں گے۔ تمہارے بڑے چچا کا فرض ہے کہ وہ ہماری ہر ضرورت کو پورا کریں، آخر تو ان کے بھائی کا قصور ہے۔ ہم خود سے تو ان کے گھر آکر نہیں بیٹھ گئے۔" اماں جواب سُنے بغیر نیچے چلی گئیں۔

تیسرا پہر تھا۔ دھوپ لوٹ چکی تھی۔ وہ بڑی دیر تک اپنے بستر پر اوندھی پڑی رہی۔ گلی میں کھلونے والا جھن جھنا بجاتا اور سُریلی آواز میں صدا لگاتا جا رہا تھا: "یہ ربڑ والا بوا یہ مستانہ بوا" چھمی لڑنے بھڑنے کے بعد اب گھِسی ہوئی سوئیوں سے گراموفون ریکارڈ بجا رہی تھی۔ اس نے سوچا کہ اس طرح تو سارے ریکارڈ خراب ہو جائیں گے وہ شکیل سے کہہ کر چھمی کے لیے سوئیوں کی ایک ڈبیہ ضرور منگا دے گی۔

دھوپ پیلی پڑ چکی تھی۔ کریمن بوا چائے بننے کا شور مچا رہی تھیں مگر اس کا جی نہ چاہا کہ نیچے وہ کھلی چھت پر آکر اس کھرّے پلنگ پر لیٹ گئی جو سارا دن دھوپ میں پڑا تھا

رہا تھا۔ آس پاس کی چھتوں پر بچوں کا شور و غل بڑھتا جا رہا تھا اور مکانوں سے اُٹھتے ہوئے دھوئیں کی وجہ سے فضا سُرمئی ہو رہی تھی۔

پلنگ اب تک ہلکا سا گرم تھا۔ وہ اُٹھ کر ٹہلنے لگی۔ کیسا گھبرا گھبرا سا جی ہو رہا تھا۔ اس وقت تو بس دل چاہ رہا تھا کہ گھر سے نکل کر کہیں ہو آئے مگر کہاں، وہ تو جب سے آئی تھی اس گھر سے باہر قدم نہ نکالا تھا۔ تہمی کا جب جی چاہتا برقع اوڑھ کر گھروں گھروں پھر آتی وہ بھی صرف مسلمان گھروں میں، ہندوؤں سے اُسے للّٰہی بغض تھا۔ اس گھر میں تو اس کی دُنیا صرف کتابیں رہ گئی تھیں۔ بڑے چچا کی کتابوں کی الماری کی چابی اُس نے سنبھال کر اپنے بستر میں چھپا دی تھی۔

کریمن بوا چائے پینے کے لیے پکار رہی تھیں، وہ مجبوراً نیچے جا رہی تھی کہ تہمی اس کی چائے کی پیالی لے آئی۔ اس وقت تہمی کا گول گول چہرہ بے وقوفی کی حد تک سنجیدہ ہو رہا تھا اور آنکھیں ہلکی سی سُرخ پڑی ہوئی تھیں۔

"کیا بات ہے تہمی؟" پیالی لیتے ہوئے اس نے پوچھا۔

"کچھ نہیں۔ ابا میاں کا خط آیا ہے۔"

"پھر سب خیریت ہے نا؟" وہ تہمی کی سنجیدگی سے ڈر رہی تھی۔

"نہیں بجیا، اُنھوں نے لکھا ہے کہ اب تم کو صرف دس روپیہ مہینہ ملا کرے گا۔ کیونکہ تمھارا ایک بھائی اور پیدا ہو گیا ہے اس کا خرچ بھی بڑھا ہے۔ اُنھوں نے پورے پانچ روپیہ کم کر دیے ہیں۔"

"ارے یہ بات ہے، بھائی مبارک ہو تہمی۔"

"میرا بھائی کیوں ہونے لگا، اللہ کرے مر جائے وہ۔ میری اماں کے ساتھ میرے سارے بہن بھائی مر گئے ہیں۔ اکیلی ہوں، میرا کوئی نہیں۔" اس نے ہونٹ لٹکا لیے۔

"ایسی باتیں نہ کرو تہمی۔"

"پھر آپ ہی بتائیے نا، کہ ہمارے ابا جتنی شادیاں کریں اور اُن سے جتنے بچے ہوں وہ

سب میرے بھائی بہن ہوں گے؟" اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے، اُس وقت وہ کتنی معصوم نظر آرہی تھی۔ اس کے چہرے کی ساخت ہی کچھ ایسی تھی کہ وہ لڑتے جھگڑتے اور غصے سے پاگل ہوتے وقت بھی معصوم ہی نظر آتی۔

عالیہ نے چھمی کو لپٹا لیا، اُس وقت منجھلے چچا اُسے دنیا کے عظیم بے درد نظر آرہے تھے انھوں نے دُنیا میں بیویاں بدلنے کے سوا کوئی کام نہ کیا۔ چھمی کی ماں کے انتقال کے بعد انھوں نے دنیا میں دو شادیاں کیں اور دونوں کو ذرا ذرا سی بات پر طلاق دے دی۔ ان کا طلاق دینے کا بھی عجیب طریقہ تھا بیٹھک میں جا کر طلاق لکھتے اور بیوی کو اندر بھجوا دیتے۔ بس اسی وقت سے بیوی سے پردہ کرنے لگتے مگر چوتھی بیوی نے ان پر مصیبتوں کا پہاڑ توڑ دیا تھا۔ تابڑ توڑ بچے پیدا کر کے انھیں ایسا جکڑا کہ دنیا کا نہ رکھا۔ اور چھمی سب کے لیے آزار بنی ہوئی تھی۔ باپ نے محبت سے ہاتھ کھینچ کر اُسے دکھوں کا پوٹ بنا دیا تھا۔

"میں تو بالکل اکیلی ہوں بجیا، آپ کو تو سب چاہتے ہیں، جمیل بھیا بھی آپ کو بہت چاہتے ہیں باہر سے آ کر آپ ہی کے ارد گرد پھرتے ہیں" وہ طنز سے ہنسی۔

عالیہ نے کانپ کر چھمی کو دیکھا، اس کے سامنے مہندی کا لہلہاتا ہوا پودا سوکھ کر سیاہ پڑ گیا تھا اور پھر کسم دیدی کی سفید ساری سے بوندیں پانی کی ٹپک کر زمین میں جذب ہو گئیں۔

"لاحول ولا، وہ اتنی بدھو نہیں ہے۔ اس کے ساتھ یہ کچھ نہیں ہو سکتا۔ وہ بے وقوف آدمی! جسے بڑے چچا اپنی کتابوں کی الماری کی چابی تک نہیں دیتے۔"

"چھمی تم تو بالکل بچہ ہو بس، تم مجھے سمجھتی کیا ہو؛ ایسے ایسے دس جمیل بھیا آ جائیں تو میرا کیا بگاڑ لیں گے۔"

چھمی نے عالیہ کی آنکھوں میں غور سے جھانکا، جیسے وہ سچ کی تلاش میں ہو، پھر کچھ مطمئن سی ہو کر عالیہ سے لپٹ گئی۔ "میں خود یہی سمجھتی ہوں کہ ہماری بجیا ایسی تھوڑی ہو سکتی ہیں" وہ بڑے فخر

سے ہنسی۔ "پر بجیا آپ تو یہ بتائیں کہ اب اتنے روپوں میں گزارہ کیسے ہوگا؟"

"مجھے تو کوئی دس روپیہ بھی بھیجنے والا نہیں چھمی" اسے ابا یاد آ گئے۔

"وا! میرے دس روپیہ جو ہوں گے وہ آپ کے نہیں ہوں گے بجیا؟" چھمی نے دکھ کر پیالی اٹھائی

"بس یہ ٹھیک ہے۔ میں تم کو اس میں سے ایک پیسہ دوں گی۔" عالیہ نے اُسے خوش کرنے کو کہا۔

"ارے بجیا ہاں وہ کل ہمارے کمرے میں جلسہ ہوگا۔" چھمی جیسے سب کچھ بھول کر چونکی۔

"کیسا جلسہ؟" عالیہ نے اسے حیرت سے دیکھا۔

"ارے مسلم لیگ کا جلسہ، بجیا۔"

"پر بڑے چچا جو ناراض ہوں گے، تم دل سے رہو نا مسلم لیگی۔" عالیہ نے اسے سمجھانا چاہا

وہ کون ہوتے ہیں ناراض ہونے والے، میں کیا انھیں منع کرتی ہوں کہ کافروں کے جلسوں میں

نہ جایا کریں۔"

"مگر تمہارے مسلم لیگی ہونے سے کیا فائدہ ہوگا؟" عالیہ کو دکھ ہو رہا تھا کہ یہاں تو سب بات گل میں

"کچھ نہیں ہوتا بس میں مسلمان ہوں اس لیے مسلم لیگی ہوں۔" وہ بڑے فخر سے ہنسی "وہ بڑا شے

بٹیں گے بجیا، ٹھیک رہیں گے نا؟"

"تھیمی اتنے سے روپے آئے ہیں اور تم کو پورا مہینہ گزارنا ہے، کیوں خواہ مخواہ یہ

حرکتیں کرتی ہو۔" عالیہ نے اسے پھر سمجھانا چاہا۔

"واہ پیسے روپے کی کیا بات ہے، میں تو اپنی جان تک نچھاور کر دوں مسلم لیگ پر۔ پھر

ہماوے کافر چچا کو پتہ چلے۔" وہ جیسے کچھ یاد کر کے تیزی سے سیڑھیاں پھلانگتی نیچے چلی گئی۔

"اری چھمی کیوں اپنی جان کی لاگو ہو رہی ہو" نیچے سے بڑی چچی کی آواز آ رہی تھی۔

عالیہ چھت سے ہٹ کر بڑے کمرے کی کھڑکی کے پاس کھڑی ہو گئی جس سے نچلی منزل کا صحن

نظر آتا تھا۔

"واقعی بڑی بے تکی لڑکی ہے۔ ہم نے یہ نیا طریقہ دیکھا کہ عورتیں بھی جلسے جلوس کریں، مردوں نے کیا کم گھروں کا ستیاناس کر رکھا ہے" اماں صحن میں بچھے ہوئے پلنگ پر بیٹھی چھالیہ کاٹ رہی تھیں

"ہمارا جو جی چاہتا ہے کرتے ہیں" چھمی نے اپنے مخصوص لہجے میں کہا اور پیر پٹختا ہوا بڑبڑ اندر گھس کر چلی گئی۔

"میں کیا کروں، اگر آپ کے بڑے چچا اس پر ناراض ہوتے ہیں۔ تو بھی میرا ہی جی دکھتا ہے۔"

بڑی چچی بھی اماں کے پاس ٹک گئیں۔ دادی کے زور سے کھانسنے کی آواز آئی تو کریمن بوا جلدی سے اُدھر چلی گئیں۔

(۱۸)

شام کو چھمی کے کمرے میں جگہ جگہ سے پھٹی ہوئی لمبی سی دری بچھ گئی اور اس پر سارے محلے کے بچے آ آ کر بیٹھنے لگے۔ صحن کے ایک کونے میں دادی کا بستر لگا ہوا تھا۔ ان کے پلنگ کے آس پاس کریمن بوا نے پانی چھڑک دیا تھا۔ وہ ننھی ننھی سی پنکھیا ہاتھ میں لیے ہوئے ہولے ہولے ہلا رہی تھیں اور بڑی عبرت ناک خاموشی کے ساتھ چھمی اور بچوں کا شور سن رہی تھیں۔ ان کے چہرے سے کرب کے آثار ظاہر ہو رہے تھے۔ عالیہ ان کے سرہانے بیٹھ گئی اور ان کے ہاتھ سے پنکھیا لے کر جھلنے لگی۔

"چلیے نا بجیا آپ بھی میرے جلسے میں" چھمی نے عالیہ کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا۔

"میں نہیں جاؤں گی چھمی، مجھے یہ باتیں ذرا نہیں اچھی لگتیں"

"مت جائیے، آپ کے بغیر جلسہ تھوڑی ختم ہو جائے گا" وہ روٹھ گئی "مجھے پتہ ہے نا کہ آپ بڑے چچا کا ساتھ دیں گی"

"تم کو معلوم ہے تو ٹھیک ہے۔ عالیہ ایسی بے ہودہ باتوں میں نہیں جاتی" اماں

نے بھی جھمی کو گھُرکا، مگر جھمی نے کوئی جواب نہ دیا۔ اُس کا مُنہ اُتر گیا تھا۔ وہ جلدی سے کمرے میں چلی گئی اور بچوں سے نعرے لگوانے لگی۔

"ہائے اب کیا کروں دُلھن، اُس کے بڑے چچا میاں بھی ہیں۔ وہ یہ نعرے سُنیں گے تو کیا ہوگا۔ دس بار کہا کہ جب جلسہ کرو تو میلاد پڑھا کرو، مگر نہیں سُنتی" بڑی چچی جھمی کے جلسے سے بہت پریشان نظر آ رہی تھیں۔ "ارے اس کے بابا کو بھی تو کہاں جو اس کے دو بول پڑھا کر ٹھکانے لگا دیں۔"

"جسے شوق ہو وہ خود اپنے دو بول پڑھوا لے۔" جھمی نے کمرے کی دہلیز پر آ کر جواب دیا۔ اور پھر مصروف ہو گئی۔

"ارے شکیل اُٹھ کر بیٹھک کا دروازہ بند کر دے۔ تاکہ آواز نہ جائے۔" بڑی چچی جھمی کی بات کا بُرا ماننے کے بجائے اس کی حفاظت کے سامان کر رہی تھیں۔

"میں کیوں بند کروں، اچھا ہو ابا ایک دن اس کی ہڈیاں توڑ دیں۔" شکیل اپنے بستے میں پیوند لگاتے ہوئے بڑے مزے میں اُچکا۔

"بکواس کرتا ہے، کتنی بڑی ہو گئی ہے تجھ سے بہن۔" بڑی چچی نے غصّے سے اس کی طرف دیکھا اور کم بخت نے کشتی میں چائے کے برتن رکھتے ہوئے اُٹھ پڑیں۔ بیٹھک کے دروازے بند کر کے وہ پھر برتن لگانے لگیں۔ نعرے لگانے کے بعد سارے بچے جھمی کے ساتھ گا رہے تھے

کاشی میں تُلسی تو بوئی بکریاں سب چر گئیں

گاندھی جی اتم کرو ہندو کی نانی مر گئیں

جھمی کے اس خود ساختہ گیت کو سُن کر عالیہ ہنس پڑی۔ مگر جیسے ہی اس نے دیکھا کہ بڑے چچا بیٹھک کے دروازے کے پاس کھڑے ہیں تو گھبرا کر جھمی کو پکارنے لگی۔

جھمی نے مڑ کر دیکھا اور پھر آرام سے بچوں میں بتاشے بانٹنے لگی۔

"ارے اس پاگل، جاہل کو کوئی نہیں سمجھاتا۔ میں ایک دن اس کی ہڈیاں توڑ دوں گا۔" بڑے چچا صحن میں آکر کھڑے ہوگئے۔ غصّے سے ان کا مُنھ سُرخ ہو رہا تھا۔

بچے جھرا مار کر بھاگ پڑے۔ ایک بچّے کے بتاشے گر کر ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے تھے اور وہ بڑے چچا کی طرف سہمی ہوئی نظروں سے دیکھ دیکھ کر اُنھیں چُن رہا تھا۔

"آپ تو بہت قابل ہیں نا، مجھے بہت پڑھایا لکھایا ہی جو جہالت کے طعنے دیتے ہیں۔" جیمی بھلا کیوں چُپ رہتی۔

بڑے چچا اس کی طرف لپکے تو بڑی چچی بیچ میں آگئیں۔ "ہے کیا دیوانے ہو گئے ہو، جوان لڑکی پر ہاتھ اُٹھاؤ گے؟" بڑی چچی ہانپنے لگیں۔

"ابھی مار لینے دیجیے، دل کی حسرت تو نکل جائے۔" جیمی ڈٹ کر کھڑی ہوگئی۔

عالیہ اس کا ہاتھ پکڑ کر کمرے میں لے جانا چاہتی تھی، مگر وہ اسے بھی دھکے مار رہی تھی۔ کریمن بوا دم بخود کھڑی تھیں۔ کچھ کہنے کی کوشش میں دادی کی سانس پھنس گئی تھی اور اماں تماشائیوں کی طرح پلنگ پر بیٹھی سب کچھ دیکھ رہی تھیں۔

"جیمی اندر چلو میری بہن، میرا کہنا مانو نہیں مانتیں؟" عالیہ نے منت کی تو جیمی اُسے عجیب سی نظروں سے دیکھتی اپنے کمرے میں چلی گئی۔

"میں کیا کروں، مجھے کس قدر عاجز کیا ہی سب نے عالیہ بیٹی تم ہی ان لوگوں کو سمجھایا کرو۔" بڑے چچا کا غصہ رفو چکر ہو چکا تھا۔ اور وہ بڑی بے چارگی سے عالیہ کو دیکھ کر اپنی بے بسی کی داد چاہ رہے تھے۔ چند منٹ بعد وہ سر جھکائے بیٹھک میں چلے گئے اور ذرا دیر کو سنّاٹا چھا گیا۔

"ہائے اپنے زمانے میں کاہے کو یہ سب کچھ دیکھا ہوگا۔" کریمن بوا سیڑھی پر بیٹھ کر اپنے آپ سے کہہ رہی تھیں۔ "یہ مالک مظفر مرحوم کا خاندان ہی۔ انھیں تو قبر میں بھی چین

نہ ملتا ہوگا مالک۔"

رات کا اندھیرا پڑنے لگا تو کریمن بوا نے لالٹین جلا کر ہر طرف رکھ دیں اور صحن میں بچھے ہوئے کھرّے پلنگوں پر بستر لگا دیے۔ چھمی کے کمرے سے اس کی دھیمی دھیمی سسکیوں کی آواز آرہی تھی۔

"چھمی کا کیا بنے گا؟" دادی نے عالیہ کی طرف دیکھ کر دھیرے سے پوچھا۔ اب ان کی سانس قابو میں آچکی تھی۔ "محبت نے دم اٹکا رکھا ہے۔"

عالیہ سے کچھ بھی نہ کہا گیا۔ اس نے دادی کا ہاتھ تھام لیا۔ اس زندگی کے ساتھ کتنے بکھیڑے ہوتے ہیں۔ چھمی دادی کو کچھ بھی نہ سمجھتی تھی مگر وہ بستر پر پڑے پڑے اس کا سہارا بنی ہوئی تھیں۔

"کیا ہوا ہے عالیہ بیگم؟" جمیل بھیا نے گھر میں داخل ہوتے ہی سوال کیا اور پھر لمبی زنگ آلود کرسی پر بیٹھ گئے۔ "اس وقت بڑا سناٹا چھایا ہے۔"

جمیل بھیا جب اسے عالیہ بیگم کہتے تو اسے ایسا محسوس ہوتا کہ وہ زہر اگل رہے ہیں۔ وہ چپ رہی۔

"مسلم لیگ کا جلسہ تھا یہاں بڑے بھیا نے ڈانٹا تو بس اتنی سی بات۔" اماں نے بڑے فسادی انداز میں کہا۔

"خوب! خوب!" وہ زور سے ہنسے "پھر ہمارے ابا کی رگِ حمیت پھڑک اٹھی ہوگی۔ واہ کیا عظیم آدمی ہیں ہمارے ابا بھی، یہ گھران کی عظمت کا مثالی نمونہ ہے۔ برسوں سے کانگرس کی غلامی کر رہے ہیں اور مجھے ایک نوکری نہ دلا سکے حالانکہ اب کانگرس کی وزارت بھی بن گئی ہے۔" جمیل بھیا پھر ہنسے۔

"ہاں اب تم آگ لگاؤ، ذرا پاس لحاظ نہیں باپ کا۔" بڑی چچی بھڑک گئیں۔۔۔"

"کانگریس کی خدمت کرتے ہیں تو کسی لالچ سے تھوڑی کرتے ہیں۔"

"اماں آپ کیا جانیں، ارے مجھے سخت بھوک لگی ہے۔ اگر ابا کے مہمانوں سے کچھ بچا ہو تو مجھے بھی کھلا دیجئے۔" جمیل بھیا لڑنے پر تُل گئے۔

"بس ہر دم بکواس کرتا ہے کہیں اور سے کھا کھا کر اتنا بڑا ہو گیا ہے۔ یہاں تو بھوکا مرتا ہے نا۔" بڑی چچی چیخ پڑیں۔

"بھئی اماں تو خواہ مخواہ ناراض ہوتی ہیں،" جمیل بھیا ہنس پڑے۔ "اچھا تم ہی بتاؤ عالیہ بیگم کہ ہمارے ابا یہاں جس دنیا کو بنانے کی فکر میں ہیں، کیا ہم اس کے باشندے نہیں ہیں۔ آخر ہمیں کیوں تباہ کیا جائے؟ اور مظہر چچا جو ایک انگریز کا سر پھاڑ کر جیل چلے گئے تو انھوں نے کون سا کارنامہ انجام دیا۔؟ کیا انھوں نے تم سب کو تباہ نہیں کیا؟ اب تم کو اس گھر میں کتنی تکلیف ہوگی، تم لوگوں نے کتنے ٹھاٹ کی زندگی گزاری تھی، ابھی تو میں بھی کسی لائق نہیں ورنہ"— وہ ایک لمحہ کو رک کر عالیہ کو دیکھنے لگے۔

"آپ ایسی باتیں نہ کیجئے جمیل بھیا۔ دادی کہیں سوتے میں بھی نہ سن لیں۔" وہ جلدی سے جمیل بھیا کے پاس آکر آہستہ سے بولی۔

"جانے بھابی کس طرح یہ سب کچھ برداشت کرتی ہیں۔ میں تو ان سے لڑ لڑ کر تھک گئی تھی بھلا کیا مانا انھیں انگریز دشمنی ہی۔؟" اماں نے ٹھنڈی آہ بھر کر پان کی گلوری منھ میں رکھ لی۔

"کیا تم میرے ساتھ کھانا نہ کھاؤ گی، عالیہ بیگم؟" جمیل بھیا نے کریمن بوا کے ہاتھ سے کشتی لیتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں بھئی، ابھی مجھے بھوک نہیں لگی۔"

وہ اٹھ کر چھمی کے کمرے میں چلی گئی۔ وہ اب تک اپنے بستر پر اوندھی پڑی سسک رہی تھی

"چلو باہر چلیں چھمی، اندر تو بڑی گرمی ہے۔" عالیہ نے اسے زبردستی اٹھایا، پھر

چل کر ٹہلیں گے۔"

عظمیٰ کمرے سے نکل آئی مگر جمیل بھیا کو دیکھ کر وہیں بیٹھ گئی "آپ جائیے ٹہلیے۔"

نیچے کے گھٹے ہوئے ماحول سے اوپر کی کھلی فضا میں آکر اسے بڑا سکون محسوس ہوا۔ گرمیوں کی ضیا میں ڈوبی ہوئی چاندنی میں بھی بڑی میٹھی سی خنکی تھی گلی میں بچے بڑے جوش و خروش سے ریل ریل کھیل رہے تھے۔ زیادہ خوش ہوتے تو "مسلم لیگ زندہ باد" اور "کانگرس زندہ باد" کے دو چار نعرے بھی لگا دیتے۔ جب وہ سیٹی بجاتے اور چھک چھک کرتے اور چلے جاتے تو ایکدم سناٹا چھا جاتا۔ چھت کی منڈیر کے پاس کھڑے ہو کر اس نے دیکھا کہ ہائی اسکول کی عمارت درختوں کے گھنے سائے کی وجہ سے اندھیرے میں ڈوبی ہوئی تھی۔

وہ دیر تک اس عمارت کو خالی خالی نظروں سے دیکھتی رہی۔ ایک دن تحسین اسی اسکول میں پڑھے گا اسے اپنے خواب کی تعبیر ضرور ملے گی مگر اس کے سارے خواب اڑ ادھم ہو گئے۔ اب وہ کسی کالج میں نہ پڑھ سکے گی۔ پھر بھی اسے پڑھنا ہے۔ اپنے پیروں پر کھڑا ہونا ہے۔ ابا کب آئیں گے یہ کوئی نہیں جانتا تھا۔ بڑے چچا اسے کتنے مایوس نظر آتے۔ جب وہ ابا کے مقدمے کے سلسلے میں بات کرتی ہے تو وہ ادھر ادھر کی باتیں چھیڑ دیتے۔

سوچتے سوچتے جب عالیہ نے آسمان کی طرف دیکھا تو چاند اسے بڑا مٹیالا معلوم ہوا۔

"عالیہ"

اس نے چونک کر دیکھا تو جمیل بھیا اس کے پیچھے کھڑے تھے۔ "یہاں اکیلے کیا کر رہی ہو؟"

"کچھ نہیں بھیا"۔ تنہائی میں بھیا کے وجود سے وہ گھبرا گئی۔ بھیا ادھر ادھر دیکھ رہے تھے۔

"یہاں گھبراتی ہو گی عالیہ، اگر تہمینہ زندہ ہوتی تو شاید تم خوش رہتیں اور شاید ہماری شادی بھی ہو چکی ہوتی۔ یقین جانو کہ یہ شادی میری انتہائی مخالفت کے باوجود ہو رہی تھی۔ پھر بھی جب وہ مری ہے تو ایک بار مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میں رنڈوا ہو گیا ہوں۔" جمیل بھیا نے

جیسے دکھ سے آنکھیں بند کرلیں ۔

"مگر آپ ان باتوں کا ذکر کیوں کر رہی ہیں ۔؟"

ویسے ہی ۔ مجھے اس سے ہمدردی تھی نا۔ مجھے سب کچھ معلوم تھا نا، اور مجھے تو یہ بھی یقین ہے کہ وہ اپنی موت نہیں مری۔" جمیل بھیا نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔

"اب تو آپ کے گھر میں ہوں، جو چاہے کہئے " میں نے منہ پھیر لیا۔ مگر جمیل بھیا پھر اس کے سامنے آگئے۔ "سنو تو عالیہ، میں اتنا برا تو نہیں ہوں۔ بات یہ ہے کہ صفدر کا میرے پاس خط آیا تھا۔ اس نے التجا کی تھی کہ تہمینہ سے شادی نہ کرو۔ مجھے اس سے محبت ہے۔ پھر بھی میں اس شادی کو گوارا نہ کر سکا۔ آج تک اپنے کو مجرم سمجھتا ہوں۔ اگر میرا بس چلتا تو صفدر اور تہمینہ کی شادی کرا کے دم لیتا۔ مگر " وہ ایک لمحے کو چپ ہو گئے۔ "تم تو مجھے مجرم نہیں سمجھتیں نا؟"

"ارے یہ تو سب کچھ جانتے ہیں۔" اس نے حیران ہو کر جمیل بھیا کی طرف دیکھا اور پھر نظریں جھکا لیں۔ آپا کا راز فاش دیکھ کر اسے جمیل بھیا کی صورت سے نفرت ہونے لگی، ساری باتیں تیر کی طرح اس کے سینے میں چھید کر رہ گئی تھیں۔

"اگر میں چاہوں تو ابھی اپنے ماموں کے گھر جا سکتی ہوں ۔" ماموں کی حقیقت جانتے ہوئے بھی وہ اور کس کا نام لے کر دھمکاتی۔

"تم جا ہی نہیں سکتیں، مجھے تم سے محبت ہے، پھر میں کیا کروں گا۔" جمیل بھیا کا پسیجا ہوا ٹھنڈا ہاتھ اس کے ہاتھ کو دبوچنے لگا۔ اور اسے محسوس ہوا کہ وہ چھت میں دھنس رہی ہے، مارے کمزوری کے وہ اپنے کو بچا بھی نہیں سکتی۔ اس نے بڑی بے بسی سے جمیل بھیا کے ٹھنڈے ہاتھ کی طرف دیکھا تو ایک دم اسے وہ مینڈک یاد آگیا جو برسات کے دنوں میں اس کے ہاتھ پر کود گیا تھا۔ اس نے ڈر کر آنکھیں بند کر لیں۔ اور اس کے منہ سے چیخ نکل گئی۔ پھر جانے اسے کیا ہوا کہ وہ چیختی ہی چلی گئی۔

جب اُس نے آنکھ کھولی تو سب لوگ اس کے پاس جمع تھے۔ اماں رو رہی تھیں۔ اور بڑے چچا کوئی معجون چٹا رہے تھے۔ مگر جمیل بھیا وہاں نظر نہ آئے۔

"آس پاس کمبخت ہندوؤں کے مکان ہیں کوئی بھوت دکھائی دے گیا ہوگا۔" چھمی نے اس کے آنکھ کھولتے ہی اظہار خیال کیا۔ اور اماں بیتاب ہو ہو کر اس کے ہاتھ چومنے لگیں۔

"پھر وہی جہالت کی باتیں، کسی خیال سے ڈر گئی ہوگی، ذہنی بیماری ہے۔ تم یہ معجون روز کھانا، دماغ مضبوط ہو جائے گا بیٹی۔" بڑے چچا چھمی کو ٹھیکا کر عالیہ کو نصیحت کرنے لگے تھے، اس لیے اُنھوں نے دیکھا بھی نہیں کہ چھمی اپنی جہالت کا بدلہ لینے کے لیے کس قدر بے چین تھی مگر جانے کیا سوچ کر چپ ہو رہی تھی۔

"آخر ہوا کیا تھا عالیہ؟" بڑی چچی نے پوچھا تو اس نے گھبرا کر اس طرح آنکھیں بند کر لیں۔ جیسے سونا چاہتی ہو۔ اب بھلا وہ سب کو کیا بتاتی۔؟

(۱۹)

ابا کا مقدمہ ختم ہو گیا تھا۔ اقدام قتل کے سلسلے میں سات سال کی قید کا حکم سُنا دیا گیا تھا۔

دوپہر ڈھل چکی تھی، ہلکی سی بوندا باندی کے بعد اب آسمان بالکل صاف ہو گیا تھا۔ جب بڑے چچا نڈھال سے گھر میں داخل ہوئے تو جیسے وہ بات کرنے کی طاقت کہیں باہر ہی چھوڑ آئے تھے۔ اماں ان کی کمر سے لپٹ گئیں۔ "بڑے بھیا مجھے اچھی خبر سُنانا۔" اماں مُنھ اٹھائے انھیں بڑی اُمید و بیم سے تک رہی تھیں۔ بڑے چچا صحن میں بچھی ہوئی چوکی پر آہستہ سے بیٹھ گئے تو عالیہ نے لوٹے میں پانی بھر کر اُن کے پاس رکھ دیا۔ کیسی دھول اُڑ رہی تھی۔ بڑے چچا کے مُنھ پر۔۔"

بڑے چچا کٹھ پتلیوں کی طرح مُنھ پر پانی کے چھینٹے دینے لگے۔ وہ سب سے نظریں بچا رہے تھے۔ امّاں کا صبر جواب دے گیا۔ بُری خبر تو بڑے چچا کی آنکھوں سے جھانک رہی تھی۔ اماں اُن کا مُنھ تکتے تکتے دھاڑ کر رو دیں تو بڑی چچی اور کریمن بُوا نے جلدی سے انھیں سنبھال لیا۔ "اماں بی کے کمرے کے دروازے بند کر دو کہیں وہ رونے کی آواز نہ سُن لیں۔" بڑے چچا نے عالیہ کی طرف دیکھ کر کہا اور پھر اماں سے مخاطب ہو گئے۔ "مظہر کی دلھن، صبر سے کام لو۔ یہ سات سال بھی گزر جائیں گے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ مظہر ایک سال بھی جیل میں نہ رہے کیا پتہ ہم آزاد ہو جائیں۔"

"سب بے کار باتیں ہیں بڑے بھیّا، انھوں نے بھرا گھر اُجاڑ دیا۔ اب سات سال کون گزارے گا، ہائے سات سال نہیں گزرتے۔" اماں بلک بلک کر رو رہی تھیں۔ "ارے حاکموں نے نہیں دیکھا اس گھر کا زمانہ، انھیں پتہ ہی نہیں یہ کس کا بیٹا ہے، اپنے مالک مرحوم تو لوگوں کو پھانسی کے تختے سے اُتروا لیتے تھے، حاکم ان کی ڈالیوں پر جیتے تھے، پر اب زمانہ بگڑ گیا۔ گزرا زمانہ یاد کر کے کریمن بوا کا مُنھ سُرخ ہو رہا تھا اور وہ روتی ہوئی اماں کو لپٹائے کمرے میں لے جانے کی کوشش کر رہی تھیں۔

"ہم اجڑ گئے، تباہ ہو گئے۔ انھیں مجھ سے کون سی دشمنی تھی۔ جو یہ سب کر دیا۔" اماں بے قابو ہو کر اپنے کو چھڑا رہی تھیں۔

جب اماں کو زبردستی کمرے میں لے جایا گیا تو وہ صحن میں تنہا کھڑی رہ گئی۔ اماں کی گریہ زاری نے کسی کو بھی اس کی طرف متوجہ نہ کیا، کسی نے بھی نہ دیکھا کہ اس کے دل پر کیا گزری۔ ایک بار تو اسے ایسا محسوس ہوا کہ اس کے پیروں تلے کنواں کھُد گیا ہے وہ دھیرے دھیرے گزر رہی ہے جانے کس طرح اُس نے آگے بڑھ کر لوہے کی کرسی تھام لی۔ صحن میں کیسا سناٹا چھایا ہوا تھا۔

چند لمحوں بعد سیڑھیوں کو طے کر کے وہ اپنے کمرے میں چلی گئی اور پھر اپنے بستر پر گر کر ایک

دم سِسکنے لگی۔

اچھی طرح رو چکنے کے بعد جب اس کا دل ٹھکانے آیا تو وہ بالکل خالی الذہن ہو رہی تھی اس نے یوں ہی اپنے کورس کی کتابیں اٹھا کر پھر سے رکھ دیں۔ پانچ بجے ماسٹر پڑھانے کے لیے آتا تھا اس نے کتابوں پر تکیہ رکھ دیا جیسے آج تو وہ ان کتابوں کی صورت سے بھی بیزار ہو۔ آج کون سی تاریخ ہے۔ اس نے اپنی یاد کو کریدا۔ آج رات سزا کا ایک دن گزر جائے گا۔ شام تو ہونے والی ہے۔ اس نے بڑی امید سے اس ایک دن کو آگے ڈھکیل دیا۔

سیڑھیوں پر کسی کے قدموں کی چاپ ہو رہی تھی۔ اس نے دیکھا کہ بڑے چچا اس کی طرف بڑھ رہے ہیں وہ اپنے بستر پر بیٹھ گئی۔ اس نے بڑے صبر سے ان کا اُترا ہوا چہرہ دیکھا لیکن جب بڑے چچا نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے سر پر ہاتھ پھیرا۔ تو وہ کانپ کر رہ گئی۔ آنسوؤں کے پردے کے اس پار سب کچھ دھندلا کر رہ گیا۔

"تمھیں اپنی ماں کو سنبھالنا ہے بیٹی، تم ہمت سے کام لو۔ مجھے امید ہے کہ جیل کی دیواریں اُسے زیادہ دن نہ روک سکیں گی، ٹھیک ہے نا؟" بڑے چچا نے لمبی سانس بھری کیا یقین تھا چچا کی آنکھوں میں کہ وہ سر جھکانے پر مجبور ہو گئی۔

بڑے چچا چلے گئے تو وہ آنسو پونچھ کر جیسے بڑے سکون سے لیٹ گئی۔

شام ہو رہی تھی، گلی میں موتیے کے ہار بیچنے والے صدا لگاتے گزر رہے تھے۔ کمرے میں ہلکا سا اندھیرا چھا رہا تھا لیکن عالیہ منہ چھپائے بستر پر پڑی رہی۔ بڑی چچی، جمیلہ، کریمن بوا سبھی تو باری باری اس کے پاس آئے اُسے نیچے لے جانے کی ضدیں کیں مگر وہ کیسے جاتی، بھلا وہ اپنی اماں کو کس طرح دیکھتی۔ اماں جو ایک سال سے اس گھر میں مسافروں کی طرح بیٹھی تھیں، اب ابا ہی نے ان کا سفر ختم کر دیا تھا۔ بندھا ہوا سامان کھل گیا۔

گلی میں بجلی کا بلب روشن ہو گیا تھا۔ وہ کمرے سے نکل کر چھت پر آگئی۔ آج تو اُسے

اندھیرا بڑا اچھا لگ رہا تھا۔ پھر اندھیری رات میں تارے کتنے روشن ہو رہے تھے۔ جیسے دُکھ کے اندھیرے میں غم دہک رہے ہوں۔ قریب قریب کی چھتوں سے شور کی آواز آ رہی تھی۔ بچے لڑ جھگڑ رہے تھے۔ گراموفون ریکارڈ بج رہے تھے۔ کوئی آواز بھجن گا رہی تھی ـــــ "میرا کے پربھو، گردھر ناگر ـــــ"

"عالیہ، میں تم سے بات کر سکتا ہوں، تم بگڑو گی تو نہیں؟" جمیل بھیا جانے کب بلیوں کی چال چل کر اس کے سر پر آکھڑے ہوئے تھے۔ وہ اس وقت سخت بوکھلائے ہوئے لگ رہے تھے۔ اظہار محبت کے تلخ نتیجے کے بعد آج وہ اس سے بات کر رہے تھے ورنہ کئی مہینے گزر گئے انھوں نے اس سے بات نہ کی تھی۔ وہ گھر میں بھی کم ہی آتے، چُپ چُپ رہتے۔ بڑی چچی اپنے بیٹے کو یوں دیکھ کر فکر مند رہتیں ان کا خیال تھا کہ اچھی سی ملازمت نہ ملنے کی وجہ سے یہ حالت ہو۔ چند نالائق لڑکوں کی ٹیوشنوں پر ان کا گزارا ہو رہا تھا۔

عالیہ اپنے حال میں مگن سی بیٹھی رہی۔

"کیا تم کو مجھ سے اتنی نفرت ہے کہ جواب تک نہ دو گی؟" انھوں نے جیسے بے اختیاری میں اپنا ہاتھ اس کی طرف بڑھایا اور پھر جھجک کر کھینچ لیا۔ شاید انھیں پہلا قصہ یاد آگیا تھا۔ "منجھلے چچا سے ملنے جیل نہ چلو گی۔۔؟"

"میں ابا کو جیل میں نہیں دیکھ سکتی، بھلا میں انھیں مجرم کی حیثیت سے دیکھوں گی؟" وہ دھیرے سے بولی۔

"واہ وہ مجرم کب ہیں، انگریز حکمران کو مارنا جرم کہاں ہوتا ہے"

"ہوں!" اس نے جیسے چونک کر جمیل بھیا کی طرف دیکھا وہ تو اسے اس اندھیرے میں بھی بڑے پرکشش اور سنجیدہ نظر آ رہے تھے۔ وہ کچھ نہ بولی۔ بھیگی بھیگی ہوا کے ہلکے ہلکے جھونکے آ رہے تھے اور اب پھر بادلوں کے چند ٹکڑے ادھر اُدھر تیرتے پھر رہے تھے۔

"نیچے جاؤ بھی، سب کے ساتھ بیٹھ کر جی بہل جائے گا" جمیل بھیا نے اس طرح کہا۔ جیسے جی بہلنے کی بات سراسر جھوٹ ہو۔

آپ جائیے میں تھوڑی دیر میں آ جاؤں گی"

جمیل بھیا کچھ دیر تک خاموش کھڑے رہے اور پھر چلے گئے وہ اپنے کمرے میں آ گئی اور میز پلنگ کے پاس کھینچ کر ابا کو خط لکھنے بیٹھ گئی۔ وہ بہت سوچ سوچ کر لکھ رہی تھی۔ جدائی کے یہ سات سال ملاپ کی چمک سے ہمیشہ کے لیے ماند پڑ جائیں گے۔ میں ہر وقت آپ کا انتظار کروں گی۔

خط ختم کرنے کے بعد اس نے وہیں میز پر سر ٹیک دیا۔ اس وقت سات سال کتنے طویل معلوم ہو رہے تھے۔ اللہ رام جی نے بن باس کے چودہ[۱۴] سال کس طرح گزارے ہوں گے؟ کریمن بوا گھر میں کہو کہ مظہر بھائی کے جیل کی خبر سے بہت افسوس ہوا، اگر بدلے میں کوئی مجھے جیل دے دے تو ابھی تیار ہوں۔ اپنی بے کار زندگی"۔ بیٹھک کی دہلیز سے اسرار میاں کی بھرائی ہوئی آواز گھر کے سناٹے کو چیرتی ہوئی اُسے صاف سُنائی دی گئی۔ اس نے میز سے سر اُٹھا کر خط لفافہ میں بند کر دیا۔

اسرار میاں کے پیغام کا کوئی جواب نہ تھا۔ صرف کریمن بوا کے پٹا پٹخنے کی آواز آ رہی تھی اللہ کرے اسرار میاں بڑھاپے سے پہلے ہی دادی کی طرح اونچا سُننے لگیں۔ انھیں یہ شک تو رہے گا کہ جواب تو دیا گیا ہے مگر انھوں نے سُنا نہیں۔

بڑے کمرے کی کھڑکی سے جھانک کر اس نے نیچے دیکھا۔ صحن میں بچھے ہوئے پلنگوں پر سب لوگ چُپ چاپ بیٹھے ہیں۔ صرف بڑے چچا لیٹے ہوئے سینے پر ہاتھ پھیر رہے تھے۔ بڑی چچی کا سروتہ ہولے ہولے چھالیہ کتر رہا تھا اور کریمن بوا بڑی پھرتی سے روٹیاں پکا رہی تھیں۔ جمیل بھیا لوہے کی کرسی پر بیٹھے انگلیاں مروڑ رہے تھے۔ کسی کا پتہ نہ تھا۔ اس واقعہ کے

بجھے تو اس کی آواز بھی نہ سنائی دی تھی۔ سارا لڑنا بھڑنا بھول گئی تھی۔

وہ دبے قدموں نیچے اتر آئی۔ لالٹین کی پیلی روشنی میں اماں اسے بڑی بے بس نظر آرہی تھیں۔ وہ جلدی سے بڑے چچا کے پاس بیٹھ گئی۔ آج تو اس نے بڑے چچا کا سر بھی نہ سہلایا تھا۔

"ماسٹر صاحب روز آتے ہیں نا؟" آخر بڑے چچا نے بات کرنے کے لئے موضوع ڈھونڈھ لیا اور خاموشی کا ڈیرا اٹھ گیا۔

"آتے ہیں" وہ کھسک کر بڑے چچا کا سر سہلانے لگی۔

"اب اگر تم محنت سے نہ پڑھو گی تو ہم کیا کریں گے۔ میرا کون سا لڑکا بیٹھا ہے جو ان ربول کو بتا دے گا" اماں پر پھر سے رونے کے آثار طاری ہو رہے تھے وہ جلدی سے اٹھ کر دادی کے کمرے میں چلی گئی جب سے رات کو شبنم پڑنی شروع ہوئی تھی دادی کا بستر کمرے میں چلا گیا تھا۔ مئی جون کے سوا ان کا سارا زمانہ کمرے میں گزرتا۔

وہ دادی کی پٹی سے ٹک گئی۔ رحیمی اپنی مسہری پر منھ چھپائے پڑی تھی۔ اس نے عالیہ کو دیکھا اور پھر منھ چھپا لیا۔

"مظہر بیٹے کا کوئی خط آیا۔" دادی نے بے چین سانس کو قابو میں کرتے ہوئے پوچھا۔ ادھر کچھ دنوں سے تو ان پر ہر وقت دمے کا حملہ رہتا۔

"خط آیا تھا دادی، کام بہت ہے چھٹی نہیں ملتی۔" اس کی آواز گھٹ رہی تھی۔ رحیمی نے ایک لمحے کو سر اٹھایا تو دو آنسو لڑھک کر تکیے میں جذب ہو گئے۔

"ایسا معلوم پڑتا ہے کہ اب زندگی ختم ہو رہی ہے۔ تمہارا چھوٹا چچا جانے کب واپس آئے گا وہ مجھ سے بہت محبت کرتا تھا، اٹھارہ سال کا ہو گیا تھا، مگر میری گود میں منھ چھپا کر سوتا تھا جانے وہ کب ـــ"

دادی کی سانس تیز ہونے لگی تو اُنھوں نے گھٹنے پیٹ پر اڑا لیے۔

"عالیہ، بیٹی کھانا کھانے آجاؤ۔" صحن سے بڑی چچی کی آواز آئی تو عالیہ اُٹھ کھڑی ہوئی، کریمن بوا دادی کا کھانا لیے اندر آ رہی تھیں۔

(۲۰)

اماں نے وقت سے سمجھوتہ کر لیا تھا۔ بہت اونچے پر بیٹھے بیٹھے وہ ذرا نیچے پر سرک آئی تھیں، یا اتنی بھی نہیں کہ چچی کے قریب بیٹھ گئی ہوں ان کے چہرے پر اب بھی تیس روپیہ مہینے کا غرور اور اس دولت کا سکون تھا جو ان کے بھائی کے پاس جمع تھی اور حفاظت کا وہ سایہ بھی ان کے ساتھ لگا ہوا تھا جسے اکلوتے بھائی کے اونچے عہدے اور انگریز بھابی نے جنم دیا تھا۔

مقدمے کے فیصلے کے بعد اماں نے ماموں کو کئی خط لکھے تھے جس میں اس گھر اور یہاں کی فضا کی برائیاں کی تھیں ان کے پاس رہنے کی خواہش کا اظہار کیا تھا۔ مگر ماموں نے بڑی بے بسی سے جواب دیا تھا کہ اس طرح وہ بھی حکومت کی نظروں میں آجائیں گے اور اُن کا عُہدہ خطرہ میں پڑ جائے گا۔

عالیہ نے اماں سے اس خط کا ذکر نہ کیا تھا جو اُنھوں نے اسے لکھا تھا اور بڑی صفائی سے اعتراف کیا تھا کہ ان کی بیوی آزاد فضا کی پروردہ ہے اس کے ملک میں رواج نہیں کہ خواہ مخواہ خاندانی جھمیلوں کو پال کر زندگی تلخ کی جائے اس لیے ضروری کہ کسی بہانے وہ اپنی ماں کو وہیں رہنے پر مجبور کرے۔

اس نے یہ خط پڑھ کر پھاڑ ڈالا وہ اماں کا دل نہ توڑنا چاہتی تھی۔ آس ٹوٹنے کے بعد انسان کے پاس کیا بچ رہتا ہے۔ سہارے چاہے دھوکا ہی کیوں نہ دے جائیں مگر کچھ دن تو کام آ ہی جاتے ہیں۔ اسے ماموں سے سخت نفرت ہو گئی تھی۔ یہ ہنس کی چال

چلنے والا کوا اپنی چال بھی بھول گیا۔ ماموں کا خط پا کر اس نے بڑی حقارت سے سوچا تھا جب وہ خود کسی قابل ہو جائے گی تو اماں کے اس سہارے کو نوچ کر دور پھینک دے گی اس نے فیصلہ کیا کہ اب وہ اور بھی محنت سے پڑھے گی۔

ان دنوں بڑے زور کی سردی ہو رہی تھی پھر بھی وہ رات کو بارہ بجے تک پڑھتی رہتی اور جب شکیل آوارہ گردی کر کے ہولے سے صدر دروازہ کھٹ کھٹاتا تو وہ دبے قدموں جا کر زنجیر کھول دیتی۔ شکیل ہائی اسکول میں داخل ہو چکا تھا۔ فیس کے روپے اس نے اماں سے چھپا کر اسے دیئے تھے مگر اتنی بہت سی کتابیں خریدنے کے لیے وہ کہاں سے روپے لاتی شکیل کے پاس بھی یہی بہانہ تھا کہ وہ دوستوں کے ساتھ مل کر پڑھتا ہے۔ اس کی آنکھوں میں کیسی ڈھٹائی آ گئی تھی۔ عالیہ دروازہ کھولتے ہوئے کبھی کبھی تنبیہ کرتی تو بڑی بے اعتنائی سے ہنس پڑتا۔

آج بھی رات کو جب وہ پڑھ رہی تھی تو دروازہ کھٹکا۔ وہ کتابیں رکھ کر جلدی سے سیڑھیاں اُترنے لگی اور جب دروازہ کھول رہی تھی تو جمیل بھیا کانوں میں مفلر لپیٹے اپنے کمرے سے باہر نکل آئے عالیہ کو دیکھ کر ایک لمحے کو ٹھٹکے اور پھر شکیل کا بازو پکڑ کر اس کے منھ پر دو تین تھپڑ مار دیئے "لے یہ سبق بھی یاد کر لے۔"

شکیل نے جمیل بھیا کو ایسی نظروں سے دیکھا جن میں مقابلے کی طاقت تھی مگر وہ جلدی سے بڑی چچی کے کمرے میں چلا گیا۔

"خواہ مخواہ مارتے ہیں، اسے کتابیں خرید دیجئے پھر کیوں جائے گا دوستوں میں پڑھنے" وہ دھیرے سے بولی۔

"کتابیں؟ مجھے بھی کسی نے کتابیں نہیں دی تھیں مگر میں ایسا نہ تھا۔ یہ اتنا بڑا اونٹ کا اونٹ کچھ نہیں سوچتا، گھنٹے دو گھنٹے پڑھ کر بھی آ سکتا ہے۔ اور پھر تم دیکھتی

نہیں ہو گا اسے سلک کی قمیص کسی نے بنوا کر دی تھی، میرا تو کوئی ایسا دوست نہ تھا۔"

بھیا غصے سے ہاتھ مل رہے تھے اور وہ بے وقوفوں کی طرح انہیں دیکھ رہی تھی۔ "پھر کیا ہوا جو کسی دوست نے قمیص بنوا کر دی ہے۔"

بھیا سر جھکائے کھڑے تھے۔ اسے ان کی حالت پر رحم آنے لگا۔ بے چارے روپے کی قلت کی وجہ سے کوئی ٹریننگ بھی نہ لے سکے تو ٹیچنگ کی ملازمت نہیں ملتی۔ ٹیوشنوں کے روپے بھی بڑی چچی کے ہاتھ میں لا دیتے ہیں۔ اس پر شکیل الو تنگ کرتا ہے، کہنا نہیں سنتا۔

وہ اوپر جانے کے لیے مڑی تو جمیل بھیا بھی ساتھ ہو لیے۔ "میں بھی تمہارے ساتھ چلوں ذرا اوپر باتیں کریں گے؟"

"بھلا یہ کون سا وقت ہے باتوں کا، سو رہیے۔" اس نے جلدی سے کہا اور زینے پر قدم رکھ دیا۔

"واہ یہ آپ اس وقت کیا کر رہی ہیں بجیا؟" چھمی جانے کس کام سے اٹھی تھی۔

"میں شکیل کا دروازہ کھولنے آئی تھی۔؟"

"خوب آپ دونوں دروازہ کھولنے آئے تھے، ہے کتنی سخت زنجیر تھی۔" وہ بڑے طنز سے ہنسی۔ "سب کے سامنے بجیا سے بات کرتے آپ کو شرم آتی ہے۔ کیا؟" اس نے بھیا سے پوچھا۔

"چھمی اتنی فضول باتیں تو نہ کرو۔" جمیل بھیا گڑگڑائے۔

"ان کے دھوکے میں نہ آئیے گا بجیا، یہ پہلے مجھ سے عشق کرتے تھے اور اب آپ سے۔" چھمی کچھ کہتے کہتے رک گئی۔

عالیہ تیزی سے زینے پر قدم رکھتی اوپر آگئی۔ اس کی سانس پھولی ہوئی تھی۔ اللہ کیا مصیبت ہے۔ کیا اسی لیے چھمی جمیل بھیا کا سایہ بنی ہوئی تھی۔ اور اب جمیل بھیا اسے چھوڑ کر

ادھر لپک رہی ہیں۔ سردی اور نفرت سے وہ کلبلانے لگی۔ لحاف میں گھس کر اس نے پھر سے کتاب اٹھائی مگر ایک لفظ نہ پڑھا گیا۔ ان چند مہینوں میں جمیل بھیا کی خاموشی اور سنجیدگی نے ان کی جتنی عزت بنائی تھی وہ ساری کی ساری تباہ ہو کر رہ گئی۔

گلی میں کتے اس زور سے بھونک بھونک کر رو رہے تھے کہ اسے رات سے دہشت آنے لگی۔

صبح روز کی طرح چھمی اسے پیار سے جگانے نہ آئی۔ عالیہ بڑی دیر تک پڑی اس کا انتظار کرتی رہی۔ گلی میں اخبار فروش چیختے پھر رہے تھے۔ "یورپ میں لوہے سے لوہا بجے گا، جنگ سر پر کھڑی ہے۔ آ گیا، آ گیا آج کا اخبار۔ جنگ کو کوئی نہیں ٹال سکتا۔ چودہ سال کی لڑکی کا اغوا کر لیا گیا۔"

وہ بستر سے جھنجھلا کر اٹھ گئی۔ جنگ یورپ میں ہوگی تو اسے کیا، کون سے اماں کی بھابی کے عزیز کٹ کر مر جائیں گے، اور لڑکیوں کا تو مصرف ہی صرف یہ ہے کہ وہ محبت کریں، بھاگیں یا اغوا کر لی جائیں، سب بھاڑ میں جائیں۔ سیڑھیاں طے کرتی ہوئی وہ بڑے دکھ سے سوچ رہی تھی۔ مگر چھمی اس پر کیوں غصہ کرتی ہے۔ ارے بے وقوف پاگل۔

چھمی تخت پر بیٹھی ہوئی تھی اور ہاتھ میں پکڑے ہوئے پراٹھے کو دانتوں سے کاٹ کاٹ کر کھا رہی تھی۔ اس کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں۔ عالیہ کو دیکھ کر اس نے منھ پھیر لیا اور پیالی کی ساری چائے ایک ہی سانس میں پی گئی۔

اسے چھمی کی بے وقوفی پر ہنسی آ رہی تھی۔ وہ چھمی کے پاس گھس کر بیٹھ گئی تو اس نے بڑے کرب سے پہلو بدلا اور ایک طرف سرک گئی۔ پھر اٹھ کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔

"رات شکیل کس وقت آیا تھا عالیہ؟" بڑی چچی نے پوچھا۔

"کوئی بارہ کے قریب۔ جمیل بھیا بھی جاگ گئے تھے۔ انھوں نے اس کے دو ہاتھ بھی جڑ دیے تھے۔"

"اس لڑکے کے لچھن اچھے نہیں دکھائی دے رہے ہیں" اماں نفرت سے بولیں۔

"میں کیا کروں منظر کی دلہن، میں پاگل ہو جاؤں گی" بڑی چچی نے ٹھنڈی سانس بھری

"بڑے بھیا سنبھالیں نا اپنی اولاد کو" اماں نے بھڑکایا مگر بڑی چچی بھلا کاہے کو کسی کے بھڑکانے میں آتیں۔ ان کا خود جب جی چاہتا تو بڑے چچا سے لڑ لیا کرتیں۔

"زمانے زمانے کی بات ہے۔ ایک زمانہ تھا کہ بڑے سرکار کے سب بچے سات بجے کے بعد گھر سے باہر قدم نہ نکالتے۔" گزرا زمانہ کرمن بوا کا سایہ بنا ہوا تھا۔

چائے پی کر وہ چھمی کے کمرے میں چلی گئی۔ دادی اس وقت سو رہی تھیں۔ رات کو تو سانس انھیں ایک منٹ کو آنکھ نہ جھپکانے دیتی۔ وہ دبے قدموں چھمی کے پاس جا کر بیٹھ گئی چھمی سر سے پاؤں تک لحاف اوڑھے پڑی تھی۔ جگہ جگہ سے پھٹا ہوا لحاف فقیر کی گدڑی معلوم ہو رہا تھا۔

"چلو اوپر دھوپ میں بیٹھیں چھمی" عالیہ نے اس کے منھ پر سے لحاف سرکایا۔

"ہم آپ سے نہیں بولتے۔"

"اوپر تو چلو، بھلی پھر با میں ہوں گی۔"

چھمی اٹھ کر اس کے ساتھ ہولی۔ اس کی آنکھوں میں عجیب سا کرب تھا۔

"صبح سے تم مجھ سے بولیں کیوں نہیں؟" چھمی کو اپنے لحاف میں بٹھا کر اس نے پوچھا۔

"واہ مجھے کیا پڑی ہے جو آپ سے بول چال بند کروں! کوئی میں اس گدھے سے محبت کرتی ہوں جو آپ سے جلوں گی۔" چھمی نے برا سا منھ بنایا۔

"تم نے آپ ہی آپ یہ سمجھنا شروع کر دیا کہ جمیل بھیا مجھ سے محبت کرتے ہیں، میں نے تو پہلے بھی تم سے کہا تھا کہ مجھے ایسی باتوں سے سخت نفرت ہے اور پھر جمیل بھیا نے بھی کبھی مجھ سے کوئی بات نہیں کی۔" وہ صاف جھوٹ بول گئی۔

جمیل بھیا خود ہی مجھ سے محبت کرتے تھے، مجھے تو پتہ بھی نہیں تھا کہ محبت کیا ہوتی ہے مگر اب وہ بدل گئے تو بدل جائیں میں کب اس الّو سے محبت کرتی ہوں۔"

"تم محبت کرو یا نہ کرو۔ مگر مجھے یہ معلوم ہوگیا کہ تم مجھ سے کتنی محبت کرتی تھیں۔" اس نے ذرا سی ملامت سے کہا چھمی کو دیکھا تو وہ ایک دم اس سے لپٹ گئی ـــ "بھلا میں اپنی بجیا پر شبہ تھوڑی کر رہی ہوں، مجھے تو بس رنج تھا ایک بات کا۔"

چھمی کی معصومیت پر اس کا جی چاہا کہ بس اُسے کلیجے میں دھر لے۔ پھر بھی وہ اس سے روٹھی رہی۔

"ارے سنئے تو میں آپ کو سب کچھ بتاتی ہوں۔" چھمی نے عالیہ کا منھ اپنی طرف کر لیا۔ "جس سال بھیا ایف۔ اے کا امتحان دے رہے تھے، تو انھوں نے مجھ سے روپے مانگے۔ میں نے انکار کر دیا۔ تو انھوں نے مجھے ایسی نظروں سے دیکھا کہ میں نے سارے جمع روپے انھیں دے دیئے اور انھوں نے مجھے زور سے لپٹا لیا۔ مجھے بڑا اچھا لگا ان کا لپٹانا۔" وہ مارے شرم کے سُرخ پڑ گئی۔

"پھر کیا ہوا؟"

"پھر بجیا جمیل بھیا مجھے اچھے لگنے لگے اپنے کھانے کے پانچ روپے بڑی چچی کو دے دیتی باقی سارے جمیل بھیا کو۔ میں نے ان تین برسوں میں ایک کپڑا بھی نہیں بنوایا۔ دیکھا ہے ناآپ نے میرے سارے کپڑے پھٹے ہوئے ہیں۔ ہے؟"

وہ ایک لمحے کو کچھ سوچنے لگی ـــ "جب آپ نہیں آئی تھیں تو جمیل بھیا اسی کمرے میں رہتے تھے میں رات کو ان کے پاس آجاتی تھی۔ پر بجیا اللہ قسم انھوں نے کبھی بدتمیزی نہیں کی۔ ایک بار میں ان کے پاس لیٹ گئی تھی تو خود ہی اُٹھ کر بیٹھ گئے تھے، انھوں نے صرف پیار کیا تھا۔" چھمی کا منھ چقندر ہو رہا تھا۔

"پھر کیا ہوا چھمی ؟"

"پھر بجیا، بڑی چچی نے بھیا کی شادی طے کر دی ۔ بڑی چچی کا خیال تھا کہ اگر جمیل بھیا منظور چچا کے داماد بن گئے تو وہ آپ ہی ایم اے کرا دیں گے ۔ اور ٹریننگ بھی دلا دیں گے، ویسے میں چپکے سے آپ کو بتا دوں کہ بڑی چچی آپ کی اماں سے بہت ڈرتی ہیں ۔ بس اسی لیے بغیر رشتے کے کیسے کہتیں کہ آگے پڑھا دو ۔ میرا میاں تو نکما ہی ۔ بڑی چچی نے بڑے ڈرتے ڈرتے تہمینہ آپا کا رشتہ مانگا تھا اور جس دن منجھلی چچی نے منظوری کا خط بھیجا تھا اس دن بڑی چچی خوشی سے روتی رہی تھیں، بھلا میں کیسے کہتی کہ میں نے بی ۔ اے کرا دیا ہی تو ایم ۔ اے بھی کرا دوں گی ۔ کسی کو کیا پتہ کہ میں نے کتنے دکھ جھیلے ۔" وہ سر جھکا کر کچھ سوچنے لگی ۔

"پھر چھمی ۔ ؟"

"یہ دنیا سچ مچ بڑی بری ہی بجیا ۔ جمیل بھیا بھی تو بی اے کرنے کے بعد بدلے بدلے نظر آنے لگے ۔ میں اگر ان کے پاس زیادہ بیٹھتی تو بہانوں سے اٹھا دیتے ۔ سب کچھ بھول گئے نا، اور اب تو کچھ بھی یاد نہیں رہا انھیں ۔ سب کے سامنے میرا مذاق اڑاتے ہیں الٹی سیدھی باتیں کرتے ہیں خیر کرتے رہیں، میں بھی تو کوئی کتیا نہیں ہوں ۔ جو ان کے پیچھے پھروں ۔" چھمی نے گھٹی گھٹی آہ بھر کر اسے ایسی نظروں سے دیکھا کہ اس کا جی دکھ کر رہ گیا ۔ اسے تہمینہ آپا یاد آگئیں ۔ کہیں یہ چھمی بھی کوئی بے وقوفی نہ کر بیٹھے پھر کیا ہوگا ۔

"کیا پتہ چھمی، جمیل بھیا تم سے محبت کرتے ہی ہوں، اور نہ بھی کرتے ہوں تو کیا محبت کے بغیر انسان خوش نہیں رہ سکتا ۔ ؟"

"تو، تو کیا میں ان پر کچا دھوتی پھروں گی کبھی جو ہم سے محبت کرے گا ۔ ہم اس سے کریں گے ۔ یہ تو بدلہ ہی ۔ اس ہاتھ دے اس ہاتھ لے ۔" وہ ہنستی ہوئی اٹھ گئی ۔" رات دادی کی طبیعت بڑی خراب رہی تھی ۔ میں سو نہیں سکی ۔"

چچی کے جانے کے بعد وہ دیر تک یوں ہی لحاف میں بیٹھی جھومتی رہی اور پھر کتابیں اُٹھا کر دھوپ میں جا بیٹھی۔ ہائے کیا مل گیا جمیل بھیا کو اس بے چاری سے کھیل کر۔ مگر یہ عورتیں محبت کی اتنی بھوکی کیوں ہیں اللہ؟۔

(۲۱)

رات کے بارہ بج رہے تھے۔ اب وہ پڑھتے پڑھتے تھک چکی تھی۔ اس نے میز پر کتابیں رکھ دیں۔ وہ سونا چاہتی تھی مگر سو نہ سکی۔ اور جب نیند نہ آئے تو کتنی بہت سی باتیں ذہن میں کلبلانے لگتی ہیں۔ ابا کا خط کیوں نہیں آیا۔ آپا تہمینہ نے عشق کے پیچھے جان گنوا دی اور اب وہ بالکل تنہا ہیں کسی کی رفاقت نصیب نہیں۔ اماں اپنے دکھوں میں مبتلا ہیں۔ انھوں نے کبھی اپنی اس اولاد کے دل میں جھانک کر نہیں دیکھا۔ اس کے لیے کچھ نہیں سوچا اور جمیل بھیا خواہ مخواہ اس کی راہ کا روڑا بن رہے ہیں کیا انھیں زندگی میں کوئی اور غم نہیں۔ لاحول ولا مگر وہ ان کے لیے سوچ ہی کیوں رہی ہے؟ کھڑکی سے روشنی اندر آ رہی ہے۔ اس لیے نیند نہیں آتی۔ اس نے دونوں پٹ بھیڑ دیے۔

نچلی منزل میں اچانک سب کے باتیں کرنے کی آواز آنے لگی۔ وہ دم سادھ کر باتیں سننے کی کوشش کرنے لگی۔ بارہ بجے ہیں، شاید شکیل آیا ہوگا اور سب اس کی تاک میں ہوں گے۔

زینوں پر قدموں کی چاپ ہوئی تو وہ گھبرا کر اُٹھ بیٹھی جمیل بھیا اس کی طرف آ رہے تھے۔

"عالیہ، دادی کی طبیعت سخت خراب ہے۔ ذرا دیر کو نیچے چلو۔" وہ بہت سنجیدہ ہو رہے تھے۔ "تم گھبراؤ گی تو نہیں۔ ایک دن سب پر یہ وقت آتا ہے۔"

اس کا دل زور سے دھڑکا۔ وہ سب سمجھ گئی تھی۔ اُسے محسوس ہوا کہ اس کے پاؤں کانپ رہے ہیں مگر وہ بڑی ہمت سے جمیل بھیا کے ساتھ ہو لی۔ جمیل بھیا اس کا ہاتھ تھامے ہوئے تھے

مگر اُسے تو پتہ ہی نہ چل رہا تھا کہ یہ ہاتھ اس کا ہے یا کسی غیر کا۔

دادی کی مسہری کھینچ کر اُن کا منھ قبلے کی طرف کر دیا گیا تھا۔ اماں، بڑی چچی اور بڑے چچا مسہری کے ارد گرد خاموشی سے کھڑے ہوئے تھے۔ دادی کی وہ جھگڑالو سانس جانے کتنی دیر سے سُون ہو گئی تھی۔ دور دور زندگی کی آہٹ بھی نہ محسوس ہوتی۔ دادی کی آنکھیں دروازے پر لگی ہوئی تھیں۔ ابھی ان میں انتظار کا نور باقی تھا شاید وہ اس وقت بھی اپنے سب سے لاڈلے چھوٹے بیٹے کا انتظار کر رہی تھیں۔ اور چھمّی، دادی کے قدموں سے لپٹی گھٹی گھٹی سسکیاں بھر رہی تھی۔ ظالم چھوٹے چچا — عالیہ کی نظروں میں ان دیکھے چھوٹے چچا کا بھیانک نقشہ پھر گیا۔ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ وہ چیخ چیخ کر کہے۔ دادی اب تو ایسی بے کار اولاد کا انتظار نہ کرو۔

کریمن بوا بڑی بے تابی سے مسہری کے چاروں طرف گھوم گھوم کر دعائیں کر رہی تھیں مولا مالکن کو صحت دے دے اور بدلے میں مجھے اُٹھا لے۔ مولا! مولا۔

بابر نے بھی تو اسی طرح ہمایوں کی جان کی اماں چاہی تھی — ہے کریمن بوا یہ کون سی محبت ہے جو تمھارے دل میں ٹھاٹھیں مار رہی ہے۔ عالیہ نے کریمن بوا کو بٹھانا چاہا مگر وہ اپنے کو چھڑا کر پھر دعائیں کرنے لگیں۔ مولا، مولا۔"

ایک ہچکی کے ساتھ دادی کو دائمی سکون مل گیا۔ کریمن بوا ہاتھ جوڑ کر کھڑی ہو گئیں۔ ان کی آنکھ میں ایک بھی آنسو نہ تھا۔ بڑے چچا نے نبض پر سے ہاتھ ہٹا کر دادی کے ہاتھ سینے پر باندھ دیے اور لحاف سے منھ چھپا دیا۔ کریمن بوا کمرے سے سر جھکائے نکل گئیں۔

"چھمّی، اب اُٹھ جاؤ بیٹی۔" بڑی چچی نے چھمّی کو اٹھایا تو دادی کا ڈھکا ہوا منھ دیکھ کر وہ بے قابو ہو گئی۔ بڑے چچا کا منھ ضبط کی وجہ سے سرخ ہو رہا تھا اور اُن کی آنکھوں سے ماں کی محبت بھری کہانیوں کی یاد میں جھانک رہی تھیں اور دائمی جدائی کا صدمہ ظاہر ہو رہا تھا

بڑے چچا سر جھکائے بیٹھک میں چلے گئے شاید اسرار میاں کو اطلاع دینے۔ اماں اور بڑی چچی چھمی کو چپ کرانے کی کوشش کر رہی تھیں مگر وہ ہاتھوں سے نکلی جاتی تھی۔ پھر جب جمیل بھیا نے بڑھ کر اس کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا تو چھمی کا سر جیسے خود بخود ان کے سینے پر آ ٹکا اور وہ اس طرح چپ ہو گئی جیسے کبھی روئی نہ تھی۔

وہ کمرے سے باہر آ گئی۔ کریمن بوا صحن میں اینٹوں کا چولہا بنا کر بڑے سے پتیلے میں پانی گرم کر رہی تھیں اور وہ جواب تک دادی کی موت پر ایک آنسو بھی نہ بہا سکی تھی اندھیرے میں آگ کے لرزتے شعلوں کو دیکھ کر سسک اٹھی۔ کریمن بوا نے اس کی طرف دیکھا اور سر جھکا لیا۔

رات دادی کی مسہری کے پاس بیٹھ کر کٹ گئی۔ اماں اور بڑی چچی آج دادی کے سارے ظلم و ستم بھول کر انھیں اس طرح بلک بلک کر یاد کر رہی تھیں جیسے ان کے بغیر دنیا سونی ہو گئی ہو جب تک دادی زندہ رہیں ان کے ظلم و ستم نے سب کے کلیجے چھلنی کر رکھے تھے۔ بڑھاپے کے آتے ہی سب نے انتقام لے لیا۔ بے کار چیز کی طرح اٹھا کر ایک طرف ڈال دیا اور پھر زندگی کے کام میں مصروف ہوئے کے اتنے دورے پڑے کہ دادی ٹکر ٹکر منھ تکنے کے سوا کچھ نہ کر سکیں۔

عالیہ کا جی چاہا کہ وہ اپنے کانوں میں روئی ٹھونس لے۔ اماں اور بڑی چچی کی محبت کی داستانیں اس سے نہ سنی جا رہی تھیں۔ آخر اس وقت سب کو ان کے ظلم و ستم کیوں نہیں یاد آتے؟ اسے تو صرف چھمی اچھی لگ رہی تھی۔ جو کوئی بات نہ کر رہی تھی بلکہ تھوڑی دیر رو لینے کے بعد دری کے ایک کونے پر لیٹی بڑے سکون سے سو رہی تھی، جیسے اب بھی اس کا سر جمیل بھیا کے سینے پر ٹکا ہو۔ اور کریمن بوا جو سامنے ٹھنڈی ہوا میں بیٹھی گیلی لکڑیاں پھونک رہی تھیں اور گود میں رکھے ہوئے قرآن پاک کو ہل ہل کر پڑھے جا رہی تھیں، کتنے صبر اور خاموشی سے انھوں نے دادی کی موت کو برداشت کر لیا تھا۔ چھ سال سے تن تنہا دادی کی خدمت کرنے والی کریمن بوا نے ایک آنسو بھی نہ بہایا تھا۔

اس کا جی چاہ رہا تھا کہ وہ بھی دری کے ایک کونے پر سکڑ سمٹ کر سو رہے۔ اُسے دادی سے نہ تو شدید محبت تھی اور نہ کوئی شکایت، بس وہ اس کی دادی تھیں۔ پھر بھی وہ لیٹ نہ سکی، کیونکہ اماں نے چھمی کے سو جانے پر بڑی نفرت سے نکتہ چینی کی تھی۔

آخر کو صبح ہوگئی۔ کریمن بُوا نے صحن میں دری بچھا دی تھی، اور محلّے کی عورتیں آآ کر جمع ہو رہی تھیں۔ وہ سب اپنے اپنے دکھوں کو یاد کرکے آنسو بہا رہی تھیں اور چھمی انھیں دیکھ دیکھ کر اپنی جان ہلکان کر رہی تھی۔

جب دادی کو نہلا دھلا کر آخری سفر کے لیے تیار کر دیا گیا تو تمام عورتیں برآمدے میں ٹاٹ کے پردے کے پیچھے چھپ گئیں صرف کریمن بُوا ہاتھ جوڑے لاش کے پاس کھڑی جانے کیا کہہ رہی تھیں۔

جب میّت اُٹھانے کے لیے مرد اندر آئے تو اسرار میاں سب سے آگے تھے۔

"خبردار! زندگی میں کبھی مالکن نے مُنھ نہ لگایا اب ان کی لاش خراب کرنے آئے ہو۔" کریمن بُوا اسرار میاں کے سامنے آگئیں اور وہ چوروں کی طرح جمیل بھیا کے پیچھے چھپنے لگے۔ تمام لوگوں کی نظریں سوالیہ نشان بن کر اسرار میاں کا تعاقب کر رہی تھیں۔

ارے شکیل کہاں ہو، اپنی دادی کو قبر تک تو پہنچا آتا۔" بڑی چچی ٹاٹ کے سوراخ سے شکیل کو تلاش کر رہی تھیں۔ مگر وہ کہاں تھا۔

"اندر جاؤ کریمن بُوا۔" بڑے چچا نے کریمن بوا کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔

"اللہ کو سونپا مالکن۔ اللہ کو سونپا۔" کریمن بُوا صحن سے ہٹ کر برآمدے میں آگئیں۔

دادی کی لاش جب صدر دروازے سے پار ہو رہی تھی تو ایک بار سب چیخ کر رو پڑے مگر کریمن بُوا سر جھکائے صحن میں بکھرا ہوا سامان بٹور رہی تھیں۔

ذرا دیر بعد سب مہمان چلے گئے تو جیسے گھر ایک دم ویران ہو گیا۔ اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ کیا کرے۔

سات نو بجے بڑے چچا کسی کام سے کان پور چلے گئے۔ عدم تعاون کی تحریک زوروں پر تھی اور وہ بہت دن سے مصروف تھے۔ بڑے چچا کا اسی دن چلا جانا اُسے سخت بُرا لگا۔ کیا وہ ڈڑ دن گھر میں بیٹھ کر اپنی ماں کا سوگ بھی نہیں منا سکتے تھے۔ کیا ان کی سیاست بازی انھیں اتنا بھی وقت نہیں دے سکتی۔؟

مگر جب اماں نے ان کے جانے پر اعتراض کیا تو وہ چپ چاپ سُنتی رہی جانے کیوں وہ بڑے چچا کے خلاف ایک لفظ نہ بول سکتی تھی۔

جمیل بھیا نے نجمہ پھوپھی، ابّا اور چھمی کے ابا کو تار کر دیے تھے۔ اور اب سب لوگ ان کی آمد کا انتظار کر رہے تھے۔

دوسرے دن سے سب کام اس طرح ہونے لگے جیسے کوئی بات ہی نہ ہوئی ہو۔ صرف اس وقت دادی کی موت کا احساس شدید ہو جاتا جب کریمن بوا کام سے فارغ ہو کر قرآن شریف پڑھنے بیٹھ جاتیں۔ اور تو گھر میں کسی نے ایک آیت بھی نہ پڑھی۔ عالیہ کو کریمن بوا کی محبت پر رشک آنے لگا تھا اس نے کتنی بار چاہا تھا کہ ایک آدھ پارہ پڑھ کر دادی کی رُوح کو بخش دے مگر اُسے فرصت ہی نہ ملتی۔ امتحان کی تیاری سر پر سوار تھی وہ اب پھر دھیان سے پڑھنا چاہتی تھی۔ وہ اپنا ایک سال دادی کو بخشنے کے لیے تیار نہ تھی۔ وہ کریمن بوا کے مقابلے میں خود کو کمتر سمجھ کر صبر کر لیتی۔

چھمی چند دن تک اپنے کمرے میں جانے سے گھبراتی رہی۔ پُرانے رفیق کا ساتھ چھوٹنے کے بعد وہ کمرہ شاید اس کے لیے جنگل بن گیا تھا وہ ادھر ادھر ماری ماری پھرتی یا پھر صحن میں چوکی پر بیٹھ کر پھٹے ہوئے کپڑوں کی مرمت کرتی رہتی یا پھر لوٹوں پانی بھر کر کیاری میں ڈالنے لگتی اور جب اس سے بھی اکتا جاتی تو برقع اوڑھ کر محلے کے گھروں گھروں پھرا کرتی۔

پھر ایک دن اس نے جھاڑو اٹھا کر اپنا کمرہ صاف کرنا شروع کر دیا۔ سارے جالے پھرا دیئے

محمد علی جوہر کی تصویر سے گرد جھاڑی گئی اس نے سفید کڑھی ہوئی پرانی چادروں پر پیوند لگا کر انھیں دونوں مسہریوں پر بچھا دیا اور صاف ستھرے بستر پر لیٹ کر ہمیشہ کی طرح گانے لگی ؎

مال سوزِ غم ہائے نہانی دیکھتے جاؤ

بجھی کو گراموفون ریکارڈوں کے سارے گانے اور فقیروں کی گائی ہوئی ساری غزلیں یاد تھیں۔ اسے ہر موقعہ کی غزل اور گیت گانے میں ملکہ حاصل تھا۔ آج جب بجھی بے اٹھائیں سے لیٹی گا رہی تھی تو عالیہ کا جی چاہا کہ جا کر اسے لپٹا لے مگر بجھی تو اب تک اس سے سیدھے منھ نہ بولتی تھی سب کچھ بتانے کے باوجود اس کے دل میں کوئی پھانس رہ گئی تھی جسے نکالنا عالیہ کے بس میں نہ تھا۔

نجمہ پھوپھی اور بجھی کے ابا کا خط آیا تھا۔ انھوں نے لکھا تھا کہ جب اماں رخصت ہو گئیں تو پھر آنے سے کیا فائدہ۔ کاش انھیں کوئی پہلے سے اطلاع کر دیتا۔

بجھی اپنے ابا کا خط پڑھ کر آپے سے باہر ہو گئی ۔۔ "ہاں اب آنے کا کیا فائدہ۔ ایک دن کے لیے بیوی کے پہلو سے الگ ہو کر انھیں کب قرار آتا ہے۔ میرا بس چلے تو اپنے والد صاحب قبلہ کا گلا اپنے ہاتھوں گھونٹ دوں۔

"بجھی کہیں تو زبان کو لگام دیا کرو۔" عالیہ کی اماں نے گھرکا تو بجھی ایک دم گھٹ گھٹ کر رونے لگی۔ جانے کیوں وہ اتنے دن گزرنے کے بعد بھی اماں کو جواب دینے سے چوک جاتی تھی۔

ابا کو بھی دادی کی موت کی اطلاع مل گئی تھی۔ ان کا خط آیا تھا۔ انھوں نے لکھا تھا کہ تصور کی دنیا کو کوئی جیل بند نہیں کر سکتا۔ اس پر کوئی پابندی نہیں لگائی جا سکتی۔ میں نے اپنی ماں کو کاندھا دیا تھا۔ میں نے انھیں قبر میں اتارا تھا۔ خیر تم رنج نہ کرنا میری بیٹی۔ تم کو دل شکستہ نہ ہونا چاہیے۔ موت بھی زندگی کی ایک حقیقت ہے۔ محنت سے پڑھو اور اپنے پاس ہونے

کی خوشخبری سُناؤ۔

خط پڑھ کر عالیہ بڑی دیر تک سر جھکائے بیٹھی رہی۔ دوپہر ہوگئی مگر اس کا پڑھنے میں جی نہ لگا۔ ایک تو ابا کے خط نے اُسے رنجیدہ کر دیا تھا، اس پر سے دوپہر کے سناٹے میں کریمن بُوا کے ہولے ہولے قرآن پاک پڑھنے کی آواز جیسے فریاد کرتی معلوم ہو رہی تھی۔

اپنے کمرے سے نکل کر وہ نیچے اُتر گئی اور تخت پر کریمن بوا کے پاس جا بیٹھی۔ اماں اور بڑی چچی شاید سو رہی تھیں کیونکہ اُن کے باتیں کرنے کی آواز نہ آرہی تھی۔

کریمن بوا جب تک پڑھتی رہیں وہ اُن کے پاس سر جھکائے بیٹھی رہی اور جب وہ قرآن شریف بند کر کے دعا کرنے لگیں تو عالیہ کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ کریمن بوا محبت کی کیسی مثال بنی کر رہی ہیں۔ کام سے تھک کر وہ کبھی تو دن میں سو سکتی ہیں۔

"تم سوئی نہیں عالیہ بیٹی؟" دعا ختم کر کے کریمن بُوا نے پوچھا۔

"نیند نہیں آئی کریمن بوا اور ـــــ" وہ چپ ہوگئی۔

"کیا بھوک لگی ہے بٹیا کو؟ ایک روٹی الٹ دوں آگ جلا کر؟"

"نہیں کریمن بوا، تمہارے پڑھنے کی آواز سے جی بھر رہا تھا۔"

"منجھلے میاں اور تجمہ کو بٹیا کو ضرور آنا چاہیئے تھا۔ تجمی بھی اپنے باپ کو دیکھ لیتی اور پھر کچھ نہیں تو بہن سہری کا دیدار کر لیتے جس پر ان کی ماں نے دم توڑا تھا۔ زمانے زمانے کی بات ہے کبھی ماں کے بغیر چین نہ پڑتا تھا۔" کریمن بُوا کے لہجہ میں شکایت تھی۔

"تم کو دادی سے کتنی محبت تھی کریمن بُوا، شاید دادی بھی تم کو اتنا ہی چاہتی ہوں گی۔"

"کیا مالکن مجھے چاہتی تھیں ـــ؟" کریمن بوا نے اُلٹا سوال کر دیا ـــ "تم نے اپنی دادی کا زمانہ نہیں دیکھا بٹیا، پتہ نہیں وہ کسی کو چاہتیں بھی تھیں یا نہیں، ہاں صرف چھوٹے میاں کو چاہتی تھیں جو پتہ نہیں کہاں کھو گئے۔ انھیں خلافت کے جلسے لے گئے۔ ہم تو نوکر لوگ تھے

عالیہ بٹیا، ہماری کیا حیثیت۔" کریمن بوا نے اپنی قمیص پیٹھ پر سے سرکا دی اور اس کی طرف گھوم کر بیٹھ گئیں۔ اُن کی پیٹھ پر سیاہ نشان تھے اور ایک جگہ سے سفید سفید چربی سی نکلی ہوئی تھی۔

"یہ کیا ہوا تھا کریمن بوا؟" اس نے جلدی سے قمیص نیچے کھینچ دی۔

"میری اماں مالکن کے جہیز میں آئی تھیں۔ میرے ابا مر گئے تھے، میں چھوٹی سی تھی، پھر جب ذرا بڑی ہوئی تو مالکن نے اپنے گھر کے ایک نوکر سے میری شادی کر دی۔ نئی نئی شادی ہوئی تھی اس لئے مالکن کی خدمت میں ذرا سی کوتاہی ہو گئی۔ بس یہ اسی کی سزا تھی۔" کریمن بوا سر جھکا کر کچھ سوچنے لگیں۔

اللہ، یہ کریمن بوا بھی کیسی ہیں۔ اتنے ستم سہنے کے بعد بھی جب تک دادی زندہ رہیں ان پر نچھاور ہوتی رہیں اور اب بھی انہیں نہیں بھولتیں۔ وہ حیران ہو کر ان کا منھ تک رہی تھی۔

"میں نے ساری زندگی اُن کا نمک کھایا تھا اور اب بھی ان کی اولاد کا نمک کھا رہی ہوں۔ نمک کا بڑا حق ہوتا ہے بٹیا عالیہ، میری اماں، اللہ انہیں جنت نصیب کرے، کہتی تھیں کہ جس کا نمک کا حق نہ ادا کیا وہ خدا کے ہاں بھی معاف نہ کیا جائے گا۔ مالکن کوئی غلطی ہو گئی ہو تو معاف کر دینا مجھے، دوسری دنیا میں تو سکھ کی سانس لے سکوں۔"

کریمن بوا اُٹھ کر جھوٹے برتن سمیٹنے لگیں اور عالیہ کو ایسا محسوس ہوا کہ کریمن بوا نے نمک کا سارا ڈبہ اس کے منھ میں انڈیل دیا ہو جو اُسے زہر سے کڑوا لگ رہا تھا۔

(۲۲)

سورج ڈوب رہا تھا اور اس وقت گلی میں سودے والوں نے جیسے دھاوا بول دیا تھا سب ایک دوسرے سے بڑھ کر آواز لگا رہے تھے اور چھتوں سے کھلی کھڑکیوں سے بچوں اور مردوں کی آوازیں آ رہی تھیں، روزہ افطار کرنے کے لیے سب اپنی پسند کے سودے والے کو آواز دے رہے تھے

کھڑکی کھول کر وہ ایک منٹ کے لیے گلی میں جھانکی۔ سامنے ہائی اسکول کا سیاہ پھاٹک بند پڑا تھا اور درختوں کے جھنڈ سے کوئل کے کوکنے کی آواز آ رہی تھی۔ جانے شکیل اسکول جاتا بھی ہے کہ نہیں۔ اس نے سوچا۔ پر کون ہے جو یہ سب معلوم کرے۔ اگر بڑے چچا گھر پر ذرا سی بھی توجہ دیدیں تو سب کچھ ٹھیک نہ ہو جائے۔ مگر۔۔ اسے ایک دم ابا یاد آ گئے۔ اس بار وہ انھیں عید کارڈ ضرور بھیجے گی۔ کھڑکی بند کر کے وہ چھت پر آ گئی تو اسے ہلکی سی سردی محسوس ہونے لگی پھر بھی وہ ٹہلتی رہی۔ چھتوں سے بچے پتنگیں اڑا رہے تھے اور شور ہو رہا تھا۔ عالیہ کو یاد آیا کہ ایک بار اس نے بھی بھنگی کے لڑکے کے ساتھ پتنگ اڑانے کی کوشش کی تھی۔ اور ابا نے اسے سختی سے ڈانٹا تھا مگر آج تک اسے پتنگ بڑی اچھی لگتی۔

"عالیہ —" بڑی چچی ہانپتی ہوئی اوپر آ کر اس کے پاس کھڑی ہو گئیں۔ ان کا منہ سرخ ہو رہا تھا۔ جیسے بڑی مشقت کی ہو۔ ایسی ہی مجبوری ہوتی جو وہ سیڑھیاں چڑھتیں۔ انھیں تو اوپر چڑھنے کے خیال ہی سے اختلاج ہونے لگتا — "یہ لو اپنے کپڑے۔" انھوں نے سانس درست کرتے ہوئے ہنس کر ایک بنڈل اس کی طرف بڑھا دیا۔ "دوپٹہ رنگ کر چن لو اور پاجامہ بھی مشین پر کھٹ کھٹا لو، جمپر تو تمہارے پاس ہے ہی۔"

اس نے بڑے چاؤ سے بنڈل کھول کر دیکھا۔ ڈھاکہ کی ململ کا دوپٹہ اور نیلی ساٹن چمک رہی تھی۔

"مگر بڑی چچی اس کی کیا —"

"بس بس، تم آج رات ضرور سی ڈالو اور ہنسی خوشی عید مناؤ۔" وہ جانے کے لیے مڑیں — "روزہ کھولنے کا وقت ہو رہا ہے، تم نیچے نہیں آتیں۔"

اللہ یہ کپڑے کہاں سے آ گئے، کون لے آیا۔ عید کے لیے کسی کے بھی تو کپڑے نہ بنے تھے۔ بڑی چچی نے تو کئی بار بڑے چچا سے کپڑوں کے لیے کہا تھا۔ مگر وہ ہر بار شرمندہ سے

ہو کر بیٹھک میں چلے گئے تھے۔ پھر اس کے کپڑے کس نے خریدے ہیں۔؟ کیا جمیل بھیا نے اپنے ٹیوشن کے روپے اس پر خرچ کر دیے ہیں یا پھر بڑے چچا نے ابا کی جگہ کو پر کیا ہو؟ مارے خوشی کے اس کا دل دھڑکنے لگا۔ ضرور بڑے چچا نے خریدے ہوں گے۔

مگر ذرا ہی دیر میں اُسے معلوم ہو گیا کہ کپڑے کس نے خریدے ہیں۔ نیچے سے شکیل کی آواز بڑی صاف سُنائی دے رہی تھی۔ "جمیل بھیا نے بجیا کے کپڑے بنوا دیئے میرے لیے کچھ نہیں آیا۔ کیا دوست عید بھی منوا دیں۔؟"

"بکواس نہ کر نامراد" بڑی چچی اُسے ڈانٹ رہی تھیں۔ "کیا وہ تیری بہن نہیں تو خود اس کے کپڑے بنا۔ ارے تیرے جتنے لڑکے ایک کُنبے کا پیٹ بھرتے ہیں۔"

"ہاں جب تم باہر رہتے ہو تو وہیں کپڑے بھی پہنو، جمیل تو بہت شریف لڑکا ہے۔" اماں بھی شکیل کا کلیجہ جلا رہی تھیں۔

"مجھے اس گھر سے ملا ہی کیا ہے کبھی، کپڑے بھی دوست ہی دیں گے" شکیل نے بڑے بچے پن سے جواب دیا۔

"تم بھی اگر بجیا کی طرح بن جاؤ تو اللہ قسم جمیل بھیا تمہارے دس جوڑے بنا دیں۔ ویسے تم کو کون پوچھے" ہ چھمی بھی تیر برسا رہی تھی۔ جو سیدھے عالیہ کے کلیجے میں اُتر رہے تھے۔

اس نے کپڑے پلنگ پر ڈال دیئے۔ ایک لمحے کو اُسے ایسا محسوس ہوا کہ یہ کپڑے جمیل بھیا کی انتہائی محبت کا تحفہ ہیں۔ مگر دوسرے ہی لمحے یہ کپڑے ٹھنڈے اور کفن کی طرح محسوس ہونے لگے ان کپڑوں میں لپٹا ہوا نیلے ہونٹوں والا ایک چہرہ جھانک رہا تھا۔ اس نے کانپ کر کپڑوں کو سمیٹ لیا اور اپنے کمرے میں جا کر انھیں بکس میں ٹھونس کر تالا لگا دیا۔ لاحول ولا۔ کیا وہ بھی کبھی بے وقوف ہو سکتی تھی۔ یہ سب اسی تھیلی کے چٹے بٹے ہیں، مرد کی فطرت تو پارے کی طرح ہو ذرا سی گرمی ملی اور چڑھ گیا۔ کل چھمی تھی آج وہ منظور نظر ہو۔ پھر کسی اور کی باری ہوگی۔

جب وہ پہنچی تو سب لوگ انطاری کے نشے میں مست سے بیٹھے تھے۔ کریمن بوا روٹیاں پکانے میں لگی ہوئی تھیں۔ برآمدے میں بچھے ہوئے پلنگوں پر بیٹھی ہوئی بڑی چچی اور اماں پان بنا بنا کر کھا رہی تھیں اور جمیل بھیا اس سردی میں اپنی لوہے کی کرسی پر بیٹھے، اسٹول پر رکھی ہوئی لالٹین کی روشنی میں کچھ پڑھ رہے تھے۔ جب زور کی سردی ہوتی تو شام کو یہ کرسی بڑی سونی سونی معلوم ہوتی ورنہ پھر دیا بھی اسی کرسی پر بیٹھ کر دھوپ سینکتی، جاڑا گرمی برسات، یہ کرسی ہمیشہ کیاری کے پاس پڑی رہتی اُسے کوئی بھی نہ اٹھاتا۔

عالیہ کو ایک لمحے کے لیے خیال آیا کہ کہیں جمیل بھیا کو سردی نہ لگ جائے۔ اب تو اچھی خاصی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔

"اب تمھاری پڑھائی کا کیا حال ہے، امتحان کے تو بہت تھوڑے دن رہ گئے ہیں" جمیل بھیا نے اُسے دیکھتے ہی سوال کیا اور اس کے ساتھ برآمدے میں چلے آئے۔

"بس ٹھیک ہی ہے" وہ اماں کے پاس بیٹھ گئی اسے تو ڈر ہی لگتا کہ کہیں جمیل بھیا امتحان نہ لینے لگیں۔ بڑے چچا لاکھ انھیں اپنی لائبریری کی چابی نہ دیتے۔ پھر بھی وہ جمیل بھیا کی ذہانت کی قائل تھی۔

"میاں تم بھی ذرا عالیہ کی پڑھائی دیکھ لیا کرو" اماں نے کہا۔

"ہاں میں ضرور دیکھوں گا۔ ویسے تو آجکل میں بھی ایم۔ اے کی تیاری کر رہا ہوں" جمیل بھیا نے خوش ہو کر بتایا اور پھر کنکھیوں سے عالیہ کی طرف دیکھا۔

چھمی جانے کس وقت اپنے کمرے کی دہلیز پر آکر بیٹھ گئی تھی۔

"یہاں آجاؤ چھمی، سردی ہے۔ ادھر برآمدے میں بیٹھو" بڑی چچی نے کہا۔

"میں ٹھیک بیٹھی ہوں" چھمی نے تلخی سے جواب دیا۔

پہلے بھی جنگ ہوئی تھی تو یہاں مہنگائی ہوگئی تھی، مگر وہ تو اور ہی زمانہ تھا، ہمارے

گھروں میں، تو پتہ بھی نہ چلا۔ بس پتہ چلا بھی تو اُس وقت جب میرا بھائی ـــــ" بڑی چچی چپ ہوگئیں اور پھر ٹھنڈی سانس بھر کر بولنے لگیں۔ "ان دنوں یہ جمیل پیدا ہوا تھا۔ جب اس کے ماموں کے مرنے کی خبر آئی تھی۔" بڑی چچی نے سب کی طرف دیکھا مگر سب نظریں جھکائے خاموش رہے۔ "مگر اب تو مہنگائی کا پتہ چل رہا ہے۔ اب تو وہ حالت بھی ـــــ" بڑی چچی چپ ہوگئیں کیونکہ اماں کے ماتھے پر شکنیں پڑ گئی تھیں۔ جب بھی بڑی چچی مہنگائی کی بات کرتیں۔ تو اماں کے ماتھے پر شکنیں گہری ہو جاتیں۔

"سب لوگ کھانا کھالو۔ نہیں تو ٹھنڈا ہو جائے گا۔" کریمن بوا نے تخت پر دسترخوان بچھا دیا۔

چھمی جیسے جھپٹ کر اپنی جگہ سے اُٹھی اور پلیٹ میں اپنا کھانا نکال کر تیزی سے اپنے کمرے میں چلی گئی۔ عالیہ اس کا مُنھ دیکھتی رہ گئی۔ ہائے یہ چھمی یوں ہی ناراض ہوگئی، کوئی بات ہوتی تو پھر ٹھیک تھا۔ اس کا کیا جی چاہتا ہے کہ چھمی ایک بار پھر پہلے جیسی ہو جائے، اب اتنے پیار سے کوئی بھی تو بجیا کہنے والا نہ تھا۔ اس نے بڑی ملامت بھری نظروں سے جمیل بھیا کی طرف دیکھا مگر وہ جیسے اسی کو تک رہے تھے۔ اس نے گھبرا کر نظریں نیچی کرلیں۔ ایک جوڑا کپڑے کا لاکر شاید وہ اُسے اپنی ملکیت سمجھنے لگے ہیں۔ اس کا جی چاہا کہ کوئی بہت سخت سی بات بھیا کے مُنھ پر کھینچ مارے

"آخر یہ جنگ ہوتی کیوں ہے؟" بڑی چچی نے جمیل کی طرف دیکھ کر پوچھی۔ ہر چیز میں جو دھیلے پیسے کا فرق پڑا تھا۔ اس سے کھانے کا معیار اور بھی گر گیا تھا۔

"ویسے تو آپ ابا کی بڑی حامی ہیں مگر کبھی کبھی کیوں لڑ پڑتی ہیں؟" جمیل بھیا نے اُلٹا سوال کر دیا۔

"اور تم اپنے ابا کے دشمن ہو!" بڑی چچی نے اُلٹی جھونک دی۔

"لیجیے بات صاف ہوگئی۔ جب بھی فائدے پر چوٹ پڑتی ہے یا ہوس میں آگ لگتی ہے تو جنگ ہوئی ہے۔" جمیل بھیا نے جواب دیا۔ وہ تو بالکل اس طرح بات کر رہے تھے۔ جیسے

بڑی چچی دو سال کی بچہ ہوں۔

"چل ہٹ۔ بڑا آیا یوں ہی بکواس کرتا ہے، کبھی ڈھنگ سے بات نہ کی، ایسی مذاق کی عادت پڑی ہے۔" بڑی چچی ہنسنے لگیں۔

"فائدے وائدے کی کیا بات ہے جمیل میاں، بس زمانے زمانے کی بات ہے۔ سب بدل گیا۔ کریمن بوا کیوں چپ رہتیں۔

"یہ سب تمھارے ابا اور عالیہ کے ابا جیسے لوگوں کے کام ہیں، یہی گڑبڑ کرتے ہیں جو جنگ ہوتی ہے۔ اب جو انگریزوں کے خلاف ہو رہے ہیں۔ تو جنگ نہ ہوگی؟" اماں نے بھی اپنی رائے ظاہر ہی کر دی۔ اور جمیل بھیا بڑے زور سے ہنسے — "آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں منجھلی چچی۔"

"سب کھا چکے ہوں تو مجھے بھی کھانا بھجوا دو۔ کریمن بوا۔" سنسان بیٹھک سے اسرار میاں کی مری ہوئی آواز آئی۔

بڑے چچا کی کہیں دعوت تھی اس لیے وہ اپنے مہمانوں کے ساتھ جا چکے تھے۔ اور اب اسرار میاں بین کی دو ٹکیوں سے روزہ کھول کر کھانے کے انتظار میں گھل رہے تھے۔

"ذرا صبر سے کام لیا کرو۔ اسرار میاں صاحب، کیا گھر والوں سے پہلے تمھاری کشتی سجا کر بھیج دیا کروں۔" کریمن بوا نے جھلا کر جواب دیا۔

اس اسرار میاں میں کتنا طنز چھپا تھا۔ کیسا مذاق قہقہے لگا رہا تھا۔ مگر جب بڑے چچا انھیں اسرار میاں کہتے تو کتنا خلوص اور کتنی برابری کا درجہ ہوتا جانے یہ لوگ سب اسرار میاں کے لیے کچھ سوچتے کیوں نہیں۔

"ہے، اسرار میاں اگر میرا بس چلے تو سب سے پہلے تمھاری کشتی سجا کر لے آؤں" اس نے دل ہی دل میں کہا اور کھانا ختم کر کے جلدی سے اوپر چلی گئی۔ جمیل بھیا اکیلے ماں

اُلٹی سیدھی نظروں سے دیکھتے جاتے، اُس کا جی ڈوب رہا تھا۔ سکون سے کھانا بھی نہ کھانے دیا۔

اپنے بستر پر آکر اس نے بڑے سکون سے کتابیں سمیٹ لیں اور تکیہ سرکا کر اس طرح لیٹ گئی کہ گلی کے بلب کی روشنی سیدھی کتاب پر پڑ رہی تھی۔

سیڑھیوں پر چاپ ہوئی تو اس نے پلٹ کر دیکھا۔ جمیل بھیا چلے آرہے تھے۔ "میں نے سوچا کہ آج تمھارا امتحان لے ڈالوں۔" وہ اس کے قریب بیٹھ گئے۔

"مجھے سب آتا ہے، آپ اپنا وقت نہ خراب کریں۔ فیل ہوگئی تو فکر نہیں اگلے سال پھر سہی۔" عالیہ نے بڑی رکھائی سے کہا۔ جمیل بھیا کی آنکھیں وہ فرفر سبق سنا رہی تھیں جو وہ پڑھانے آئے تھے۔

"تم کو پڑھا کر میرا وقت خراب ہوگا۔ عالیہ کچھ تو سوچو، ایسی باتیں کر کے تم مجھے کتنا پریشان کر دیتی ہو۔ اگر تم مجھ سے محبت نہیں کر سکتیں تو دکھ تو نہ دو۔"

"جمیل بھیا" آج تو وہ بھی انھیں پھاڑنے پر تُل گئی۔ "جب آپ ایسی باتیں کرتے ہیں تو آپ کو شرم نہیں آتی۔ کیا آپ چھمی کو بھول گئے، وہ آپ کے ساتھ آپ کے گھر رہتی ہے۔ مجھے سب معلوم ہے۔"

"چھمی!" جمیل بھیا نے گردن جھکالی۔ "تم کو معلوم ہے تو اچھا ہی ہے۔ مگر میں ٹھیک ٹھیک بتا دوں کہ مجھے چھمی سے کبھی کبھی ویسی محبت نہ تھی، میں اسے چاہتا ہوں مگر بہن کی طرح۔ تم کو معلوم ہے کہ ابا نے سیاست کے پیچھے اس گھر کو لٹا دیا۔ مگر میں اپنے کو لٹانے کے تیار نہ تھا۔ میں نے جانے کس طرح پڑھا کچھ اسرار میاں میرے لیے محنت کر لیتے اور کچھ دادی کے چوری چھپے کے روپے کام آتے۔ مگر ایف اے کرنے تک گھر کی حالت بگڑ چکی تھی یہ سارے اخراجات چھمی نے برداشت کیے میں کبھی نہیں بھولوں گا۔ مگر وہ مجھے غلط سمجھنے لگی اور میں ڈر کی وجہ سے اُسے سمجھا نہ سکا اور ——"

"اور پھر اچانک بی اے کرنے کے بعد آپ اس کا مذاق اڑا کر اسے سمجھانے لگے، ایں نا؟" جمیل بھیا پر ترس آنے کے باوجود وہ چوکی نہیں۔

"اب میں کیا کر سکتا ہوں؟" اُنھوں نے پوچھا۔

"اس سے شادی کر لیجیے جمیل بھیا، وہ آپ سے محبت کرتی ہو۔"

"شادی؟" وہ جیسے اچھل پڑے۔ "مجھے معلوم نہ تھا کہ تم مجھ سے اتنی نفرت کرتی ہو۔ عالیہ، میں نے تمھارے سوا کسی سے محبت نہیں کی، ادھر دیکھو عالیہ" اُنھوں نے اس کے دونوں ہاتھ تھام لیے اور پھر اس کی گود میں سر رکھ دیا۔

"میں آج ہی اپنے ماموں کے گھر جا سکتی ہوں۔ مجھے آپ جمیل صاحب قبلہ؟" دھونس جمانے کے لیے اور کس کا نام لیتی۔ سخت بے بسی کا عالم تھا۔

"تم کہاں جا سکتی ہو عالیہ بیگم۔ آج اماں، کریمن بوا اور منجھلی چچی سے کہہ رہی تھیں کہ تم ہمیشہ اسی گھر میں رہوگی۔"

"کون کہہ رہا تھا، کون ہوتے ہیں وہ سب کہنے والے؟" عالیہ نے دیوانوں کی طرح جمیل بھیا کو دھکا دے کر پلنگ سے اٹھا دیا۔ "مجھے کون مجبور کر سکتا ہے۔ میں تہمینہ آپا نہیں ہوں بڑے آئے سب لوگ۔"

جمیل بھیا نے حیرت سے اس کے لال بھبھوکا چہرے کو دیکھا اور پھر کھسیانے سے ہو کر چپکے سے مڑ گئے۔

جب وہ سیڑھیاں اُتر رہے تھے تو عالیہ بڑبڑا رہی تھی۔ "بےکار تک بند ہے بڑے چچا اپنی لائبریری کی کنجی تک نہیں دیتے۔"

(۲۳)

"کل عید تھی۔ آج جمیّی کے ابا کا منی آرڈر آیا تھا۔ جمیّی بڑے چاؤ سے بھاگ کر دستخط

کرنے آئی مگر جب پانچ روپیہ دیکھے تو اس کا منھ سرخ ہوگیا کوپن پر لکھا تھا کہ ان روپوں سے عید کے کپڑے بنوالے۔ چھمی نے پانچ کا نوٹ وصول کیا اور بیچ صحن میں کھڑے ہو کر نوٹ کے پرزے پرزے کر کے پھینک دیا۔ سب ہائیں ہائیں کرتے رہ گئے۔

"اتنے روپوں سے تو ہمارے ابا کی تیسری بیوی صاحبہ کا کفن تک نہ آئے گا۔ جانے لوگ بچے پیدا ہی کیوں کرتے ہیں، اس سے تو کتے کے پلے لیں۔" چھمی پلنگ پر بیٹھ گئی۔

"ارے چھمی تم پاگل ہوگئی ہو، پانچ روپے میں کتنا اچھا جوڑا بنتا۔" بڑی چچی نے ایک کر نوٹ کے پرزے اٹھالیے اور اس طرح ہتھیلی پر رکھنے لگیں جیسے جوڑ رہی ہوں۔

"آپ سے کس نے کہا تھا بولنے کو" وہ کھڑی ہوگئی۔ "اگر میرے جوڑے کی فکر ہوتی تو پہلے سے منی آرڈر نہ کرتے؟ اب کیا راتوں رات پریاں آکر میرے کپڑے سی دیں گی" چھمی پاؤں پٹختی اپنے کمرے میں چلی گئی۔

بڑی چچی نے پھونک مار کر نوٹ کے پرزے اڑا دیے اور چوکی پر بیٹھ کر پاندان کھول لیا۔

کریمن بوا ہتھیلی مانجھتے مانجھتے ہاتھ دھو کر اٹھیں اور نوٹ کے پرزے چن کر آنچل میں باندھ لیے پھر پتیلیوں کی کالک صاف کرنے بیٹھ گئیں۔ "اللہ مارے یہ کاغذ کس کام کے، وہ ہوتے تھے اپنے زمانے میں کھری چاندی کے روپے۔ سونے کی اشرفیاں اور گنیاں، کوئی انھیں پھاڑتا تو دیکھتے۔"

کریمن بوا بڑبڑاتی رہیں اور عالیہ دالان کی محراب کے بیچ میں بیٹھی چپ چاپ سنتی رہی۔ وہ بار بار چھمی کے کمرے کی طرف دیکھ رہی تھی جو اب خود کو ایذا پہنچانے کے لیے اتنے لق و دق کمرے میں تنہا پڑی جانے کیا کر رہی تھی۔

عالیہ کو تو اس کمرے سے ہول آتا۔ دادی کے انتقال کو کتنے بہت سے دن گزر گئے مگر اسے تو آج تک دادی کی منتظر نظریں کمرے میں ڈوبتی ابھرتی نظر آتیں۔ ان کی تیز تیز سانسیں اب بھی سائیں سائیں کرتی محسوس ہوتی۔ اب بھلا چھمی کو کس طرح منایا جائے۔ وہ سخت بیزار ہو رہی تھی سارے

ظفر چچا کی یہ بھتیجی آپ کی بیٹی نہیں؟ کیا بیوی کے ساتھ لاڈ بھی مر جاتی ہے

وہ اوپر کمرے میں چلی گئی اور اپنے کورس کی کتابیں اُلٹنے پلٹنے لگی۔ لاکھ سر مارا مگر پڑھنے میں جی نہ لگا۔ بس اسے بار بار بھتیجی کا خیال ستا رہا تھا بھتیجی خود کو ایذا پہنچا کر ختم کر لے گی۔

کھڑکی سے باہر اسکول کی عمارت کے پیچھے سُورج ڈوب رہا تھا۔ نیچے کی منزل میں اب بڑی گہماگہمی تھی روزہ افطارنے کا وقت قریب آ رہا تھا۔ عالیہ نے کتابیں سمیٹ کر تپائی پر رکھ دیں اور کھڑکی میں اکڑوں بیٹھ کر باہر دیکھنے لگی۔ گنڈیریوں والے کے سر پر رکھے ہوئے پیتل کے تھال میں پھولوں کے گجرے سجے ہوئے تھے۔ وہ گا گا کر گنڈیریاں بیچ رہا تھا۔ عالیہ کو اس کی اس قدر بھونڈی آواز بھی جانے کیوں بڑی اچھی لگ رہی تھی اور اس نے ایک دم محسوس کیا کہ وہ اُداس ہو رہی ہے۔ شامیں اُسے ہمیشہ اُداس کر دیتیں جانے کیسی نامعلوم سی کیفیت طاری ہو جاتی۔

وہ کھڑکی سے کود کر نیچے آگئی۔ روزہ کھلنے کا وقت اب بالکل قریب آگیا تھا۔ وہ کریمن بُوا کا ہاتھ بٹانے کے خیال سے نیچے گئی۔ کریمن بُوا پر اُسے کتنا رحم آتا۔ سارا دن چولھے کی کوکھ میں بیٹھے بیٹھے ان کی کمر ٹیڑھی ہو جاتی۔ اس نے کتنی ہی بار سوچا تھا کہ یہ کریمن بُوا یہاں سے بھاگ کیوں نہیں جاتیں۔ یہاں صرف پھٹے پرانے کپڑے اور روٹی اور حق نمک پر زندگی بتائے دیتی ہیں۔ اتنی مشقت پر تو انھیں کسی بھی گھر میں بس پندرہ روپے مہینے کی نوکری مل جائے گی۔ محنت کا پھل روپیہ ہی تو دیتا ہے، مگر شاید کریمن بوا نے تو کبھی خواب میں بھی ایسی باتیں نہ سوچی ہوں گی۔ کریمن بُوا کس قدر فخر سے کہتیں کہ میری ماں مالکن کے جہیز کے ساتھ آئی تھیں۔ مالکن کی خدمت کرتے کرتے خدا کو پیاری ہو گئیں اور اب خدا مجھے بھی بڑے میاں کے ہاتھوں سو ارت کرے۔

عالیہ کیسی حیران ہوتی ان باتوں پر، اس باتوں پر۔ اس نے کبھی کریمن بُوا کو اس گھر سے بیزار ہوتے نہ دیکھا۔ وہ کام سے کبھی نہ تھکتیں۔ بگڑے وقت کے ساتھ ان کا احترام کرنے کا طریقہ بھی نہ بگڑا۔ کیا مجال تھی جو کبھی اونچی آواز سے بات کی ہو۔

تخت پر دسترخوان بچھا کر افطاری کا سامان چُنا جا چکا تھا۔ بڑی چچی تلے ہوئے چنوں پر لیموں نچوڑ رہی تھیں۔ کریمن بُوا کو شاید روزہ لگ رہا تھا اس لیے نڈھال سی بیٹھی تھیں۔ بڑے چچا برآمدے میں بچھے ہوئے کھرّے پلنگ پر بیٹھے تھے۔ جیب سے نکلی ہوئی گھڑی سینے پر لٹک رہی تھی اور ان کے پاس بیٹھا ہوا شکیل بار بار جھک کر گھڑی دیکھ رہا تھا۔ کچھ دن سے جمیل بھیا نے اس پر سختی شروع کر دی تھی۔ اس لیے وہ گھر سے زیادہ دیر غائب نہ رہ پاتا۔

چھمّی اپنے کمرے کی دہلیز پر کھڑی تھی۔ پاجامے کی پھٹی ہوئی میلی گوٹ سے اس کے گٹے نظر آرہے تھے۔ جب اس نے عالیہ کو دیکھا تو آہستہ آہستہ چلتی ہوئی پاس آگئی اور بغیر کچھ بولے شکیل کے پاس بیٹھ گئی۔

باہر بیٹھک میں بڑے چچا کے کئی مہمان براجمان تھے۔ اور اسرار میاں بیٹھک کے دروازے سے کئی بار سر نکال کر جھانک چکے تھے۔

"کریمن بُوا ذرا جلدی سے باہر افطاری بھیج دو۔" روزہ کھلنے میں صرف دو منٹ رہ گئے ہیں۔ بڑے چچا نے سینے پر لٹکتی ہوئی گھڑی کو دیکھ کر کہا اور کریمن بُوا کمر ٹیڑھی کیے کیے اٹھیں اور تخت پر رکھی ہوئی دو پلیٹیں اُٹھا کر بیٹھک کی طرف لپکیں۔ اسرار میاں تو جیسے تاک ہی میں تھے جب مہمان ہوتے تو ان کے مزے ہو جاتے۔ ورنہ وہ غریب تو روزہ بھی اُس وقت کھولتے جب مکروہ ہو چکا ہوتا۔

اماں تخت پر ایک کونے میں اس طرح بیٹھی چھالیہ کاٹ رہی تھیں۔ جیسے افطاری پر پہرہ دے رہی ہوں۔ گھٹیا کام تو انھوں نے کبھی کیے ہی نہ تھے۔ بس یہی کہ کھانے پینے کی چیزوں کے حصے بخرے کر دیے یا اسرار میاں کا لایا ہوا سودا سُلف دیکھ کر اعتراضات کر دیے۔ شک و شبہ کے ساتھ حساب جوڑ لیا۔

قریب کی مسجد میں گولہ چھوٹا اور پھر نقارہ بجنے کی تیز آواز آنے لگی۔ تو اماں نے پلیٹوں میں رکھا ہوا سب کا حصہ بانٹنا شروع کر دیا۔ عالیہ نے تانبے کا منقش جگ اٹھا کر سب کے گلاسوں

میں لیموں کا شربت بھر دیا۔

چھمی کی پیٹ یوں ہی اڑی تھی۔ بس اس نے صرف شربت کے گھونٹ سے روزہ کھول لیا تھا

"چھمی کچھ تو کھالو، خالی پیٹ میں شربت لگے گا۔" بڑی چچی نے پلیٹ اٹھا کر اس کے ہاتھ میں دی تو اس نے بڑی چچی کا ہاتھ جھٹک دیا۔

"جب بھوک لگے گی تو خود ہی کھالے گی۔" اماں نے کہا مگر چھمی خاموش رہی

"اپنے نوٹ کا دکھ ہوگا نا۔ منجھلے چچا نے بھیجا تھا۔ انھوں نے پھاڑ کر پھینک دیا۔ ہمیں کو دے دیتیں۔" شکیل روزہ کھول کر ترنگ میں آ چکا تھا۔

"تم جیسے فقیروں کو نہیں دیتی۔" چھمی نے تڑ سے جواب دیا۔

"بھئی یہ تو سخت بدزبان لڑکی ہے۔" بڑے چچا نے گھور کر چھمی کو دیکھا۔ "کسی دن میں زبان کھینچ لوں گا۔"

"آپ کو تو میں اپنی زبان چھونے بھی نہ دوں گی۔ ہر وقت کافروں کی جماعت میں رہتے ہیں اور دنیا کو دکھانے کے لیے روزے رکھتے ہیں، بس حد ہو۔" چھمی نے نفرت سے ہونٹ سکوڑ لیے

"شرم نہیں آتی، کوئی اپنے بڑے چچا سے یوں بات کرتا ہے، کوئی لحاظ پاس نہیں۔" بڑی چچی نے فوراً ڈانٹا۔ مارے غصے کے منھ سرخ ہو رہا تھا یعنی ان کے سامنے چھمی ان کے شوہر سے اس طرح بات کرے۔

"میرے کوئی چچا وچا نہیں۔" چھمی نے سخت بے اعتنائی سے کہا۔

"بھئی تم چپ رہو کیوں اس جاہل کے منھ لگتی ہو۔" بڑے چچا گاؤ تکیے سے ٹک کر نیم دراز ہو گئے۔

"ہاں ہمارے کوئی منھ نہ لگے۔ ہم جاہل ہیں، سارا دن کی ڈگریاں کھا جائیں گے اور ڈکار بھی نہ لیں گے۔" چھمی پاؤں پٹختی اپنے کمرے میں چلی گئی۔

"چودھویں صدی ہے، گائے سینگ بدلے گی، اور قیامت آجائے گی۔" کریمن بوا کسی کو کچھ نہیں کہہ سکتی تھیں۔ اس لیے انھیں قیامت یاد آرہی تھی۔

"بھئی حد ہے بدزبانی کی، گھر میں سانڈ پالا ہے تم نے بھابھی!" اماں نے فوراً بڑی چچی پر حملہ کر دیا۔

"اب دیکھو نا دلھن، یہ تو اس کے باپ کا قصور ہے، اب کیا بنے گی یہ بچی۔" جب کوئی فہمی کے پیچھے پڑنے لگتا تو بڑی چچی فوراً آڑے آجاتیں۔

ذرا دیر کو سب خاموش ہوگئے۔ بڑے چچا نے آنکھیں موند لیں۔ شکیل اپنے اسکول کے کام میں جٹ گیا۔ کریمن بوا لالٹینوں کی چمنیاں صاف کرنے لگیں۔ مگر فہمی کیسے چپ رہتی کپڑے نہ بننے کا انتقام ابھی پورا نہیں ہوا تھا۔ وہ اپنے اندھیرے کمرے میں اپنی تک بندی کو لہک لہک کر گانے لگی۔

"کاشی میں تلسی ہوئی سب بکریاں چر گئیں گاندھی اٹھو ماتم کرو کاشی کی میا مرگئی"

بڑے چچا ایک دم چونک پڑے۔ "دیکھو اسے منع کرلو۔ باہر مولانا صاحب وغیرہ بیٹھے ہیں۔ سب کیا کہیں گے۔ ساری آواز باہر جائے گی۔" بڑے چچا غصہ سے سرخ ہو رہے تھے

"فہمی خدا کے لیے کچھ تو سوچا کر، باہر مہمان بیٹھے ہیں۔" بڑی چچی فہمی کے کمرے کی طرف لپکیں۔

"آپ کو کیا ہم اپنے کمرے میں گا رہے ہیں، یہ کمرہ ہمارا ہے جب آپ کے کمرے میں آکر گائیں تو منع کیجیے گا۔ باہر سنتے ہیں تو سنیں ذرا انھیں بھی تو معلوم ہو کہ یہاں سب کافر نہیں رہتے۔" وہ بڑے چچا کو چڑانے کے لیے پھر گانے لگی۔ "کاشی میں تلسی"

"ماری جاہل پاگل، میں کچھ بولتا نہیں اور تو آپے سے باہر ہے، اب گا اچھی طرح۔" بڑے چچا تیزی سے کمرے کی طرف لپکے۔ "بیٹھک کا دروازہ بند کردو شکیل!" انھوں نے مڑ کر کہا اور پھر

پورے جوش سے بڑے چچا نے چھمی کے منھ پر کئی تھپڑ جڑ دیے۔ شکیل دروازہ بند کرکے اس طرف کھڑا تھا۔ جیسے تماشہ دیکھ رہا ہو۔

"کاشی میں تلسی بوئی" چھمی زور سے چیخی۔ "میں گاؤں گی، گاؤں گی"

"چپ!" بڑے چچا نے اس کے منھ پر ہاتھ رکھ کر دبا دیا۔

بڑی چچی ہانپ ہانپ کر اپنے شوہر کو الگ ہٹا رہی تھیں۔ اور عالیہ کمرے کی دہلیز پر کھڑی آنکھیں پھاڑے بڑے چچا کو دیکھ رہی تھی۔ بڑے چچا آج کتنے عجیب طریقہ سے اس گھر میں اپنی اہمیت جتا رہے تھے اور وہ بھی صرف اس لیے کہ ان کے سیاسی عقائد کو ٹھیس لگ رہی تھی۔ اس وقت بڑے چچا اسے سیاسی ڈاکو معلوم ہو رہے تھے۔

"غضب خدا کا، جوان لڑکی پر ہاتھ اٹھاتے ہو بن ماں کی بچی پر ——" بڑی چچی کی آواز بھرا رہی تھی وہ بڑے چچا کو کھینچتی ہوئی کمرے سے باہر لے گئیں تو عالیہ دوڑ کر چھمی کے لپٹ گئی جو پرانی مسہری پر پڑی سسک سسک کر رو رہی تھی۔

"بجیا باہر بھاگ جائیے۔" روتے روتے چھمی ایک دم چپ ہو کر جیسے بڑے سکون سے چت لیٹ گئی۔

عالیہ باہر آ کر برآمدے کی محراب سے ٹک کر کھڑی ہو گئی۔

بڑی چچی زار و قطار رو رو کر چپکے چپکے کہہ رہی تھیں "اب اگر کبھی ہاتھ اٹھایا تو یاد رکھنا اپنی جان دے دوں گی۔ میرا تو کلیجہ پھٹ گیا، بن ماں کی بچی، میں نے اسے پالا ہے، میرے دل میں اس کی ممتا ہے" اس وقت انھیں یہ احساس ہی نہ رہا تھا کہ چھمی غریب تو خود سے پل گئی۔ بڑی چچی اسے پالنا تو چاہتی تھیں مگر ڈھیروں کاموں کے بلیے میں دبنے کے بعد انھیں اتنی فرصت ہی کہاں ملتی جو چھمی کو بھی اس کا پیدائشی حق دے سکتیں۔

میں تو خود گھر میں کسی سے نہیں بولتا مگر یہ لڑکی عذاب ہے، کل ہی ظفر میاں کو خط لکھتا ہوں

رکی سکا تھا اس کے دو بول پڑھا کر اس گھر سے یہ لعنت دُور کرو۔ بڑے چچا نے کروٹ لے کر آنکھیں بند کرلیں اور بڑی چچی آنسو پونچھ کر پان بنانے لگیں۔ اماں ایسے آرام سے بیٹھی تھیں جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔

ہنگامے کے بعد کا سناٹا چھایا ہوا تھا۔ بڑے چچا کا چہرہ تمتمایا ہوا تھا۔ وہ بار بار آنکھیں کھولتے اور بند کر لیتے۔ اسی وقت جمیل بھیا آگئے۔

"سب چُپ کیوں ہیں، کل عید ہی تھی نہ" جمیل بھیا نے عالیہ کی طرف دیکھا جو ادھ کھلی معلوم ہو رہی تھی۔

"پٹائی ہوئی ہے" شکیل نے جمیل بھیا کی طرف جھک کر کہا۔

"کس کی پٹائی ہوئی ہے۔؟"

"ارے کچھ بھی نہیں، وہی تمیجی کاشی میں تلسی بوئی کی رٹ لگا رہی تھی۔ باہر مہمان بیٹھے تھے۔ تمھارے ابا نے ایک تھپڑ لگا دیا۔" بڑی چچی نے بات کو ہلکا پھلکا بنا کر کہا اور پھر جلدی سے ایک پان کلے میں ٹھونس لیا۔

"مگر آپ نے اسے مارا کیوں۔ آپ اُسے سمجھا سکتے تھے، اس کی بد تمیزی کو روک سکتے تھے مگر مارنا کہاں کا انصاف ہے، وہ اپنے خیال کا اظہار کرتی ہے تو آپ چڑتے کیوں ہیں، جب آپ لوگوں کو نظریے کی آزادی نہیں دیتے تو اپنا ملک کس طرح آزاد کرائیں گے۔ اور اگر آپ کا ملک آزاد بھی ہوگیا تو اس آزادی کو کیسے برقرار رکھیں گے؟" جمیل بھیا نے بڑے جوش سے ایک ہی سانس میں اتنا کچھ کہہ ڈالا۔

"صاحبزادے تم گھریلو باتوں کو ملکی معاملات سے مت ٹکرایا کرو اور نہ زیادہ قابلیت جھاڑا کرو۔ تم کچھ نہیں جانتے۔" بڑے چچا نے سخت حقارت سے دیکھ کر پھر آنکھیں موند لیں۔

"آپ میری قابلیت کی بات نہ کیا کریں، آپ نے تو مجھے صرف پرائمری تک پڑھا کر گلی ڈنڈا کھیلنے کو چھوڑ دیا تھا اور پھر ملک آزاد کرانے لگے تھے جیسے میں تو آپ کے ملک کا باشندہ تھا ہی نہیں۔ جیسے مجھے تو اچھی زندگی گزارنے کا کوئی حق ہی نہ تھا میں نے بی اے نہیں کیا ہے لوہے کے چنے چبائے ہیں۔ ذرا آپ یہ تو بتائیں کہ جب آپ کو ایک گھر کا خیال نہیں تو اتنے بڑے ملک کے اتنے بہت سے گھروں کا کس طرح خیال کریں گے۔ یہ بھی خوب رہی کہ ایک گھر کو قربان کرکے دو گھروں کو بچا لو۔"

لاحول ولا کیا بے تکی تقریر کرکے دماغ چاٹ رہے ہو، میاں آزادی اور قربانی کا مفہوم تمہاری سمجھ سے بالا ہے۔ بس اپنی شاعری کرو اور داد پاؤ۔ رگ گل سے بلبل کے پر باندھو اور خوش رہو۔ بڑے چچا نے کروٹ لے لی۔

"جی بالکل درست ہے مگر۔" جمیل بھیا عالیہ کے سامنے کس طرح ہار مانتے وہ پھر کچھ کہنا چاہتے تھے کہ بڑی چچی ماتھا پیٹنے لگیں ۔۔۔ "ہائے میں کہتی ہوں کہ اس گھر کا آوا ہی بگڑ گیا ہے۔ حد ہے کہ بیٹے صاحب اپنے باپ سے بحث کر رہے ہیں۔ خدا کی قسم ایک دن زہر کھالوں گی۔" بڑی چچی پر رقت طاری ہونے لگی۔

"بھئی ٹھیک تو کہتا ہے جمیل۔" اماں نے جمیل بھیا کی حمایت کی مگر وہ تو چپ ہو کر بڑی بے بسی سے اپنی لوہے کی کرسی پر جا بیٹھے تھے اور ہاتھ مل مل کر کچھ سوچ رہے تھے۔

"دونوں وقت مل رہے ہیں اور یہ لڑائی جھگڑے، اس ملک کے دکھ نے تو سب کچھ تباہ کر دیا۔" کریمن بوا ہر طرف جلی ہوئی لالٹینیں رکھتی پھر رہی تھیں۔

"بڑے آئے ہمدردی کرنے والے۔" چھمی جھیا کے سے باہر نکل آئی اور بڑے چچا کے پلنگ کے پاس کھڑی ہو گئی۔ "ہمیں کون روک سکتا ہے ہاں۔ کاشی میں تلسی بوئی سب بکریاں چر گئیں۔" وہ زور سے چیخی۔

"لاحول ولا" ۔ بڑے چچا بے ساختہ ہنس پڑے ۔ "قطعی پاگل ہو۔"

بڑے چچا کے ہنستے ہی شکیل، اماں، بڑی چچی اور جمیل بھیا بھی ہنسنے لگے۔

"ہاں اب ٹھیک ہے" چھمی جمیل بھیا کی طرف بڑھی "تم ہنسو، تم سے کس نے کہا تھا کہ میری حمایت کرو۔ میں تم جیسوں کو منھ نہیں لگاتی ۔ اب میں اُن جیسوں سے محبت کروں گی۔ خواہ مخواہ بی اے کرنے کے لیے میرے سامنے ناک رگڑتے ہیں۔" چھمی پھر اپنے کمرے میں جانے کے لیے مڑ گئی۔ مگر کمرے کی دہلیز پر ہی بیٹھ رہی ۔ چند لمحوں کے لیے کیسا سناٹا چھا گیا۔

سب نے جیسے چونک کر جمیل بھیا کی طرف دیکھا، سب سے زیادہ گہری نظریں اماں کی تھیں مگر جمیل بھیا بڑی سنجیدگی سے نظریں جھکائے شکیل کی کتاب کے ورق اُلٹ رہے تھے۔

اور اس سناٹے میں بڑے چچا اس طرح کھنکار رہے تھے ۔ جیسے گلے میں کچھ پھنس گیا ہو۔

"آج اُنھوں نے اپنا پانچ روپے کا نوٹ بھی پھاڑ ڈالا ۔ مجھے دے دیتیں تو میں نوٹوں میں اپنے عید کے کپڑے سلوا لیتا ۔ اب میں ان کے خط نہیں لے جایا کروں گا۔" شکیل نے نوٹ پھٹنے کی اطلاع کے ساتھ ایک انکشاف کر دیا۔

"کہاں لے جاتے تھے خط؟" اماں نے گھبرا کر پوچھا۔

"تھانیدار کے بیٹے منظور صاحب کو دیتا تھا۔" شکیل نے چھمی کی طرف دیکھ کر بڑی معصومیت سے کہا۔

"ارے ارے۔" اماں اور بڑی چچی اس دھکے سے خائف ہو کر رہ گئیں۔ سب خاموش تھے ۔ کوئی کسی کی طرف نہ دیکھ رہا تھا۔ کتنی گہری خاموشی چھا گئی تھی۔

چھمی اُٹھی اور بڑی بے نیازی سے سب کے احساسات پر دراتی زینے پر ہو لی۔

عالیہ نظریں گڑو گڑو کر شکیل کو دیکھ رہی تھی۔ وہ ڈر رہی تھی کہ اب بڑے چچا چھمی کا بُرا حشر کریں گے۔ گیارہ بارہ سال کا شکیل اُسے پکا پاجی مرد نظر آ رہا تھا۔

بڑے چچا نے کروٹ بدلی تو عالیہ سر سے پاؤں تک کانپ گئی اسے ایسا محسوس ہوا کہ بڑے چچا چھمی پر حملہ کرنے کے لیے اُٹھ رہے ہیں، مگر بڑے چچا کروٹ لے کر گم سُم پڑے رہے تو اس نے اطمینان کا سانس لیا۔

"بھئی حد ہی بڑے بھیا" اماں نے بھر کر بڑے چچا کی طرف دیکھا۔ "کیا بیٹے کے ساتھ ساتھ اس گھر کی حیا بھی اُڑ گئی۔ پہلے بھی اس خاندان میں کیا کچھ نہیں ہو چکا جواب چھمی کمی پوری کرے گی۔ بار بار کہا اس کا بھرکس نکال دیجیے، تاکہ چپ چاپ لیٹے ہیں"

بڑے چچا اُٹھ کر بیٹھ گئے۔ "شکیل بیٹھک سے قلم کاغذ لے آؤ۔ میں ظفر میاں کو خط لکھ دوں وہ شادی کی اجازت دے دیں تو پھر کوئی لڑکا ڈھونڈھ لوں گا۔"

شکیل بھاگ کر قلم کاغذ لے آیا اور بڑے چچا خط لکھنے بیٹھ گئے۔

"کیا بڑے چچا اپنی بیٹی کی طرح چھمی کو بھی کہیں دھکیل دیں گے" عالیہ نے دُکھے دُکھے جی سے پوچھا اور آنسو ضبط کرنے کی کوشش میں منھ چھپا کر بیٹھ گئی۔

"میرا بس چلے تو ہڈیاں توڑ دوں۔ کیا مزے سے کھیلا وہ اور چلی گئی" اماں برابر بھیجے جا رہی تھیں۔

"واہ سب لوگ عید کا چاند دیکھنا تو بھول ہی گئے" شکیل ہڑبڑا کر پلنگ سے کودا اور اسی بہانے باہر بھاگ گیا۔ جمیل بھیا اس کی طرف سے بالکل بے خبر بیٹھے تھے۔

دروازہ زور سے کھڑکا۔ نجمہ پھوپھی کا تار تھا۔ وہ کل صبح پہنچ رہی تھیں۔

(۲۴)

نجمہ پھوپھی اپنے ڈھیروں سامان کے ساتھ آگئیں۔ وہ صرف بڑی چچی سے گلے ملیں اور سب کو نظر انداز کر دیا۔

عالیہ نے اپنے ہوش میں انھیں پہلی بار دیکھا تھا۔ نچی ہوئی بھویں پہلی تاریخ کے چاند کی طرح تیکھی ہو رہی تھیں، پٹے بکھرے ہوئے تھے اور میک اپ کے مارے اصلی صورت پہچانی نہ جاتی تھی جیسے سب کچھ بھول گئی تھی اور صبح صبح سنگھار کر کے اپنی اماں مرحومہ کے جہیز کا گلا ہوا جوڑا پہن کر بڑی خوبصورت لگ رہی تھی۔ نجمہ پھوپھی نے اسے لفٹ نہ دی تھی مگر وہ تھی کہ ان کے پاس گھسی جا رہی تھی۔ اُسے پتہ تھا نا کہ اماں اور بڑی چچی نجمہ پھوپھی سے کد رکھتی ہیں۔

جمیل بھیا اپنے لوہے کی کرسی پر خاموش بیٹھے تھے۔ وہی تو انھیں اسٹیشن لینے گئے تھے بڑے چچا تو صبح ہی صبح نماز کے بعد ادھر ہی سے کہیں چلے گئے تھے۔

"نجمہ پھوپھی، گھر میں اور لوگ بھی ہیں۔" جمیل نے انھیں یاد دلایا۔ شاید انھیں بُرا لگا تھا کہ انھوں نے عالیہ اور ان کی اماں سے ایک بات بھی نہ کی تھی۔

"دیکھ رہی ہوں بھئی، اتنے لمبے سفر سے تھک گئی ہوں، بڑے بھیا کہاں ہیں، وہی اپنی سیاست بگھارنے گئے ہوں گے کہیں — اور تم عالیہ، کچھ پڑھ رہی ہو کہ نہیں —؟"

"جی، ایف اے کا امتحان دینے والی ہوں۔" عالیہ نے دھیرے سے جواب دیا۔

"خوب! خوب!" نجمہ پھوپھی کے چہرے پر سخت ناگواری کے آثار تھے — "اور تم جمیل میاں کیا کر رہے ہو —؟" انھوں نے جمیل بھیا سے پوچھا۔

"بس بی اے کر کے بیٹھ رہا ہوں۔" جمیل بھیا نے جواب دیا۔

"واہ صرف بی اے سے کیا ہوتا ہے، آدمی جاہل ہی رہ جاتا ہے، تھوڑی تعلیم خطرناک ہوتی ہے۔ کرنا ہے تو ایم اے بی ٹی کرو۔ اب مجھے دیکھو جس کالج میں جاؤں ہاتھوں ہاتھ لی جاتی ہوں مگر ایم اے بھی کرو تو انگلش میں، اُردو ایم اے تو ہر جاہل کر سکتا ہے۔"

"درست ہے — میں بھی انگریزی ہی میں ایم اے کر لوں گا کبھی"

"مظہر بھیا نے بھی جیل جا کر جانے کون سا تیر مار لیا، بس حد ہو بھئی، کوئی خط وط بھی آیا

اُن کا کر نہیں ؟ یا شرمندگی کے مارے چُپ ہیں ؟ مجھے تو ایک خط بھی نہ لکھا۔" نجمہ پھوپھی اماں سے مخاطب تھیں مگر اماں اس طرح پان بناتی رہیں کہ جیسے کچھ سُنا ہی نہیں۔

عالیہ کا جی کُڑھ گیا یعنی ابا کی بہن بھی انھیں مجرم سمجھتی ہیں۔ اس کا جی چاہا کہ نجمہ پھوپھی کی زبان کاٹ لے ۔ اچھا ہی ہوا جو اماں نے ان کی بات کا جواب نہ دیا۔

"ارے بھئی چھمی تم نے بھی کچھ پڑھا لکھا یا نہیں ؟" چھمی کے انتہائی عشق کے اظہار پر انھوں نے اس کی پیٹھ پر تھپکی دی ۔ چھمی نے شرما کر سر جھکا لیا۔ جہالت کے احساس سے وہ سخت شرمندہ نظر آ رہی تھی ۔

"اب تو ہمیں نوکری کرنی ہے اس لیے بس کل صبح سے چھمی کو پڑھانا شروع کردوں گی۔ بے چاری جاہل ہی رہ گئی اور کسی نے توجہ نہ دی۔ اس خاندان کی یہی تو بدنصیبی ہے کہ لڑکی پڑھی لکھی نہ نکلی۔ نجمہ پھوپھی نے عالیہ کو بھی جاہلوں میں شمار کر لیا۔ " تو اب چھمی تم میری تولیہ صابن وغیرہ غسل خانے میں تو رکھ آؤ۔ ذرا ہاتھ مُنھ دھو کر عید منانے کی سوچیں ۔"

نجمہ پھوپھی اٹھیں تو چھمی پاجامے کی گوٹ سے الجھتی غسل خانے کی طرف بھاگی۔ آج بن ٹھن کر تو اس نے جمیل بھیا کو بالکل ہی نظرانداز کر دیا تھا۔ اس نے ایک بار بھی ان کی طرف نہ دیکھا جیسے ظاہر کر رہی ہو کہ یہ سنگھار تمھارے لیے نہیں، منظور کے لیے ہے ۔

کریمن بوا نے نجمہ پھوپھی کے لیے چائے بنا کر بڑے سلیقے سے تخت پر لگا دی اور پھر سویاں پکانے میں منہمک ہو گئیں۔ عید میں منوں کے حساب سویاں پکتی تھیں۔ مگر اب تو وہ دن نہیں رہ گئے ۔ اللہ بڑے میاں کو عقل دے، سب لٹا بیٹھے ۔" دو سیر سویوں کا زردہ پکاتے ہوئے کریمن بوا بڑبڑا رہی تھیں ۔

بڑی چچی بولیں: " تم بھی کپڑے بدل لو، عالیہ میری بچی، پھر محلے والیاں آنے جانے لگیں

گی تو دیکھ کر کیا کہیں گی۔ تم نے نئے کپڑے بھی تو نہیں سیئے "

"فرصت ہی نہیں ملی بڑی چچی!" اس نے آہستہ سے کہا۔ جمیل بھیا اسے بڑی شناکی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ "میں ابھی کپڑے بدل لوں گی۔"

وہ اپنے کمرے میں جانے کے لیے اُٹھ کھڑی ہوئی۔ نجمہ پھوپھی غسل خانے سے آکر جائے پینے بیٹھ گئی تھیں۔

زینوں پر چڑھتے ہوئے اس نے مُڑ کر دیکھا کہ شکیل پان کھائے اور گلے میں ہار ڈالے گھر میں داخل ہو رہا تھا مگر سامنے ہی جمیل بھیا کو دیکھ کر اس نے ہار گلے سے نوچ کر مٹھی میں چھپالیے۔

کپڑے تبدیل کرکے عالیہ چُپ چاپ اپنے کمرے میں بیٹھی رہی۔ جیل میں ابا کی عید کس طرح آئی ہوگی۔ اس کا جی دکھ رہا تھا۔

"مجھ سے عید نہیں ملو گی عالیہ؟" جمیل بھیا بھی اوپر آگئے۔

گلی میں بچوں اور سودے والوں نے کتنا اودھم دھار کھا تھا۔ اس نے کھڑکی کے پٹ بھیڑ دیئے۔

"پھر؟"

"پھر کیا، عید نہ ملو گی؟ آج کے دن تو دشمن بھی دشمن سے مل لیتا ہے پھر میں دشمن تو نہیں ہوں۔"

"میں تو آپ کو کچھ بھی نہیں سمجھتی۔"

"کچھ نہ سمجھنا تو انتہائی ہتک کی بات ہے۔"

"خدا کے لیے جمیل بھیا، یہ ٹیڑھی باتیں نہ کیا کیجیے۔ اچھے بھلے انسان بن جایئے مجھے محبت وحبت سے کوئی دلچسپی نہیں۔ جو مرد عورت ایک دوسرے کو محبت کر کے دھوکہ دیتے رہتے ہیں اس سے مجھے سخت چڑ ہے۔"

"کیا آبا کی لائبریری سے اس موضوع پر کوئی کتاب مل گئی ہے؟" جمیل بھیا نے بڑے طنز سے اس طرف دیکھا۔

ہاں اسی لائبریری سے مل گئی تھی جس کی کنجی آپ کو نہیں دی جاتی" وہ زور سے ہنسی۔ جمیل بھیا ایک دم سنجیدہ ہو رہے تھے۔

"عالیہ تم مجھے جتنا ٹھکرا رہی ہو، اتنا ہی تم سے قریب ہوتا جا رہا ہوں" اگر تم نے میرا ساتھ نہ دیا تو میں دنیا میں کچھ نہ کر سکوں گا" جمیل بھیا کا منھ تمتا گیا۔ ان کی آنکھوں سے دکھ چھلکا پڑتا۔ عالیہ نے سر جھکا دیا۔ اس وقت اسے محسوس ہو رہا تھا کہ اگر اسے جمیل کی نظروں میں پناہ نہ ملی تو جانے کیا ہو جائے گا۔

"اگر میں کسی اور سے محبت کروں تو آپ کیجیے گا۔

"سب جھوٹ، عورت مرد سے محبت کیے بغیر رہ ہی نہیں سکتی، روایت کے مطابق پیدا بھی مرد کی پسلی سے ہوئی ہے" جمیل بھیا جوش میں آ گئے۔

"اچھا اب میں سمجھی" وہ ایک دم ہنس پڑی "یہ مرد اسی لیے تو عورت کو خرید بیٹا ہے کہ اسے حضرت آدم کی پسلی کا درد یاد آتا ہوگا"

جمیل بھیا بھی اس کے ساتھ بے ساختہ ہنس پڑے مگر پھر سنجیدہ ہو گئے "تم میری ہو عالیہ، میں سچ کہتا ہوں کہ میں زندگی میں سب کچھ کر دوں گا، میں صفدر نہیں ہوں جس نے تہمینہ کو ختم کر دیا" پھر وہ جیسے سرگوشی کرنے لگے، "صفدر بمبئی میں ہے، وہ کمیونسٹ پارٹی کا ممبر ہے۔ آج کل جیل میں ہے"

عالیہ ذرا دیر کو بالکل چپ ہو گئی۔ وہ خالی خالی نظروں سے جمیل بھیا کا منھ تک رہی تھی۔ بیتی ہوئی باتیں کس تیزی سے انسان کے دماغ پر جھپٹ پڑتی ہیں۔

"عالیہ، میں اپنی ساری زندگی تمھارے لیے وقف کر دوں گا، یقین کرو عالیہ

کہ میں تمھارے لیے سب کچھ کروں گا۔ لیکن اگر تم نے زندگی کے سفر میں میرا ساتھ نہ دیا تو میں تھک جاؤں گا۔ میں تو کچھ بھی نہ کر سکوں گا۔" اس نے غور سے جمیل بھیا کی طرف دیکھا۔ ہی، کیسی رٹی رٹائی باتیں ہیں، وہی باتیں جو آپا تہمینہ کہانیوں میں پڑھ پڑھ کر مر گئیں۔ یہ عاشق حضرات کس قدر گھٹی صفت ہوتے ہیں۔ اس نے نظریں جھکا لیں بھیا کی آنکھوں کی گہرائی سے کیسا عجیب سا لگتا۔

"تو پھر جمیل بھیا آپ ہی تھک جائیے۔ چائے وغیرہ کا انتظام کرا دوں؟"

وہ زور سے ہنسی۔ بات مذاق میں اڑ جائے تو شاید جان چھوٹے مگر جمیل بھیا پر تو سنجیدگی کا بھوت نازل تھا۔

"دیکھو عالیہ —" وہ اس کی طرف جھپٹے اور پھر جم کر کھڑے ہو گئے۔

"یہ لیجیے اپنا خط، مسلم لیگ کے دفتر کا نیوز سے آیا ہے میں نے بڑی چچی کی نظریں بچا کر اڑا لیا ہے۔ ارے ہاں خواہ مخواہ بے چاری بڑی چچی اس صدمے سے بھی دوچار ہوتیں۔" عالیہ نے کاپی کے بیچ سے لفافہ نکال کر اس طرح جمیل کے ہاتھ میں تھما دیا۔ جیسے کہ بات ختم ہو گئی۔

جمیل بھیا مجرموں کی طرح سر جھکائے کھڑے تھے۔ جب بات کو اتنے دنوں سے چھپائے ہوئے تھے وہ در آکر سامنے آگئی تھی۔ "اچھا بھئی عید مبارک ہو، اماں سے خط کا ذکر نہ کرنا۔" وہ جلدی سے چلے گئے۔

تہمی، نجمہ پھوپھی کا بستر بند کھینچ کھینچ کر اوپر بڑے کمرے میں لا رہی تھی اور اس کی اماں مرحومہ کے بری کے جوڑے کی گوٹ پھٹ گئی تھی۔

"تہمی، نجمہ پھوپھی بھی تمھاری اس محبت کی کیا قدر کریں گی، تم مجھ سے کیوں روٹھ گئیں۔" عالیہ نے بڑے پیار سے تہمی کی طرف دیکھا اور پھر اپنے کمرے کے دروازے

بند کر کے کپڑے تبدیل کرنے لگی۔

عید گاہ سے واپس ہوتے ہوئے بچے گلی میں بڑے زور سے اودھم مچا رہے تھے۔

"کریمن بوا منجھلی بھابی اور بڑی بھابھی کو میرا سلام کہو اور عید مبارک بھی!"

سیڑھیوں کو طے کرتے ہوئے عالیہ نے اسرار میاں کا خوشی سے لرزتا ہوا پیغام سنا کیا جی چاہا کہ آج تو وہ بھی اسرار میاں کو سلام کر لے۔ عید کا دن ہی تو ہے۔

"صبر کرو، تم کو بھی سویاں بھجوا دوں گی" کریمن بوا نے اس طرح جواب دیا جیسے مذاق اڑا رہی ہوں۔

تجمہ پھوپھی، کریمن بوا کو تہواری کا ایک روپیہ دے رہی تھیں۔ انھوں نے عالیہ کی طرف دیکھا تو وہ الٹے پیروں اپنے کمرے کی طرف چل دی۔

(۲۵)

اتوار کا دن تھا۔ چائے پینے کے بعد بڑے چچا بیٹھک میں جانے کے بجائے اپنے بستر پر لیٹ گئے کچھ بجھے بجھے سے نظر آرہے تھے۔ عالیہ ان کے پاس جا بیٹھی بڑے چچا کو اس طرح دیکھ کر بے چین ہو گئی تھی۔ ہائے بے چارے بڑے چچا کوئی ان کی پروا نہیں کرتا۔ اگر بڑی چچی اس گھر میں نہ ہوتیں تو سب انہیں بھون کھاتے جو اٹھتا ہے اپنی تکلیفوں کا رونا روتا ہے کوئی ان کی تکلیفوں کو نہیں پوچھتا اور یہ ہیں کہ سب کچھ سہے جاتے ہیں اپنی سگی بہن کس طرح شرمندہ کرتی ہے۔ صرف اس لیے کہ اپنے کھانے کے روپے دینا پڑتے ہیں وہ یہ بھول گئیں کہ کبھی بڑے چچا کے روپیوں سے ہی تعلیم حاصل کی تھی۔

"پڑھائی کا کیا حال ہے بٹیا؟"

"ٹھیک ہے بڑے چچا، آپ کی طبیعت تو خراب نہیں ہے؟" وہ بھرے بھرے جی سے

بولتی چلی گئی "آپ اپنی صحت کی ذرا فکر نہیں کرتے۔ آپ کتنے کمزور ہو رہے ہیں، انسان کچھ اپنے لیے بھی تو کرتا ہے۔"

"ایں بٹیا میں تو ٹھیک ہوں۔" بڑے چچا حیران ہو کر اس کا منھ تک رہے تھے۔ ارے کیا کوئی میری فکر کرنے والا بھی ہے، کیا کسی کو مجھ سے بھی ہمدردی ہو سکتی ہے۔ میں تو اس گھر کا بھوت ہوں جو سب کچھ کھا گیا۔

بڑے چچا کی آنکھوں میں اس نے دکھ کی وہ مدھم سی تحریر پڑھ لی جسے چھپانے کے لیے وہ خواہ مخواہ ہنس رہے تھے۔

"واہ ری پگلی، مجھے آرام کی کیا ضرورت ہے، ہٹا کٹا ہوں، خواہ مخواہ فکر کرتی ہے۔ اچھا یہ بتاؤ کہ میری لائبریری سے کتابیں پڑھتی ہو کہ نہیں؟"

"پڑھتی تھی بڑے چچا مگر اب امتحان سر پر ہے نا اس لیے سب چھوڑ بیٹھی ہوں۔"

"تمھارے جیسے ذہن کی لڑکی کے لیے یہ کتابیں پڑھنا ضروری ہیں۔" بڑے چچا جب خوش ہوتے تو اپنی لائبریری کی کتابیں پڑھنے کی نصیحت شروع کر دیتے۔

"بڑے چچا جب آزادی مل جائے گی تو پھر کیا ہو گا؟" اس نے سخت بے وقوفی کے ساتھ بڑے چچا کی دل پسند باتیں چھیڑنا چاہیں۔ بڑے چچا کے سامنے اس نے سیاست سے نفرت کا کبھی اظہار نہ کیا تھا۔

"آزادی مل جائے تو پھر کیا رہ جاتا ہے۔ مرنا اور جینا دونوں آسان ہو جاتے ہیں دعا کرو کہ میں غلامی کے دور میں نہ مروں۔"

"بڑے چچا خدا آپ کو ہمیشہ سلامت رکھے۔" اس نے دل ہی دل میں دعا کی۔ گھروں کی اتنی ساری تباہیوں اور بربادیوں کو دیکھنے کے بعد بھی وہ اپنے ابا اور بڑے چچا سے نفرت نہ کر سکتی تھی۔

صدر دروازے کی زنجیر بڑے زور سے کھڑکی تو وہ ایک دم کھڑی ہو گئی۔

"ٹھہر جاؤ، تم مت جاؤ۔ میں دیکھ لوں گا۔" بڑے چچا باہر جا کر فوراً ہی پلٹ آئے

بڑی چچی برآمدے میں تخت پر بیٹھی ڈلیا سامنے رکھے پالک کے پتے چن رہی تھیں۔ بڑے چچا ان کے پاس جا کر کھڑے ہو گئے "میرا بلاوا آ گیا ہے۔" ان کی پیشانی پر ہلکی سی فکر تھی۔

"کہاں کا؟"

"انگریز بہادر کا، چار چھ مہینے بعد واپس آ جاؤں گا۔ تم میرا سامان ٹھیک کر دو۔"

عالیہ جہاں کھڑی تھی وہیں کھڑی رہ گئی۔ بڑی چچی ڈلیا پھینک کر ایک دم اٹھ پڑیں کر کمین لوا میلے برتنوں کے ڈھیر سے اٹھ پڑیں اور ٹکر ٹکر سب کا منہ تکنے لگیں۔

بڑی چچی کمرے میں جا کر بڑے چچا کے کپڑے بکس میں ٹھونسنے لگیں "بھلا ان سب حرامزادوں کا کیا بگاڑا ہے کسی نے جو روز روز پکڑتے ہیں، کیا کرلیں گے پکڑ کر، بھلا کسی کی زبان بھی بند کی ہے کسی نے۔" بڑی چچی اماں کی طرف دیکھ کر کہہ رہی تھیں، اور اماں اس نئی مصیبت پر چچا کو ڈرتے ڈرتے ہوئے تخت حقارت سے دیکھ رہی تھیں "بڑے بھیا اب تو توبہ کر لو۔ اپنا گھر اپنے بچے سنبھالو۔ سب تباہ ہو گیا۔" اماں نے نصیحت کی۔ مگر بڑے چچا کچھ نہ بولے۔ برآمدے کے کونے میں کھڑی ہوئی چھتری اٹھا کر ایک ہاتھ میں سوٹ کیس تھام لیا۔

"کیا ساری زندگی اسی لیے مصیبت جھیلی ہے۔ میں نے کہا کہ یہ توبہ کر لیں، بھلا کیا بُرا کام کرتے ہیں۔" بڑی چچی غصہ اور غم سے رو پڑیں۔

زنجیر پھر زور سے کھڑکی اور بڑے چچا دروازے کی طرف لپکے "اپنی بڑی چچی کو کھانا بٹیا۔ چھمی کے رشتے کی بات کی تھی۔ شاید ادھر سے جواب آئے تو فیصلہ کر لینا۔۔۔"

عالیہ کی پیٹھ پر ہاتھ پھیر کر وہ باہر نکل گئے۔

بڑے چچا باہر چلے گئے۔ کھلے دروازوں سے سناٹا دراتا ہوا اندر داخل ہو گیا وہ بیچ میں کھڑی رہ گئی۔ سامنے گلی میں بڑے چچا آٹھ آدمیوں کے ساتھ چلے جارہے تھے آٹھ آدمیوں میں بیچ میں گھرے ہوئے بڑے چچا اُسے بالکل دولھا سے نظر آرہے تھے پر یہ کیسی برات تھی کہ کلیجہ مسلا جاتا تھا۔

بڑی چچی نے پالک کی ٹوکری پھر اٹھالی تھی۔ کریمن بوا پھر برتنوں کے انبار تلے کھو گئی تھیں۔ نل سے بہتی ہوئی پتلی سی دھار کا سارا پانی کیاریوں میں جارہا تھا۔ گیندے کے پھول ہلکی سی ہوا میں ڈول رہے تھے۔ ارے اُس نے ایک پھول ہی بڑے چچا کو توڑ کر دے دیا ہوتا، بہار کا تحفہ مگر اب تو وقت گزر چکا تھا۔

بڑی چچی اپنے میاں کے جیل جانے کی تفصیلیں سُنا سُنا کر گرفتار کرنے والوں کے ہاتھ ٹوٹنے کی دعائیں کر رہی تھیں۔ عالیہ کو حیرت ہو رہی تھی کہ نہ تو بڑی چچی رو رہی تھیں نہ سینہ کوٹ رہی تھیں جبکہ اس کا دل ہلا جاتا تھا اُسے اپنے ابّا کی گرفتاری کا وقت یاد آرہا تھا۔ شاید بڑی چچی کو جیل اور پولیس کے مطالب ہی نہیں معلوم تھے۔ اُس کے بچپن کے حافظے میں ایک قصہ اب تک محفوظ تھا۔ ایک بار دینو کے کوارٹر میں پولیس کے دو سپاہی آگئے تھے۔ تو ان جھونپڑیوں کی پوری آبادی خوف سے گھروں میں چھپ گئی تھی۔ اور عورتیں ماتم کر کر کے رونے لگی تھیں۔ تو کیا بڑی چچی پر ذرا بھی دہشت طاری نہیں ہوئی ــــ کیا انھیں کچھ بھی نہیں معلوم۔

دھوپ اونچی اونچی دیواروں سے اُتر کر صحن میں رینگ گئی تھی۔

"مجھ پر ان قصوں کا کوئی اثر نہیں ہوتا بڑی بھابھی"۔ اماں بڑے جوش سے کہہ رہی تھیں۔ "اگر آپ بڑے بھیا کو ان کی حرکتوں سے روکتیں تو آج لاکھ کا گھر خاک نہ ہوتا۔ آپ تو ان کی حمایت کر کے ہمت بڑھاتی ہیں۔ بس حد ہو"

عالیہ صحن میں پڑی ہوئی لوہے کی کرسی پر اس طرح بیٹھ گئی جیسے اُسے کسی نے گرادیا ہو۔ بڑی چچی نے اماں کو کوئی جواب نہ دیا۔ وہ جانے کیا سوچ رہی تھیں۔

"دُلھن"، بڑی چچی دھیرے دھیرے بولنے لگیں "تم نے مظہر میاں پر سختی کی تھی تو کیا ہوا؟ کوئی کسی کے شوق پر پابندی نہیں لگا سکتا، سب جھیل گئی، اب اللہ کرے گا تو تمہیں سُکھ دے گا۔ تمھارے بڑے بھیا کے ساتھ تو ساری جوانی یوں ہی گزر گئی، انھیں تو اس کا بھی وقت نہ ملا کہ بیوی کو نظر بھر کر ہی دیکھ لیتے"۔۔۔ بڑی چچی ایک دم رو پڑیں تو اماں نے گھٹنوں میں سر چھپا لیا۔ "اللہ میاں تو ہی اس گھر کا بیڑا پار لگانے والا ہے۔ قربان تیری شان کے، تو جو چاہے کر دے" کریمن بوا نے آہ بھری۔

"کریمن بوا اگر ۔۔۔۔ بیٹھک سے اسرار میاں کی مری سی آواز آئی اور کریمن بوا بیچ ہی میں چیخ پڑیں۔۔۔ "ایک دن چائے نہ پیوگے تو کیا جان نکل جائے گی، بیچارے کو اپنی چائے کی پڑی ہے" کریمن بوا نے اسرار میاں کے حصے کی چائے نالی میں انڈیل دی "مردود، سبز قدم، یہ یہاں سے نہیں جائے گا"۔

"کریمن بوا۔ میں کہہ رہا تھا کہ اظہر بھائی کا سامان نہ گیا ہو تو میں پہنچا دوں؟"

"سب چلا گیا ہے" کریمن بوا چولھے کے پاس جھاڑو دینے لگیں۔

تو یہاں جو کچھ ہوتا ہے اس کے ذمے دار صرف اسرار میاں ہیں ۔۔ گناہوں کی برسات سے پیدا ہونے والے کیڑے جلدی سے کیوں نہیں مر جاتے؟ اسرار میاں اب تم دو بجے تک آرام سے بھوکے پھرو" عالیہ کرسی سے اُٹھ کر جلدی سے اوپر چلی گئی۔ اماں اور کریمن بوا کی موجودگی میں وہ اسرار میاں کے لیے چائے تو بنا نہیں سکتی تھی۔ پھر یہاں بیٹھنے کا کیا فائدہ۔

دن کے دو بج گئے۔ گلی کے اس پار ایک اُجڑے سے درخت سے اُلو کے بولنے

کی آواز آرہی تھی اور یہ آواز اس کے ذہن کے سناٹے کو اور بھی بڑھائے چلی جارہی تھی مگر ظالم بھوک تھی کہ دراتی چلی آرہی تھی۔ چاہے صدمے سے دماغ پھٹ جائے مگر بھوک نہیں رکتی۔ یعنی کہ آج وہ بڑے چچا کے جیل جانے کے غم میں صدمے سے جواب نہیں پا سکتی۔

وہ بستر سے اٹھ کر نیچے چلی گئی۔ تخت پر پلیٹیں لگی ہوئی تھیں۔ اماں نل کے پاس بیٹھی پان تھوک کر سرخ کلیاں کر رہی تھیں۔ اور بڑی چچی دسترخوان کے پاس بیٹھی جیسے اونگھ رہی تھیں۔ چھمی اور نجمہ پھپھی صبح سے بازار گئی تھیں اور اب تک واپس نہ آئی تھیں۔

"کھالو، سب کا کہاں تک انتظار کروں؟" بڑی چچی نے کہا اور وہ ان کے پاس بیٹھ گئی۔ اتنے میں جمیل بھیا بھی شکیل کو گھسیٹتے آگئے اور جیسے ہی گھر میں داخل ہوئے شکیل پر تھپڑ برسانے لگے۔

"یہ کچھ نہیں پڑھتا لکھتا، سارا دن آوارہ گھومتا رہتا ہے، میں نے ابھی ابھی اسے سخت لفنگوں کے ساتھ گھومتے دیکھا ہے۔"

"اور مارو بدذات کو۔" بڑی چچی نے جل کر کہا — "جب یہ حالت ہے تو اس گھر کو کون سنبھالے گا۔"

"انھیں کی کتابوں سے تو پڑھتا ہوں۔" شکیل بھیا کے وار روکنے کے لیے ادھر ادھر بچ رہا تھا۔ اور عالیہ کو نجات طلب نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

"بس بھی کیجیے جمیل بھیا۔ اب نہیں گھومے گا۔" عالیہ نے سفارش کی تو جمیل بھیا الگ ہو گئے اور نل کے نیچے ہاتھ دھونے لگے۔

"ارے اسے کیوں بچاتی ہو، یہ کبھی نہیں ٹھیک ہوگا۔ میں یوں ہی تڑپ تڑپ کر مر جاؤں گی، ان کا ٹھکانہ تو جیل میں ہے۔"

"کیا آپا بھر گئے ۔؟ جمیل بھیا ہاتھ دھونا بھول گئے ۔

" اور نہیں تو کیا آج نو بجے کے قریب پولیس آ کر لے گئی، اللہ رے توبہ یہ لیڈر!" اماں نے فوراً جواب دیا۔

"خوب" جمیل بھیا پھر ہاتھ دھونے لگے ۔ " یہ کانگریسی لیڈر تو جیسے جیل جائے بغیر کچھ کر ہی نہیں سکتے، خالص ہندوؤں کی جماعت کے لیے اتنی قربانیاں دے کر جانے انھیں کیا مل جائے گا، کس قدر ہندو طبیعت ہے ان صاحب کی بھی ۔ کیسے کیسے ہندو مسلم فساد ہوئے مگر ان پہ ذرا بھی اثر نہیں ہوتا ۔

" شرم نہیں آتی اپنے باپ کو ہندو کہتے، وہ ہندو تھے تم کہاں سے مسلمان پیدا ہو گئے ۔" بڑی چچی مارے غصّے کے آپے سے باہر ہو گئیں ۔ یعنی اُن کے شوہر کو ہندو کہا جائے جبکہ اُنھوں نے ہندوؤں کے تہواروں میں آئے ہوئے حصّوں کو چکھا تک نہیں کبھی ۔ بھلا ایسی عورت کا شوہر ہندو ہو سکتا ہے ۔؟

" اچھا بھئی کٹّر ہندو نہ سہی مسلمان سہی مگر ___" جمیل بھیا کھسیا کر ہنسنے لگے کھانا یوں ہی پڑا ٹھنڈا ہو رہا تھا۔

" اب تم سنبھالو نا گھر کو، کیا میری موت کا انتظار کر رہے ہو ؟ بڑی چچی کھانا بھی چین سے نہ کھا رہی تھیں ۔

" میں ___ میں ___ بس اب یہی سوچ رہا ہوں ۔" ___ جمیل بھیا بوکھلا گئے تھے

" دو چار دن میں لاہور جا رہا ہوں ۔ وہاں سے آ کر نوکری کر لوں گا ۔" وہ کچھ سوچ سوچ کر کھا رہے تھے ۔ ذرا دیر کے لیے خاموشی چھا گئی ۔

نجمہ پھوپھی اور تہمی بنڈلوں سے لدی پھندی اندر داخل ہوئیں تو خاموشی ٹوٹ گئی

" ارے شکیل ذرا تانگے والے کو یہ روپیہ تڑا کر دے دو ۔" نجمہ پھوپھی نے پرس سے

روپیہ نکال کر اس کی طرف بڑھا دیا۔ شکیل اب تک صحن میں لوہے کی کرسی پر بیٹھا تھا۔ اسے کھانے کے لیے بھی کسی نے نہ پوچھا تھا۔

"پہلے ہاتھ دھو کر کھانا کھالو۔" بڑی چچی نے کہا، مگر نجمہ پھوپھی تو بنڈل کھول کر سب کو دکھانے کے لیے بے تاب تھیں۔

"حد ہی بھئی ہر کپڑے پر دام بڑھا دیے ہیں۔ اب بھلا کوئی بتائے کہ یہ ریشمی کپڑا کیا گوروں کے کفن کے لیے جاتا ہے۔" نجمہ پھوپھی نے داد طلب نظروں سے سب کی طرف دیکھا مگر یہاں تو سب اپنے غم میں مبتلا تھے۔ چھمی کو ان کی بات پر بڑے زور سے ہنسی آئی۔

"تم لاہور جا کر کیا کرو گے؟ کیا وہاں ملازمت کرنے کا ارادہ ہے؟" بڑی چچی نے جمیل بھیا کی طرف دیکھا۔

وہاں مسلم لیگ کا ایک زبردست جلسہ ہے۔ ذرا اس میں شریک ہوں گا۔" جمیل بھیا جانے کیا سوچتے ہوئے بولے۔

"کیا کہا؟ جلسہ؟" بڑی چچی اپنی جگہ سے اچھل پڑیں ——"ارے تو بھی؟ تجھ پر بھی جوگ سا دھا تھا تو اب تو بھی؟" بڑی چچی دیوانوں کی طرح جمیل بھیا کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ اُن کی آنکھوں سے ایسا معلوم ہوتا کہ اچھل کر گردن دبوچ لیں گی۔

"بس حد ہی، اس گھر کا خدا ہی مالک ہے۔" اماں نے بھی ہاتھ کا نوالہ رکھ دیا تھا۔ عالیہ کو ٹھکانے لگانے کی اُمید نے شاید دم توڑ دیا تھا اور جمیل بھیا تھے کہ چپ چاپ بیٹھے گردن جھکائے کھائے جا رہے تھے۔ تیر جو کمان سے نکل چکا تھا۔

"اگر تو نے اس سیاست بازی کو اپنایا تو جان دے دوں گی، زہر کھالوں گی ایک ایک دن، میری زندگی تڑپ تڑپ کر گزری ہے، اب میں آرام کرنا چاہتی ہوں۔ مجھے سب کچھ چاہیے بادلے، تو سیاست میں نہیں جا سکتا۔" بڑی چچی کی دیوانگی کم ہو رہی

تھی۔ جمیل بھیا کھانا وانا بھول کر اپنی اماں کے گلے میں ہاتھ ڈالے ہنس رہے تھے "بھئی بس بھی کیجئے اماں"۔

تمہ پھوپھی نے کپڑے کے بنڈل سمیٹ کر پلنگ پر ڈال دیئے کوئی کمبخت دیکھتا ہی نہ تھا جان جل کر رہ گئی۔ کرمن بوا نے سینی میں کھانا لگا کر ان کے سامنے رکھ دیا تھا، وہ ہیں بنڈلوں کے ڈھیر کے پاس بیٹھ کر بڑی بے دلی سے کھانے لگیں۔ ان کے چہرے سے نفرت برس رہی تھی مگر چھمی آج بڑی مدت کے بعد جمیل بھیا کو بڑے اشتیاق سے دیکھ رہی تھی۔

"میں نہ کہتی تھی کہ ہر مسلمان مسلم لیگ میں شامل ہو، مسلم لیگ زندہ باد" چھمی نے نعرہ بھی لگا دیا۔ مگر اس وقت کسی نے اس کی خوشی اور نعرے کی پرواہ نہ کی، بڑی چچی جو ہاتھوں سے نکلی جا رہی تھیں۔ رو رو کر ان کی آنکھیں سرخ پڑ گئی تھیں۔ جمیل بھیا انھیں تھپک رہے تھے۔ پانی پلا رہے تھے مگر ان کی دیوانی آنکھوں میں ذرا بھی ٹھہراؤ نہ پیدا ہو رہا تھا۔

عالیہ حیران نظروں سے بڑی چچی کو دیکھ رہی تھی — ارے کیا یہ وہی بڑی چچی ہیں جنھوں نے اتنے برسوں تک بڑے چچا کی سیاسی زندگی میں ساتھ دیا تھا، بڑے چچا کی حمایت میں سب سے آگے رہیں، لیکن جب اپنا جی جلا تو انھیں جلی کٹی سنا ڈالیں مگر کسی دوسرے کی زبان سے ایک لفظ نہ سنا۔ بڑے چچا جو بھی کرتے رہے اسے اپنے سر سے گزارتی رہیں اور آج صبح تک وہ جھکنے کے بجائے گرفتار کرنے والوں کو کوس رہی تھیں۔ کیا یہ صبر و ضبط اس لیے تھا کہ انھوں نے اپنی ساری امیدیں اور آرزوئیں جمیل بھیا کے گلے میں ہار بنا کر ڈال دی تھیں۔

"اماں اب آپ دیکھیے گا کہ میں کیسی ٹھاٹ کی نوکری کرتا ہوں، آپ کو چاندی کے تخت پر بٹھا دوں گا۔ اور بس آپ کا یہی کام ہو گا کہ پان کھاتی رہیں اور میری دلھن آپ کے پان دھو دھو کر لاتی رہے" جمیل بھیا خدمت کے وعدوں کے ساتھ ساتھ

اپنی اماں کو منانے کی کوشش کر رہی تھے مگر جانے کیوں عالیہ نے بلقیس کے نام پتان کی آنکھوں کو اپنی طرف اٹھتا دیکھ کر نظریں جھکالی تھیں۔

"واہ کوئی یوں نوکری مل جاتی ہو۔ چاندی کے تخت ایسے نہیں ملا کرتے نہ کوئی ٹریننگ، نہ انگریزی میں ایم اے" نجمہ پھوپھی بڑی حقارت سے بولیں۔ اور چھمی کو پھر ہنسی آنے لگی۔ وہ نجمہ پھوپھی کے ساتھ بڑے فخر سے کھانا کھا رہی تھی۔

"ہونہہ! مجھے تو مارتے تھے، اب دیکھئے کہ بیٹا بھی لیگی ہو گیا" چھمی کو بڑے چچا کی مار یاد آگئی تھی۔ اس وقت کسی کو بڑی چچی سے ہمدردی نہ ہو رہی تھی۔

"ایم اے پاس کچھ نہیں جانتے اماں، مجھے بڑی ٹھاٹ کی نوکری ملے گی۔" جمیل بھیا نے سے بھا ار کیا۔

نجمہ پھوپھی بلبلا اٹھیں۔ "خدا کی شان ہو۔ اب ایسے ایسے لوگ ایم اے پاس کو جاہل کہیں۔ سچ ہو تھوڑی تعلیم خطرناک ہوتی ہو۔ اب ایسے لوگ بے چارے سیاست میں حصہ نہ لیں تو کیا کریں، بڑے بھیا نے بھی تو تیر مار لیا۔ اور بے چارے کرتے بھی کیا۔" نجمہ پھوپھی نے کھانا چھوڑ کر بنڈل سمیٹ لیے۔ وہ جانے کتنی بار بڑے چچا پر طنز کر چکی تھیں۔ اُن کے عربی و فارسی داں ہونے کی پھبتی اڑا ئی تھی۔ کئی بار کہا تھا کہ جب کوئی ڈگری لینے کی صلاحیت نہ ہو تو لوگ عربی و فارسی پڑھتے ہیں۔

"نجمہ پھوپھی۔ آج صبح نو بجے آپ کے بڑے بھیا جیل جا چکے ہیں۔ جب وہ آئیں تو آپ اُن سے پوچھ لیجئے گا کہ مارا ہوا تیر کہاں لگا ہو" جمیل بھیا نے مڑ کر نجمہ پھوپھی کو دیکھا۔ ایک لمحے کو اُن کا رنگ فق ہو گیا تھا ۔۔۔ "ہے بڑے بھیا پھر جیل گئے!" نجمہ پھوپھی نے سر تھام لیا ۔۔۔ "اس گھر کی کیسی بدنامی ہو رہی ہو، جسے دیکھو جیل کاٹ رہا ہو۔"

جمیل بھیا کی تھپکیاں بڑی چچی کو پُرسکون کر چکی تھیں اور اب وہ ٹکر ٹکر نجمہ پھوپھی اور جمیل کو لڑتے دیکھ رہی تھیں۔

اب کسی نے بھی نجمہ پھوپھی کو جواب تک نہ دیا وہ اپنے کپڑوں کے بنڈل چھمی پر لدوا کر اوپر اپنے کمرے میں چلی گئیں۔

نجمہ پھوپھی کے جاتے ہی ایک بار پھر سناٹا چھا گیا۔ عالیہ نے دیکھا کہ جمیل بھیا اپنی اماں سے لپٹ کر بیٹھے ہوئے بڑے اچھے لگ رہے تھے اور شکیل اب تک تانگے کا کرایہ ادا کر کے نہ آیا تھا۔ عالیہ اس سناٹے میں چپکے سے اُٹھ کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔

(۲۶)

جمیل بھیا کو لاہور گئے چوتھا دن تھا۔ ان کے جانے سے پہلے بڑی چچی کی حالت دیکھنے کے قابل تھی بس جیسے ان سے کچھ بن نہ پڑ رہا تھا کہ اس مُصیبت سے کس طرح خود کو بچا لیں۔ پر جمیل بھیا چلے گئے اور وہ کچھ بھی نہ کر سکیں۔

جمیل بھیا کے جاتے ہی اخباروں کی خبریں آنکھیں دکھانے لگیں۔ — اخبار فروش کلیجہ پھاڑ پھاڑ کر چیختے رہتے — "پولیس اور خاکساروں کے درمیان تصادم" "کتنے ہی خاکسار گولیوں کا نشانہ بن گئے" "مُسلم لیگ کے اجلاس میں رکاوٹ کا امکان"

بڑی چچی اخبار فروشوں کی آوازوں پر دل تھام تھام لیتیں۔ عالیہ اُنھیں ہر طرح تسلی دیتی، کھلا کر سمجھاتی کہ جمیل بھیا تو لیگی ہیں، خاکسار نہیں، مگر بڑی چچی کسی طرح چین نہ لیتیں۔ چھمی بھی ایک دم خاموش رہنے لگی تھی وہ صبح صبح جا کر محلے سے اخبار مانگ لاتی اور بڑے انہماک سے پڑھ کر گھنٹوں اپنے بستر پر اوندھی پڑی رہتی۔ جب سے بڑے چچا گئے تھے اخبار آنا بھی تو بند ہو گیا تھا۔ اب اس مد پر خرچ کرنے کے لیے کس کے پاس پیسے رکھے تھے۔ چھمی اگر

مہربانی کے موڈ میں ہوتی تو مانگا ہوا اخبار پڑھنے کو دے دیتی اور بڑی چچی موٹے شیشوں کی عینک لگا کر پڑھا کرتیں۔ ویسے تو وہ کسی کو بھی اخبار چھونے تک نہ دیتی۔ "میلا ہو جائیگا"

ان دنوں چھمی نے پڑھنا لکھنا بھی چھوڑ دیا تھا۔ نجمہ پھوپھی لاکھ کہیں مگر وہ کتاب اٹھا کر نہ دیتی۔ ورنہ اس سے پہلے تو یہ حال تھا کہ نجمہ پھوپھی کا دیا ہوا سبق گھنٹوں ٹہل ٹہل کر یاد کیا کرتی اور عالیہ کو اس طرح دیکھتی جیسے کہہ رہی ہو کہ تم سے آگے نکل کر نہ دکھاؤں تو میرا نام چھمی نہیں۔

کالج سے آنے کے بعد نجمہ پھوپھی بڑے نخرے سے چند لفظ پڑھاتیں اور بدلے میں اسے ڈھیروں کام بتا دیتیں۔ سبق یاد کرنے کے بعد بس یہی کام رہ جاتے۔ ابھی کپڑوں پر استری ہو رہی ہے۔ تو ابھی سینڈلیں پالش سے چمکائی جا رہی ہیں۔ ڈوپٹے رنگ کر اتنے باریک چنتی کہ انگوٹھے اور انگلیاں چھل کر رہ جاتیں۔

"میں اب ایک لونڈا کام کے لیے رکھ لوں گی۔" نجمہ پھوپھی اسے اتنا کام کرتے دیکھ کر اوپری دل سے کہا کرتیں۔

"لیجیے بھلا میں کس کام کے لیے ہوں، واہ اب میں آپ سے نہیں بولوں گی۔" چھمی مارے خلوص کے نجمہ پھوپھی کے لپٹ جاتی۔ اور وہ نہال ہو کر اسی وقت کوئی اور کام بتا دیتیں۔

چھ دن گزر گئے، جمیل بھیا نہیں آئے۔ بڑی چچی تڑپی تڑپی پھر رہی تھیں۔ اور اماں اُن کی اس بے چینی پر پھر پھر اٹھتیں۔ "ارے بڑے بھابی کیوں اپنی جان جلاتی ہیں، بیٹا بھی باپ کے نقش قدم پر چلے گا۔ بس اب اس سے بھی ہاتھ دھو لیں۔"

"مجھے تو اس کے سائے میں بیٹھنا ہے۔" بڑی چچی سے زندگی کی چلچلاتی دھوپ اب برداشت نہ ہو رہی تھی۔

بڑی چچی نے یہ چھ راتیں چھالیہ کاٹ کر گزاری تھیں۔ جب برآمدے سے کھٹر کھٹر کی آوازیں

اوازیں

آئیں تو عالیہ اپنے بستر پر کروٹیں بدلنے لگتی۔ رات کا سناٹا اور گہرا ہو جاتا۔ بڑی چچی کے لیے اس کا دل بھرنے لگتا — یہ سب کیا ہے۔ یہ کون سا جذبہ ہے جو اپنے پیاروں کو دکھ کی بھٹی میں جلنے کے لیے چھوڑ دیتا ہے۔

قرارداد لاہور منظور ہو گئی۔ آٹھ کروڑ مسلمان اپنا حق لے کر رہیں گے۔ صبح تڑکے تڑکے اخبار فروش چیختا بھاگتا جا رہا تھا۔ اخبار والے، اخبار والے — کھڑکیوں اور دروازوں سے جھانک جھانک کر لوگ آوازیں دے رہے تھے۔ آج اخبار خریدنے میں سارا محلہ پیش پیش تھا۔

عالیہ نے کھڑکی سے جھانک کر دیکھا۔ صبح کیسی نکھری ہوئی تھی۔ کان میں جنیو ڈالے اور ہاتھ میں پیتل کی چمچماتی لٹیا پکڑے کوئی شخص پڑوس کے نل پر نہانے کے لیے جا رہا تھا — اب یہ نہا کر پوجا کرے گا۔ ہاتھ جوڑ کر بھگوان کی مورتی کے سامنے جھک جائے گا۔ یہ ہندو پوجا کرتے ہوئے اتنے خوبصورت کیوں معلوم ہوتے ہیں۔ اسے ایک دم کسم دیدی یاد آ گئیں۔

نچلی منزل میں جانے کے لیے جب اس نے نجمہ پھوپھی کے کمرے کو طے کیا تو کسی نے اس کی طرف دیکھا تک نہیں۔ نجمہ پھوپھی کالج جانے کی تیاریوں میں مصروف تھیں اور چھمی باندیوں کی طرح انھیں چیزیں اٹھا اٹھا کر دے رہی تھی۔ "اللہ کرے نجمہ پھوپھی تم کوڑھی ہو جاؤ چھمی" — عالیہ نے دل ہی دل میں دعا کی۔ چند لفظ پڑھنے کا کتنا سخت معاوضہ ادا کرنا پڑتا ہے۔ غریب چھمی کو۔

چائے تیار تھی۔ کریمن بوا گرم گرم گھی چپڑی روٹیاں توے سے اتار رہی تھیں وہ اماں اور بڑی چچی کے پاس تخت پر بیٹھ کر چائے پینے لگیں۔ شکیل اب تک سو رہا تھا۔ اسکول جانے سے چند منٹ پہلے اٹھتا، وہ بھی ادھر کچھ دنوں سے بڑی چچی اسے زبردستی اٹھا دیتیں۔ ابھی چائے ختم بھی نہ ہوئی تھی کہ صدر دروازے کی زنجیر زور سے کھڑکی۔

اور کریمن بوا بو کھلا کر ادھر لپکیں۔

جمیل بھیا کا تار تھا۔ وہ خیریت سے تھے۔ اور جلد آ رہے تھے۔ بڑی چچی نے تار کے کاغذ کو جھپٹ کر پاندان کی کلھیا میں چھپا لیا اور مارے خوشی کے چائے کی دوسری پیالی بنا لی۔

اس وقت کریمن بوا کسی ان دیکھی طاقت کی بلائیں لے کر ڈھیر سے روٹیاں پکانے لگیں۔ اس گھر کی ہر خوشی اور ہر غم ان کا اپنا تھا۔

عالیہ ناشتہ کر کے بیٹھک میں آ گئی۔ جب سے بڑے چچا جیل گئے تھے۔ اس نے پہلی بار بیٹھک میں قدم رکھا تھا۔ میز کرسیوں اور کتابوں کے شیشے دھول میں اٹے ہوئے تھے گاندھی جی کی بڑی سی تصویر دھندلی ہو رہی تھی۔ تخت کی چاندنی اور گاؤ تکیوں کے غلاف میلے ہو گئے تھے۔ اسرار میاں کی بیڑیوں کے جلے ہوئے ٹکڑے ہر طرف بکھرے ہوئے تھے۔ ساری کاہلی کمر میں کھونس کر وہ کمرہ صاف کرنے لگی اور پھر فرش جھاڑ کر وہ گاؤ تکیے سے ٹک کر تخت پر بیٹھ گئی۔ اسے بار بار ایسا لگتا جیسے ابھی ابھی دروازہ کھلے گا اور بڑے چچا اندر آ جائیں گے

بڑے چچا نے جیل خانے کے بعد اسے خط بھی لکھا تھا۔ کہ وہ بہت خوش ہیں سرکار کی روٹیوں میں ایسا مزہ ہے جیسے کریمن بوا کے ہاتھ کے پراٹھے کھا رہا ہوں۔ بڑے چچا کا مزے دار خط یاد کرنے کے باوجود اسے بیٹھک بڑی سونی لگ رہی تھی۔ وہ الماری سے ایک کتاب نکال کر باہر آ گئی۔

نجمہ پھوپھی کالج جا چکی تھیں اور چھمی آج کئی دن بعد اپنا سبق یاد کرتے ہوئے پورے صحن میں ٹہل رہی تھی۔

بڑی چچی نے دن جھک کر گزارا۔ رات کو بڑی چچی کے مرد تنے کی آواز جلدی سے سو گئی عالیہ بڑے سکون سے رات کے ایک بجے تک پڑھا کی۔

(۲۷)

امتحان ختم ہو گئے تھے۔ اب وہ کچھ عرصے چھٹی منانا چاہتی تھی۔ وہ کس قدر تھک گئی تھی۔ نصاب کی کتابوں سے جی اکتا گیا تھا۔ اب وہ راتوں اور دوپہروں کو بڑے چچا کی لائبریری سے لائی ہوئی کتابیں پڑھتی رہتی۔ سارا دن گرم گرم لو چلتی رہتی اور اسکول کے درختوں سے الّو کے بولنے کی آواز آتی رہتی۔ اتنی لمبی لمبی دوپہریں کاٹے نہ کٹتیں۔ تپتا ہوا ماحول کسی طرح چین نہ لینے دیتا۔ اگر بڑے چچا کی کتابیں نہ ہوتیں تو اتنی لمبی دوپہریں پلنگ پر پڑ کر ادھر اُدھر کی باتیں سوچتے سوچتے دماغ خراب ہو جاتا۔ ادھر امتحان کے نتیجے کی فکر۔ اسے تو فیل ہونے کے خیال ہی سے خوف آتا۔ اگر وہ فیل ہو گئی تو تجمہ پھوپھی کو اس کی دائمی جہالت پر ذرا بھی شک نہ رہے گا۔ ویسے بھی وہ اس پر اکثر پھبتی کستی رہتیں۔ "گھر بیٹھ کر امتحان دینا بھی کس قدر آسان بنا لیا ہے لوگوں نے۔ ہم جیسوں نے تو کالجوں اور یونیورسٹیوں میں جھک ماری تھی۔ بس ایک پندرہ روپیہ مہینے کا ماسٹر رکھ کر کام کی باتیں رٹ لیں۔"

ان ساری شاندار باتوں کے بعد بھی وہ چھمی کو گھر میں پڑھائے چلی جاتی تھیں۔ اور کئی مہینے گزارنے کے بعد بھی چھمی کا دوسرا قاعدہ ختم نہ ہوا تھا۔

جمیل بھیا نے ان دنوں معمولی سی ملازمت کر لی تھی۔ وہ سارے کے سارے روپے بڑی چچی کے ہاتھ پر رکھ دیتے تھے اور گھر میں بس جینے کا سہارا ہو گیا تھا۔ جمیل بھیا کا باقی وقت مسلم لیگ کی حمایت میں گزر جاتا۔ عالیہ تو اب اُن کے سائے سے بھی بھاگتی مگر وہ سایہ تو لمبا ہوتا جا رہا تھا۔ محبت کی دھوپ چڑھتی جا رہی تھی۔

آج ابا کا خط آیا تھا۔ اُنھوں نے لکھا تھا کہ وہ اس کے نتیجے کے منتظر ہیں۔ اسے چھپے

اور ہٹے کٹے ہیں۔ کبھی کبھی اختلاج کی تکلیف ہو جاتی ہے۔ جو شاید گرمی کی وجہ سے شروع ہوئی ہے۔ جیل کا ڈاکٹر دوا دے رہا ہے جس سے قطعی فائدہ ہو گیا ہے۔

اماں اس خط کو سُن کر ذرا دیر کے لیے فکر مند ہو گئی تھیں اور وہ تو اپنے کمرے کے دروازے بند کر کے بڑی دیر تک روتی رہی تھیں۔ وہ تو اپنے ابا کی بیماری کا تصور بھی نہ کر سکتی تھی نہ کہ وہ حقیقتاً بیمار پڑ جائیں اور وہ بھی اس کی نظروں سے دُور۔ جیل کی کوٹھری میں۔

جون کے آخری دن کس قدر گرم تھے۔ دوپہروں میں غضب کا سناٹا چھایا رہتا۔ سودے والوں تک کی آواز نہ سُنائی دیتی مگر تہمی پر ان دوپہروں میں پڑھنے کا بھوت سوار تھا۔ جیسے اس نے اپنے جی میں ٹھان لی کہ یا تو پڑھ لکھ کر فاضل بن گئے یا پھر جاہل ہی رہ گئے۔ اتنی محنت کے بعد بھی اس کا دوسرا قاعدہ ختم ہونے کو نہ آ رہا تھا۔ لکھتے لکھتے اُنگلیاں بندھ جاتیں۔ سارا سبق ایک ہی سانس میں اٹکے بغیر سُنا دیتی۔ پر نجمہ پھوپھی کے اعتراض ختم نہ ہوتے۔

اس وقت بھی تہمی کو جماہیوں پر جماہیاں آ رہی تھیں مگر وہ ڈھیٹ بنی زور زور سے سبق یاد کیے چلی جا رہی تھی۔ کبھی کبھی وقت ادھ بھڑے دروازوں سے عالیہ کی طرف بھی دیکھ لیتی۔

پڑھتے پڑھتے تھک کر تہمی نے کتاب میز پر رکھ دی ۔۔ "نجمہ پھوپھی سارا قاعدہ تو یاد ہو گیا ہے۔ اب تیسرا شروع کرا دیں نا؟"

"ابھی نہیں، میں جس طرح پڑھاؤں۔ اسی طرح پڑھو، یہ اُردو نہیں کہ ہر جاہل پڑھ لیتا ہے، یہ انگریزی ہے۔" نجمہ پھوپھی ایک دم برہم ہو گئیں۔

"اب ہمیں نہیں پڑھنا ہے۔ یہ قاعدہ کبھی نہ ختم ہوگا، ہونہہ! بڑی آئیں پڑھانے

والی۔ جیسے ہم بے وقوف ہیں۔ اپنے کام کے لیے نوکر رکھ لیجئے نجمہ پھوپھی ہمیں تو اللہ میاں نے پیدا ہی جاہل کیا ہو"۔۔۔۔ چھمی نے کتاب کاپی اور قلم اوپر اچھال دیئے۔

"اری کیا بکواس کرتی ہو چھمی، بھئی جاہلوں کو پڑھانا کتنا مشکل کام ہوتا ہے۔ اگر پہلا دوسرا قاعدہ کمزور رہ گیا تو پھر آگے پڑھنا مشکل ہوتا ہی جلدی سے پڑھو، کل تمھارے لیے تیسرا قاعدہ لے آؤں گی"۔۔۔۔ نجمہ پھوپھی گڑبڑا کر اٹھ بیٹھیں۔ بے دام کا غلام ہاتھوں سے نکلا جا رہا تھا۔

"بس بھئی اگر ہم قابل ہو گئے تو آپ جاہل کسے کہیں گی"۔ چھمی پاؤں پٹختی نیچے چلی گئی۔

"حد ہی بھئی، اس خاندان کی جہالت کبھی نہ جائے گی، کوئی تو اس لائق نہیں کہ بات کر کے جی خوش ہو"۔۔۔۔ نجمہ پھوپھی اپنے آپ سے کہہ رہی تھیں۔

عالیہ نے اٹھ کر اپنے کمرے کے دروازے زور سے بند کر لیے۔۔۔۔ "ارے نجمہ پھوپھی میں آپ کو خوب جانتی ہوں"۔ وہ بڑبڑائی اور پھر کتاب لے کر لیٹ گئی۔

آج تو ایک دم آسمان پر بادل چھانے لگے تھے کھڑکی سے ہوا کا ایک بھیگا بھیگا ٹھنڈا جھونکا آیا تو وہ کتاب رکھ کر سو گئی۔ گرمیوں کی ساری دوپہریں جاگ کر اور تڑپ کر گزاری تھیں۔ یہاں تو چھتوں پر کپڑے اور چٹائیوں کا پنکھا بھی نہ لگا تھا۔ پھر یہاں کون سے نوکر لگے تھے جو ساری دوپہر پنکھا کھینچتے۔

چھمی نے جب سے پڑھنا شروع کیا تھا اپنے اصلی روپ میں آ گئی تھی۔ گھر میں طوفان برپا رہتا۔ ہر ایک سے لڑتی یا پھر برقعہ اوڑھ کر محلے میں غائب رہتی۔ سب اس سے نالاں تھے مگر اماں کو تو اس کی صورت سے نفرت ہو گئی تھی۔۔۔۔ "اللہ جانے شادی کا پیغام دینے والے کہاں مر گئے"!

"چھمی میں تم کو پڑھایا کروں؟" —— بہت دن بعد عالیہ آج اس کے کمرے میں گئی تھی۔ دادی کی سونی سہری پر نظر پڑتے ہی اس کا جی دکھنے لگا تھا۔

"جمیل صاحب آپ سے ناراض ہو جائیں گے پھر" چھمی نے زور سے قہقہہ لگایا

"خدا کے واسطے چھمی ایسی باتیں تو نہ کیا کرو"

"اچھا تو پھر ہٹایئے، میں خود ان کا منحوس نام لینا پسند نہیں کرتی، منظور کے سامنے اب کوئی نہیں جچتا، اللہ قسم کتنا چاہتا ہے مجھے" —چھمی نے بڑے مزے سے آنکھیں بند کر لیں۔

چھمی کوئی مرد کسی سے محبت نہیں کرتا، اپنے آپ سے محبت کرنا - واہ اچھی پٹی پڑھوائی ہے جمیل بھیا یوں ہی آپ کے پیچھے دیوانے پھرتے ہیں۔ یہی تو ایک محبت ہوتی ہے دنیا میں، جب تک چلے چلے نہ چلے تو کھیل ختم پیسہ ہضم۔ لو اپنے آپ سے محبت کرو۔ کچھ دن بعد آپ کہیں گی کہ اپنے ابا اور ان تمام گھر والوں سے محبت کر دیں باپ بھائیوں وغیرہ کی محبت کچھ نہیں ہوتی۔ سب الو کے الو ہوتے ہیں، کمینے "

عالیہ چھمی کو لا علاج سمجھ کر ادھر ادھر دیکھنے لگی، کمرے میں انور کمال پاشا کی ایک تصویر اور اس سال کے کیلنڈر کا اضافہ ہو گیا تھا۔ جانے کس نے دیئے تھے اسے۔

وہ چپکے سے اٹھ کر چلی آئی۔ چھمی نے اسے بیٹھنے کو بھی نہ کہا۔ ابھی وہ صحن طے کر رہی تھی کہ تجمہ پھوپھی چھمی کے کمرے میں جاتے ہوئے اس سے ٹکراتے ٹکراتے بچیں بحنت بوکھلائی ہوئی تھیں —— ہو! اتنی پڑھی لکھی عورت کے کام سے ایک جاہل لڑکی نے ہاتھ اٹھا لیا —— عالیہ کو ہنسی آ رہی تھی۔

چھمی نہ مانتی تھی نہ منی۔ اور اب تجمہ پھوپھی خود ہی کا نکھ کر اپنی ساریوں پر استری کرتیں۔ کوئلے دہکاتے ہوئے آنکھوں میں آنسو آجاتے اور سینڈلوں پر پالش کرتے ہوئے قسمت کی ساری لکیریں سیاہ پڑ جاتیں۔

منجھلے بھیا کو تو فکر ہی نہیں کہ کسی کے ساتھ اپنی اس بیٹی کے دو بول پڑھا دیں۔

کون سے ایم اے تلاش کرنے ہیں، جیسے بڑے بھیا نے اپنی ساجدہ کی شادی کردی۔ از نجمہ پھوپھی کا بس چلتا تو چھمی کی ایسی جگہ شادی کرتیں کہ پانی تک نصیب نہ ہوتا کسی کربلا میں ڈھکیل دیتیں کم بخت کو تاکہ پیاسی مر جاتی۔

"پہلے آپ کیجیے اپنی شادی نجمہ پھوپھی، بڑھاپا آرہا ہے" جواب میں چھمی ان کا کلیجہ نوچنے کی کوشش کرتی۔

"ہونہہ! مجھے کس بات کی کمی ہے۔ لوگ ناک رگڑیں گے۔ تجھے تو پندرہ روپے مہینے کا سپاہی بھی نہ جڑے گا۔"

چھمی انھیں جلانے کے لیے ہی ہی ہنستی "— سپاہی مل گیا تو میں سب سے پہلے نجمہ پھوپھی کو پکڑوا دوں گی۔"

نجمہ پھوپھی تنتنا کر اپنے کمرے میں بھاگتیں، بھلا چھمی جیسی جاہل کے منھ کون لگتا۔

گھر میں طوفان اٹھانے کے بعد چھمی برقع اوڑھ کر محلّے میں گھروں گھروں گھومنے کے لیے نکل جاتی اور جب واپس آتی تو سخت جوش میں بھری ہوتی۔ سارے قصّے فرفر سنانے شروع کر دیتی۔ "— وہ کلّو کی اماں کا لڑکا تھا نا، وہ مزدوروں کی کسی جماعت میں چلا گیا" "وہ جماعت انڈر گراؤنڈ رہتی ہو۔ اللہ وہ زمین کے اندر کیسے رہتے ہوں گے؟" چھمی کو نجمہ پھوپھی سے سُن کر اور پڑھ کر ابتدائی انگریزی کے چند مطلب تو معلوم ہو ہی گئے تھے۔ جن کا وہ لفظ بہ لفظ ترجمہ کر لیتی۔

"ہے بے چاری بوہ" بڑی چچی ٹھنڈی آہ بھرتیں — "جبھی تو اس بٹیا کی ماری نے بہت دنوں سے ادھر آنا بھی چھوڑ دیا، ویسے تو سال چھ مہینے میں نکل ہی آتی تھیں۔"

"اور بڑی چچی، وہ محمود کی ماں بے چاری بلک بلک کر رو رہی تھی۔ محمود جنگ پر چلا گیا کیا سوجھی حرام زادے کو کہ ماں کا بھی خیال نہ کیا۔"

"ہے ہے کیا حال ہو گا دُکھیا کا؟"

"ہوں ، خبریں سُناتے سُناتے جانے کیوں چھمّی کا موڈ خراب ہو جاتا" میں نے کہا کہ وہ آپ کا لاڈلا پوت جو رات دن آوارہ گھومتا رہتا ہے ۔ اُسے کیوں نہیں بھیج دیتیں جنگ پر۔ کمینہ کل جانے کس وقت میرے تکیے کے نیچے سے اکنّی نکال لے گیا ۔ ہاتھ ٹوٹیں اس شکیل کے خدا کرے ۔"

بڑی چچی ایسے صبر سے ہونٹ سی لیتیں کہ حیرت ہوتی ۔ ایک وہی تو تھیں جو چھمّی کی ہر اچھی بُری بات برداشت کر لیتیں ۔ کبھی روٹھ کر نہ بیٹھیں ۔ چھمّی جب اُن سے جواب نہ پاتی تو مُنھ لپیٹ کر اپنے کمرے میں پڑ رہتی ۔

(۲۸)

آج گھر میں سخت دُھوم مچی تھی ۔ اسرار میاں نے تڑکے چائے کا مطالبہ کر دیا تھا مگر آج کریمن بُوا نے بھی ان کی اس سخت ناجائز حرکت پر معاف کر دیا تھا ۔ آج زندگی میں شاید پہلی بار کریمن بُوا نے انھیں سب سے پہلے چائے کی کشتی پکڑا دی تھی ۔

آج صبح آٹھ بجے بڑے چچا الٰہ آباد جیل سے رہا ہو کر اسٹیشن پہنچ رہے تھے ۔ بڑی چچی کا چہرہ کھلا ہوا تھا ۔ وہ سوتے ہوئے جمیل بھیا کو بار بار جھنجھوڑ رہی تھیں کہ وہ بھی باپ کے استقبال کے لیے اسٹیشن پر جائیں مگر جمیل بھیا نے ہر بار کوئی بہانہ تراش دیا — وہ رات بادلوں کی گرج کی وجہ سے سوئے نہیں — سر میں درد ہے — آج تو دفتر بھی نہیں جا سکتے — کچھ حرارت بھی ہو رہی ہے ۔

اور جب اسٹیشن جانے کا وقت نکل گیا تو جمیل بھیا بڑی تیزی سے اُٹھے چائے پی اور فٹافٹ کپڑے تبدیل کر کے دفتر بھاگ لیے ۔

"شکیل میرے بھیا ، چار ہار تو لا دو بڑے چچا کے لیے" — عالیہ نے شکیل کے

ہاتھ پر روٹی رکھ دی۔ وہ کچھ خوش نظر نہ آ رہا تھا باپ سے کوئی واسطہ ہو نہ ہو پھر بھی پابندی تو محسوس ہوتی ہے۔

"ایک بیس پچیس بار میرے لیے بھی لینے آنا کہیں سے مانگ کر۔" شکیل بڑا تیر مار کر آ رہا ہے بڑے چچا۔ "عالیہ تھی کھی ہنسنے لگی اور اوپر کمرے کی دہلیز کے کنڈے میں پڑے رسّے کی جھولے پر جا بیٹھی اور لمبے لمبے پینگ لینے لگی، یہ جھولا ساون میں پڑا تھا جسے آج تک نہ اُتارا گیا۔

"بنولتے ڈولا رکھ دے مسافر آئی ساون کی بہار رے" — وہ سب کو چڑا کر گا رہی تھی۔

شکیل باہر چلا گیا۔ کریمن بوا بڑے چچا پر سے خیرات کرنے کے لیے ڈلیا میں سوا سیر گیہوں تول کر رکھ رہی تھیں۔

اوہ! بڑے چچا سے کس طرح ملا جائے گا۔ عالیہ سوچ رہی تھی اور مارے خوشی کے اُن کا دل بلیوں اُچھل رہا تھا۔ وہ جلدی سے اپنے کمرے میں آ گئی اور کھڑکی میں بیٹھ کر گلی میں جھانکنے لگی۔ وقت کتنی سُستی سے گزر رہا تھا۔ ایک دن ابا بھی اسی طرح آ جائیں گے۔ اس نے سوچا اور غم کی ایک ٹیس اس کے کلیجے کو چھلنی کر گئی — مگر ابھی تو پانچ سال باقی ہیں۔

سامنے سے ایک سادھو بابا جسم پر بھبھوت ملے، سُرخ لنگوٹ باندھے اور ہاتھ میں چمٹا پکڑے آ رہے تھے۔ "بھگشا دے بچہ تیری سب مُرادیں پوری ہوں گی۔" سادھو بابا دروازے پر کھڑے تھے۔

"معاف کرو بابا۔" کریمن بوا نے باہر جھانک کر جلدی سے سر اندر کر لیا — "یہ بھی نہیں دیکھتے کہ کس کا گھر ہے۔ ننگ دھڑنگ سامنے آ کر کھڑے ہو جاتے ہیں کمبخت" — کریمن بوا نے زور سے کہا اور ہنسنے لگیں۔

"ارے کریمن بوا! بڑے چچا کی خیرات تو کسی ہندو ہی کو دو" — چھمی نے فوراً مشورہ دیا اور پھر گنگنانے لگی — "اپنے محل میں گڑیاں کھیلت تھی، تیاں نے بھیجے کہار رے"

"اللہ بھلا کرے" دوسرا فقیر جو موٹے موٹے موتیوں کی مالا گلے میں ڈالے دروازے پر آکھڑا ہوا۔ کریمن بوا نے ہاتھ بڑھا کر آدھا پکڑا دیا — "تھوڑی دیر بعد آکر خیرات بھی لے جانا باباجی" کریمن بوا نے کہا — جب سے جنگ چھڑی تھی فقیر کتنے بڑھتے جا رہے تھے۔

پکی گلی میں تانگے کے پہیوں کی کھڑکھڑاہٹ ہو رہی تھی۔ بڑے چچا آرہے تھے۔ سب سے آگے وہ ہار پہنے بیٹھے تھے ان کے ساتھ اسرار میاں اور پیچھے اُن کے دو تین دوست تھے۔

"بڑے چچا آگئے ہیں" — عالیہ نے چیخ کر سارے گھر کو اطلاع دی کریمن بوا گیہوں کی ڈلیا اٹھا کر دروازے پر کھڑی ہو گئیں۔ چھمی جھولے سے اتر کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔

شکیل کہاں ہے اللہ، اب وہ بڑے چچا کو کیا پہنائے گی — آج پہلی دفعہ اُسے شکیل کی بے ایمانی پر غصہ آرہا تھا۔

بڑے چچا نے اندر قدم رکھا تو سب سے پہلے کریمن بوا نے گیہوں کی ڈلیا ان کے ہاتھ سے چھوا دی اور پھر دعائیں دینے لگیں۔ بڑے چچا نے سب کی طرف ایک فاتح کی نظروں سے دیکھا۔

"تم اب بی اے کی تیاری کر رہی ہو؟" بڑے چچا نے پوچھا۔

"جی بڑے چچا۔ میں نے شکیل سے ہار منگائے تھے، وہ اب تک نہیں آیا، میں بھی تو آپ کو ہار پہناتی"

"ہاں، چھمی شکیل نظر نہیں آرہا ہے، کیا ہو وہ؟" بڑے چچا نے جیسے رسماً پوچھا۔ وہ چوکی پر بیٹھ کر جوتے اتار رہے تھے، کریمن بوا نے تانبے کے بڑے سے لوٹے میں منھ دھونے کے لیے پانی بھر کر رکھ دیا تھا۔ عالیہ انھیں چپکے چپکے دیکھ رہی تھی۔ بڑے چچا اب کتنے کمزور نظر آرہے تھے۔ توند گھٹ گئی تھی۔ اور داڑھی میں آدھے سے زیادہ سفید بال نظر آرہے تھے۔

"تمہارا بیٹا رات کو بارہ بجے آتا ہے یا پھر ساری رات غائب رہتا ہے۔ نہ پڑھتا ہے نہ لکھتا ہے تم کو کیا : تم تو جیل جاکر سب بھول جاتے ہو۔ اور یہاں رہتے ہو تو بھی بے گانے لگتے ہو۔ اور تو اور تمہارا بیٹا بھی مسلم لیگ کے جلسوں میں شریک ہونے لگا ہے ـــ بڑی چچی نے ساری شکایتیں کر کے ہی سانس لی۔ بڑے چچا تو سخت شرمندہ نظر آرہے تھے۔ یا آخری بات پر ایک دم چونک پڑے "خوب! خوب! صاحبزادے مسلم لیگی بن گئے۔ ؟" بڑے چچا ایک ذرا تکیہ سر کے نیچے رکھ کر لیٹ گئے رات بھر کے سفر نے نڈھال کر دیا تھا۔

"اب اپنے صاحبزادے کا کچھ بگاڑ لیجئے تو جانوں" چھمی نے اپنے کمرے سے نکل کر دہیں دیوار سے پیٹھ لگا کر کھڑی ہو گئی تھی۔ سلام کیے بغیر ہی اس نے بڑے چچا سے انتقام لینا شروع کر دیا عالیہ کا جی چاہا کہ اس وقت وہ بڑے چچا کو کہیں چھپا دے " اس وقت تو کوئی ان سے کچھ نہ کہے۔ اس وقت تو کوئی بُرائی باتیں نہ یاد دلائے۔ کتنی مدت بعد وہ اپنے گھر آئے ہیں جیل نے انھیں توڑ دیا۔ انھیں آرام کی ضرورت ہے۔

ارے تم کیسی ہو چھمی ؟" بڑے چچا نے مسکرا کر اس کے طنز کو سہہ لیا اور چھمی جیسے جلبلا کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔

"ارے بڑے بھیا اس چھمی چڑیل کے رشتے والے کہاں مر گئے، پورے چار مہینے ہو گئے انتظار کرتے کرتے ؟" اماں ان کے پاس بیٹھ کر پیالی میں چائے انڈیلنے لگیں۔

ابھی چائے کی پیالی ختم بھی نہ ہونے پائی تھی کہ بیٹھک کے دروازے کی زنجیر کھڑکنے لگی بڑے چچا باہر دوستوں میں چلے گئے اور عالیہ ان کے پاس بیٹھ کر ان سے ڈھیر سی باتیں کرنے کو ترستی رہ گئی۔ وہ تو ان سے اس وقت بہت سی باتیں کرنا چاہتی تھی۔ ان کے اس کارنامے کو سراہنا چاہتی تھی۔ گھر میں سب ان کے لیے بے چین تھے مگر کسی نے بھی ان کا سواگت نہ کیا۔ جمیل بھیا بیزار ہو گئے۔ چھمی تیر چلا گئی۔ اور بڑی چچی شکایتوں کا دفتر

کھول کر بیٹھ گئیں۔ ہی بڑے چچا آپ کو کیا مل گیا ہی۔ یہ سب کر کے۔ یہ جو آپ نے ملک کا جوگ سادھ لیا ہی تو تباہیوں اور بربادیوں کے سوا کیا ہی اور۔ گھر والے تک عزت نہیں کرتے۔ کاش اس وقت تو سب خوش ہو کر انھیں سراہتے۔ کاش۔۔

(۲۹)

شام سے کُہر پڑنا شروع ہو گئی تھی۔ کریمن بُوا کھانا پکاتے ہوئے چولھے کی کوکھ میں سمائی جا رہی تھیں۔ عالیہ کو ڈر لگنے لگا کہ کہیں اُن کے کپڑوں میں آگ نہ لگ جائے، ذرا میں بھُن کر راکھ ہو جائیں گی، دیے بھی اب انھیں سُجھائی کم دیتا ہی ــــ "کریمن بوا ذرا چولھے سے سرک کر بیٹھو" عالیہ نے بے چین ہو کر کہا۔

"ایک جان رہ گئی ہی وہ بھی جل جائے، نصیب تو پہلے ہی جل چکے، عالیہ بٹیا اسی گھر میں جاڑوں کے دنوں میں اپنے ہاتھوں سے منوں لکڑی پھونک دیتے تھے، ارے یہ دالان جو ٹھنڈا پڑا ہی پہلے آگ کی طرح تپتا تھا۔ اب کوئی آگ بھی ہی چولھے میں بٹیا، دو تو لکڑیاں لگی ہیں، بھلا اتنے میں کیا جلوں گی ــــ؟" کچھ دنوں سے کریمن بوا بڑی کھُجی کھُجی اور ہراساں نظر آنے لگی تھیں۔ بیتا زمانہ انھیں بہت شدت سے ستانے لگا تھا ــــ اتنی تقریر کے بعد بھی وہ چپ نہ رہیں آہستہ آہستہ بڑبڑانے لگیں ــــ "اللہ مارا سب کچھ جلسوں جلوسوں کی نذر ہو گیا، سب کھا گئے موٹی توندوں والے، تو بھلا کوئی پوچھے گھر پھونک کر بھی کسی کو آزادی ملی ہی، اللہ ہدایت دے بڑے میاں کو۔"

بڑی چچی اور اماں تخت پر بیٹھی تھیں۔ ان کے سامنے مٹی کی کنڈالی میں انگارے رکھے ہوئے تھے۔ جن پر اب راکھ جم چکی تھی، وہ دونوں بار بار اپنے ہاتھوں کو سینک رہی تھیں۔

بڑی چچی نے ایک لمبی آہ بھری اور تخت کے ایک کونے پر رکھی ہوئی لالٹین کی بتی

کو ذرا سا اونچا کر دیا۔ لالٹین میں شاید تیل کم تھا بتی بار بار نیچی ہو رہی تھی۔ ہر چیز سنبھال سنبھال کر کم سے کم خرچ کی جاتی۔ جنگ کو کئی سال ہو گئے تھے، مہنگائی نے اس گھر کو بالکل ہی لوٹ لیا تھا۔ سب پریشان رہتے۔ کھانے کو جیسے تیسے مل جاتا تو تن کو کپڑا نہ جڑتا۔ جمیل بھیا کی چھوٹی سی تنخواہ اس گھر کے لیے دال میں نمک کے برابر تھی مگر بڑے چچا کی دکان کی آمدنی پھر بھی اس گھر میں نہ آتی۔ وہ سب باہر ہی باہر اُڑ جاتی۔ بڑی چچی ہر وقت جمیل بھیا کی جان کھاتیں کہ کچھ اور کرو۔ مگر وہ بھی تو ملک آزاد کرانے لگے تھے۔ شکیل نے قبل از وقت مونچھیں نکال دی تھیں مگر مدرسوں کے کورس کی کتابیں ساری رات اور کئی دن ختم نہ ہوتیں اسے تو سب عضوِ معطل سمجھ کر جیسے صبر کر بیٹھے تھے۔

کریمن بُوا جیسے سچ مچ آج اپنے کو جلانے پر تُل گئی تھیں۔ وہ اور بھی چولھے سے لپٹ کر بیٹھ گئیں۔ عالیہ کو وحشت ہونے لگی —— "کریمن بُوا ہٹ کر بیٹھو، جلانے کو ایک چنگاری بھی بہت ہوتی ہے۔" عالیہ نے تخت کے پاس کھڑے کھڑے کنڈالی پر ہاتھوں کا چھپر چھا دیا —— "ہائے کیسی سردی ہو رہی ہے۔ کمبخت سوئٹر بھی تو اتنا پُرانا ہو گیا ہے کہ گرمی نام کو نہیں رہ گئی۔"

ہاتھوں کو سینک کر ذرا جسم گرم ہوا تو وہ بھی بڑی چچی کے پاس ٹک گئی۔ گلی سے ریوڑیوں والے کی ٹھٹھری ہوئی آواز آہستہ آہستہ دُور ہوتی جا رہی تھی۔ جاڑے کی رات کس قدر ویران معلوم ہو رہی تھی۔

"جاڑوں میں یہیں اسی تخت پر بیٹھے بیٹھے سب لوگ مٹھیاں بھر بھر کر ریوڑیاں کھایا کرتے تھے۔ اپنا تو منھ تھک جاتا تھا۔ چباتے چباتے، اب تو جاڑے یوں ہی گزر جاتے ہیں مگر ایک ریوڑی نصیب نہیں ہوتی، واہ رے زمانے۔" کریمن بُوا نے لکڑیاں چولھے میں سرکا دیں۔ کریمن بُوا کو اب ہر وقت بولنے کا عارضہ ہو گیا تھا۔

بڑی چچی نے پھر ایک لمبی آہ بھری اور لالٹین کی بتی اونچی کر دی۔

"ہائے کریمن بوا اتنی سردی میں تمھاری آواز کیسے نکل رہی ہے؟" عالیہ نے جھنجھلا کر کہا پیلی پیلی روشنی میں بڑی چچی کا چہرہ کیسا مردہ جیسا نظر آرہا تھا اگر اس کے پاس پیسے ہوتے تو وہ ابھی کریمن بوا کو ریوڑیاں منگا کر کھلا دیتی، گزرے ہوئے وقت کو آواز دیتی ایسی باتوں سے بڑی چچی کتنی نڈھال ہو جاتی ہیں۔

عالیہ نے اپنی آہ کو سینے میں گھونٹ لیا—— اگر اس وقت جلدی سے کھانا مل جائے تو تھوڑی دیر پڑھ لے۔ سارا دن گزر گیا مگر کتاب کو ہاتھ نہیں لگایا۔ کھری کھاٹ پر دھوپ میں لیٹ کر اونگھتے ہوئے دن گزر گیا۔

سب چپ بیٹھے تھے۔ عالیہ یوں ہی بڑے کمرے دالان کی دیواریں اور چھت تک رہی تھی بجلی کا کنکشن کٹے کتنا زمانہ گزر چکا تھا۔ مگر اس برآمدے میں اب تک بریکٹ میں فیوز بلب لگا ہوا تھا جسے دھوئیں نے بالکل سیاہ کر دیا تھا۔ کسی میں ہمت نہ تھی کہ اس سیاہ بلب کو نکال پھینکے، کریمن بوا ہاتھ نہ لگانے دیتیں—— خواہ مخواہ پرانی نشانیوں کو کلیجے سے لگا کر رکھ چھوڑا ہے—— عالیہ نے الجھ کر نظریں جھکا لیں۔

"کریمن بوا، کھانا پک گیا؟ آج تو بڑی سردی ہے"۔ ٹھنڈی بیٹھک میں سردی سے سکڑتے ہوئے اسرار میاں نے دوسری بار آواز لگائی تھی۔

ٹھہر جاؤ لاٹ صاحب، کریمن بوا نے دوسری بار جل کر جواب دیا۔ اور کیسا مر بھکا ہے ذرا بھی صبر نہیں ہے۔

"توبہ کیسا مرتا ہے کھانے پر ندیدا، کیسے کیسے لوگ پال رکھے ہیں۔ بڑے بھیا نے بھی" اماں یا تو اتنی دیر سے چپ چاپ بیٹھی ہاتھ سینک رہی تھیں یا ایک دم کلیجہ پھاڑ کر بولیں۔ عالیہ کی جان ہی تو جل گئی مگر اماں کو بھلا کیا کہتی۔ کوئی اتنا نہیں سوچتا کہ سردی کس غضب کی ہو رہی ہے

اسرار میاں بھی انسان ہی ہیں پتھر تو نہیں ـــــ عالیہ سوچتی گئی ـــــ کیسے دکھ سے زندگی گزار رہی ہیں۔ وہ تو جب سے آئی ہے اس نے یہی دیکھا کہ بڑے چچا کے پرانے کھدر کے کرتے اور پاجامے پہنے کوڑی کوڑی کے کام کرتے پھرتے ہیں۔ اسی طرح سردیاں اور گرمیاں گزر جاتی ہیں۔ کبھی ان کو ایک گرم کپڑا بھی نصیب نہیں ہوتا۔ کیا حال ہوگا غریب کا اس سردی میں۔

"بس کھانا تیار ہے اسرار میاں!" عالیہ نے کمزور سی آواز میں کہا اور گھبرا کر اماں کا منہ دیکھنے لگی۔

"تم سے کس نے کہا تھا کہ اسے جواب دو کیا تمھاری بھی شرم اڑ گئی"؟ اماں نے فوراً ڈانٹ پلائی۔

عالیہ نے جواب نہ دیا وہ ماں کا دل نہ دکھانا چاہتی تھی۔ رسی جل جائے مگر بل نہیں جائے، پرانی شان جھیلنے والی ایک وہی تو رہ گئی تھیں۔

"کیا ہو گیا دلھن جو اس نے جواب دے دیا، آخر اسرار بھی تو تمھارے خسر کی اولاد ہے" بڑی چچی اپنی طرف سے مذاق کر کے ہنسنے لگیں۔

"ہے تو مگر اپنی اوقات بھی تو پہچانے رہے" اماں نے منہ بنا لیا اور پھر انھیں چھمی کی شادی کا خیال ستانے لگا ـــــ بڑی بھابی جب پیغام آ گیا ہے تو شادی کی تاریخ بھی مقرر کرا دیجیے، دیکھیے یہ وقت ہو گیا۔ محلے میں گئے اب تک نہیں آئے ہیں۔"

"آ کیوں نہیں گئی۔ اپنے کمرے میں ہے" عالیہ نے جلدی سے کہا۔

"مگر اس کے باپ نے جو پانچ سو شادی کے لیے بھیجے ہیں۔ اس میں سب کام کیسے ہوگا؟" اب اماں کو دوسری فکر ستانے لگی۔

"بس کچھ ہو ہی جائے گا" بڑی چچی نے سر جھکا لیا۔

"بس جیسے کمینوں کے ہاں شادی ہوتی ہے" اماں نے کہا۔

"پھر ہزاروں کہاں سے آئیں گے" عالیہ سے آج اماں کی باتیں برداشت نہ ہو رہی تھیں۔

"پانچ پانچ سو کی تو آتش بازی چھوڑی جاتی ہے، اپنے گھروں کی شادیوں میں ان آنکھوں نے سب دیکھا ہے" کریمن بوا تیزی سے روٹیاں پکا رہی تھیں۔

پردہ سرکا کر چھمی اندر آگئی اور کریمن بوا کے پاس چولہے کے سامنے بیٹھ گئی تو شادی کی بات وہیں ختم ہوگئی۔ سب چپ ہو گئے۔ چھمی سے تو سب چھپا رہے تھے۔ کسی نے اُسے خبر کی تھی کہ شادی کی بات پکی ہو چکی ہے۔ جہیز کے لیے اُس کے باپ نے روپے بھیج دیے ہیں۔ اور وہ ایک دن ڈولے میں سوار ہو کر چلی جائے گی۔ سب اس سے ڈرتے تھے کہ کہیں کوئی طوفان نہ کھڑا کر دے۔ بھلا اس کا کیا اعتبار۔ سب چپ تھے۔ دالان میں پڑے ہوئے ٹاٹ کے پردوں میں کتنے بڑے بڑے سوراخ ہو گئے تھے۔ دھوپ اور بارشوں نے اُن کا حلیہ بگاڑ دیا تھا۔ اور اب تو ان سوراخوں سے ٹھنڈی ہوا اندر آ رہی تھی۔ جیسے کھلی کھڑکی کے سامنے بیٹھ گئے ہوں۔ عالیہ خاموشی سے اکتا کر ٹاٹوں کے سوراخ گننے لگی۔

اتنی سخت سردی میں بڑے بھیا کانپور چلے گئے، انگریزی لباس سے بھی تو نفرت کرتے ہیں، شیروانی سے کوئی سردی جاتی ہے، ہر طرف سے بھر بھر ہوا لگتی ہے ایک کوٹ پہن لیں تو کیا حرج ہوگا بھلا۔ بس اللہ ہی رحم کرے"۔۔۔۔ اماں نے پھر باتیں چھیڑ دیں۔۔۔۔ "اس خاندان میں جانے یہ حرکتیں کہاں سے گھس آئیں"

"بس ان کی یہی زندگی ہے" اللہ اسی میں بھلا کرے گا" خدا انھیں سردی سے محفوظ رکھے۔ انگریزی لباس تو انھوں نے کبھی پہنا نہیں۔ ہمیشہ سے نفرت کی، پھر جب سے گرم شیروانی پھٹی دوسری پہننے کی نوبت نہ آئی۔ پرانی شیروانی سے کیا سردی

جاتی ہو گی۔" بڑی چچی نے کہا اور کوئلوں پر جمی ہوئی راکھ تنکے سے کریدنے لگیں۔

عالیہ نے اپنا سر بازوؤں میں چھپا کر آنکھیں موند لیں۔ اندھیرے میں لال پیلے دھبے ناچنے کودنے لگے۔ اور پھر اس کے سامنے لوہے کی سلاخیں ابھرنے لگیں اور ان سلاخوں کے پیچھے اس کے ابا کا چہرہ چمک رہا تھا۔ ابا وہاں کتنی سردی ہو گی، وہاں تو کوئی کوئلے دہکا کر کوئی کمرہ بھی نہ گرم کرتا ہو گا اور وہ گرم کپڑے بھی تو اب پرانے ہو چکے ہوں گے۔ رات کس طرح گزرتی ہو گی ——— اس نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔ یہ دل کو کون چٹکیوں سے مسل رہا تھا۔

"کریمن بوا روٹی تو پکتی رہے گی۔ آج مجھے سب سے پہلے کھانے کو دے دو۔ مجھے پڑھنا ہے" عالیہ نے کہا۔

"میں صدقے تم گرم گرم روٹی کھا لو، تمھارے ساتھ جمیلہ بٹیا بھی کھا لیں گی۔"

"مجھے کون سا پڑھنا ہے جو گرم گرم روٹیاں توڑنے بیٹھ جاؤں" جمیلہ نے تیوریاں چڑھا کر کہا اور بازوؤں میں منھ چھپا کر چولھے کے اور آگے سرک گئی۔

عالیہ بڑی بے دلی سے کھانا کھا رہی تھی۔ اس وقت پھر سب خاموش بیٹھے اتنے لوگوں کے بیچ میں بھی زندگی کے آثار ڈھونڈے نہ ملتے ——— بڑے چچا ہوتے تو بس گیارہ بجے رات تک بیٹھک ہی آباد رہتی ——— اس نے سوچا ——— اور جانے آج جمیل بھیا کہاں چلے گئے۔ وہ کن کارروائیوں میں مصروف ہیں اور شکیل اللہ ہی جانے کہاں آوارہ گھوم رہا ہو گا۔

"کریمن بوا اب تو اسرار میاں کو بھی کھانا بھجوا دو" عالیہ نے اٹھتے ہوئے کہا مگر کریمن بوا تو ایسے موقعوں پر ہمیشہ گونگی بہری بن جایا کرتیں۔

بھجوا دیا جائے گا، اب کوئی کریمن بوا کے دس ہاتھ کر لیں" اماں نے تلخی سے

جواب دیا۔

"ہاں دیکھ لیجیے چھوٹی دلھن" کریمن بوا جلدی سے بولیں —— وہ بھی کیا زمانہ تھا۔"

عالیہ جلدی سے پردہ سرکا کر باہر نکل آئی۔ کتنا اندھیرا تھا ذرا سے فاصلے کی چیز دکھائی نہ دیتی۔ وہ صحن میں پڑی ہوئی لوہے کی کرسی سے ٹکرا گئی۔ تہمینہ کے کمرے سے نکلتی ہوئی ہلکی سی پیلی روشنی کھڑکی دیوار کے اس پار رہ گئی تھی۔ صحن پار کر کے وہ جلدی جلدی سیڑھیاں طے کر گئی۔ کریمن بوا کے دس ہاتھوں کے خیال نے اسے بری طرح جھنجھلا دیا تھا۔

نجمہ پھوپھی کا کمرہ طے کرتے ہوئے اس نے نیچی نیچی نظروں سے دیکھا کہ نجمہ پھوپھی آرام کرسی پر لیٹی اپنے سے دگنی موٹی کتاب میں غرق ہیں۔ اور ان کے پیروں پر ریشمی لچکا لگی دلائی بڑی نفاست سے پڑی ہوئی ہو۔ نجمہ پھوپھی نے حسب معمول نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھا —— اب بھلا وہ اس راستے کو کیسے چھوڑ دے۔ وہ ہوا میں اڑ کر تو اپنے کمرے میں جانے سے رہی۔

اپنے ننھے سے کمرے میں داخل ہوتے ہی اس نے گلی میں کھلنے والی کھڑکی کے پٹ کھول دیے۔ بجلی کی تیز روشنی میں اس نے اپنا بستر ٹھیک کیا پھر لحاف میں دبک کر لیٹ گئی اور جب ذرا ہاتھ گرم ہو گئے تو چچا کی الماری سے نکالی ہوئی کتاب اٹھا کر پڑھنے لگی۔

کھڑکی کھلنے کی وجہ سے سردی کتنی زیادہ ہو گئی تھی۔ مگر کھڑکی بند کرنے سے تو اندھیرے میں غوطے لگانا پڑتے۔ لالٹین کی پیاسی اور بیمار سی روشنی سے اس کو کتنی الجھن ہوتی۔ ویسے ایک زمانہ وہ بھی تھا جب لالٹین ہی کی پیاسی روشنی میں زندگی کا ایک حصہ گزر گیا تھا۔ برسات کے دنوں میں جب لالٹین کے گرد پتنگے جمع ہو جاتے تو اسے کتنا مزہ آتا ——

تو اب ایک پتنگے نے شیشے سے سر ٹکرایا اور اوندھا ہو گیا، اب دوسرا اور اب تیسرا — اسی طرح پتنگے گنتے گنتے سو جاتی مگر اب تو خیرات میں ملی ہوئی بجلی کی روشنی کے بغیر اس سے ایک منٹ کو نہ پڑھا جاتا۔

ابھی تو رات کا ابتدائی حصہ گزرا تھا مگر گلی میں کیسا سناٹا چھایا ہوا تھا۔ اسکول کی عمارت اور اس کے آس پاس کے گھنے درخت کہر کی چادروں میں ڈھکے ہوئے تھے۔ نیچے کی منزل سے اب زور زور سے باتوں کی آواز آ رہی تھی۔ اور ان آوازوں سے اسرار میاں کی نحیف سی آواز ابھر رہی تھی — "کریمن بوا کھانا پک گیا ہو تو دے دو۔"

"کھا لینا اسرار میاں، دیر سے کھاؤ گے تو خوب بھوک لگے گی۔ اس مہنگائی کے زمانے میں اگر تمھاری بھوک دو کھلی تو ہم سب کیا کریں گے۔" چھمی اپنی مخصوص ادا سے کہہ رہی تھی اور پھر اس کی ہنسی کی آواز عالیہ کے کانوں کے پار ہو گئی۔

عالیہ نے کتاب سینے پر رکھ لی۔ رحم کی ایک ٹیس اس کے کلیجے کو پار کر گئی — ارے ان بے چارے کا کیا قصور ہے، یہ سب لوگ ان کے لیے پتھر کیوں بن گئے ہیں۔ آخر یہ آپ ہی آپ تو دنیا میں نہیں آ گئے جو اب سب لوگ ان کے بے گانے بن گئے۔ وہ کسی کے ماموں نہیں، کسی کے چچا نہیں، کسی کے بھائی نہیں، کسی کے باپ نہیں — باپ، بھلا کسی کو کیا پڑی ہے کہ اس سلسلے میں سوچے۔ یہ کس کے باپ بنیں گے، جبکہ ان کا کوئی باپ نہیں۔ اس کا کیسا جی چاہا کہ بس اسی وقت دوڑ کر نیچے چلی جائے اپنے ہاتھوں سے کشتی سجائے اور پھر اسرار میاں کے سامنے رکھ دے اور جب تک وہ کھاتے رہیں، سعادت مند بھتیجوں کی طرح ان کے پاس کھڑی رہے مگر یہ سب کچھ کتنا ناممکن تھا۔ اس طرح تو اس کی اماں کے اتنے پرانے وقار کو ٹھیس لگ جائے گی اور کریمن بوا تو یقیناً بیتے ہوئے زمانے کا ماتم کرنے لگیں گی — "خیر یہ میرا گھر تو نہیں۔" وہ بڑبڑائی۔

اس نے پھر کتاب اُٹھالی۔ چنگیز خاں کے مظالم پڑھ پڑھ کر مارے دہشت کے دل کانپا جاتا۔

کتاب رکھ کر اس نے لحاف میں منھ چھپا لیا۔ اس اشرف المخلوق نے کیسے کیسے ظلم سے تاریخ مرتب کی ہے ــــ اس وقت وہ سراسر متفکر بنی ہوئی تھی ــــ اقتدار کی آگ کبھی نہیں بجھتی لاکھ تہذیب جنم لیتی رہے۔ کچھ نہیں بنتا۔ اقتدار سب کچھ جلا کر بھسم کر دیتا ہے۔ اس کے باوجود دعویٰ ہے کہ اب ہم مہذب ہو چکے ہیں۔ سروں کے مینار بنا کر اور انسانوں کو پنجروں میں بند کرنا تو صدیوں پرانی دہشت کے دور کی یادگاریں ہیں۔ مگر آج جو جنگ ہو رہی ہے۔ ایک سے ایک بڑھیا بم لو، جس سے سب سے زیادہ بے گناہ مریں وہ سب سے ترقی یافتہ ہتھیار ــــ پھر جلیانوالے باغ کا قصہ کون سا صدیوں پرانا واقعہ ہے۔ اسی مہذب دور نے تو اس واقعے کو جنم دیا تھا ــــ اور اسے ایک دم کسم دیدی یاد آگئیں ــــ اندھیرے میں ان کی لاش آنکھوں کے سامنے تیرنے لگی۔ ریشمی ساری سے قطرہ قطرہ ٹپکتا ہوا پانی اس کے دل پہ گر رہا تھا۔

کسی نے ہولے سے اس کا لحاف سرکایا تو وہ بوکھلا کر اٹھ بیٹھی۔ "ارے تم تو ڈر گئیں" جمیل بھیا اس کے سرہانے کھڑے تھے۔

"ہاں میں تو سچ مچ ڈر گئی، ابھی ذرا دیر پہلے میں چنگیز خاں کے مظالم پڑھ رہی تھی"

"اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ تم مجھ ہی کو چنگیز سمجھ رہی ہو، بھلا مجھ میں اتنی ہمت کہاں" جمیل کھتیا بیٹھے۔

"تمھیں کیسے کہہ سکتی ہوں، تم تو مہذب ہو اور پھر شاعر ــــ اسرار میاں کو کھانا مل گیا"؟

"میں اگر ممانی بوا کے معاملات میں دخل نہیں دیتا" جمیل بھیا نے بڑے پھیکے پن سے

کہا ——— "اس وقت تو میں تم سے باتیں کرنے آیا ہوں اور ———"

جمیل بھیا اس وقت بحث وغیرہ کے موڈ میں نہ تھے۔ وہ کچھ سوچ رہے تھے۔ وہ پہلے ہی سمجھ گئی تھی کہ وہ کیا سوچ رہے ہیں اور کیا کہنا چاہتے ہیں۔ اور اب جبکہ رات سو رہی ہے، اس سردی میں سب لوگ اپنے بستروں میں دبے پڑے ہیں تو وہ اس کے کمرے میں کیوں آئے ہیں ——— پھر اسے خیال آیا کہ نجمہ پھوپھی کچھ سوچنے نہ لگیں ——— اس نے کھڑکی کے دونوں پٹ کھول دیے۔

جمیل بھیا کرسی سرکا کر اس کے پلنگ کی پٹی کے پاس بیٹھ گئے اور اسے بڑی گہری گہری نظروں سے گھورنے لگے ـــ وہ جمیل بھیا کو ٹالنے کے لیے ادھر اُدھر دیکھنے لگی۔

"تمھاری آنکھیں کتنی خوبصورت ہیں، شاعر نے شاید ایسی ہی آنکھوں کو جنت کے نام سے یاد کیا ہے۔"

"شکریہ بھیا جمیل،" وہ زور سے ہنسی "یہ اصلی جنت نہیں ہے ـ ہو سکتا ہے کہ شداد کی جنت ہو۔"

"عالیہ بیگم، سروں کے مینار بنانا اتنا بڑا ظلم نہیں جتنا کسی کے جذبات کا مذاق اُڑانا۔"

"کیا یہ بھی شاعری کا کوئی باریک نکتہ ہے، خیر چلو، معاف کر دو، جذبات کا مذاق اُڑانے کے بجائے اب سروں کے مینار بنا لیا کروں گی۔" اس نے اپنے ہاتھ لحاف میں چھپا لیے ——— "جمیل بھیا اگر اس بار میں پاس ہو گئی تو مزا آجائے گا، نجمہ پھوپھی کی قابلیت کو ضرور تھوڑی ٹھیس لگے گی۔"

وہ تو گفتگو کا موضوع بدل رہی تھی۔ مگر جمیل بھیا نے ذرا بھی دلچسپی نہ لی۔ سر جھکائے خاموش بیٹھے رہے۔ کھلی کھڑکی سے ہوا کے کتنے سرد جھونکے اندر آ رہے

تھے، مگر وہ کھڑکی بند بھی تو نہ کر سکتی تھی۔ اندھیرا جذبات سے ساری روشنی چھین لیتا ہے۔

"مجھے معلوم ہے تم مجھ سے بات نہیں کرنا چاہتیں۔ تم مجھے ٹالتی ہو عالیہ۔ کیا تم میری محبت کا احترام بھی نہیں کر سکتیں۔"

"بھیا آپ کیسی باتیں کرتے ہیں۔ میں — میں —" وہ جمیل کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر بوکھلا گئی۔ اس سے بات نہ کرتے بن پڑی۔

"عالیہ!" جمیل بھیا نے اسے ایک جھٹکے سے اٹھالیا اور عالیہ کو ایسا محسوس ہوا کہ کھڑکیوں کے دونوں پٹ بند ہو گئے ہیں اور اس کے ہونٹوں پر انگارے رکھے ہوئے ہیں۔ یہ سب کچھ اتنی تیزی سے ہو گیا کہ وہ کچھ بھی نہ کر سکی اور جب اس نے جمیل بھیا کو اپنے آپ سے جھٹکنا چاہا تو وہ اس کے بازو پر سر رکھے بچوں کی طرح سسک رہے تھے اور ان کا ایک ایک آنسو کھولتی ہوئی بوندکی طرح اس کے دل پر گرتا محسوس ہو رہا تھا۔ اسے ان بوندوں کے گرنے کی آواز تک محسوس ہو رہی تھی۔ ان بوندوں کی روشنی سارے کمرے میں پھیل گئی تھی اسے ایک صاف ستھرا رستہ نظر آرہا تھا۔ جس پر دوڑنے کے لیے جیسے اس کے پاؤں بیتاب سے تھے۔

وہ بے سدھ سی بیٹھی تھی۔ اور جمیل بھیا اب سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھتے ہوئے بڑے میٹھے پن سے مسکرا رہے تھے۔ کتنا فخر اور کتنا سکون تھا اس مسکراہٹ میں۔

"بس اب آپ تشریف لے جائیں جمیل صاحب۔" عالیہ نے ڈائنوں کی طرح ان کی طرف دیکھا۔ کسی اور کو الو بنائیے گا۔ میرا نام ہی عالیہ، چلے جائیے۔ ورنہ اتنی زور سے چیخوں گی کہ ہاں —"

جمیل بھیا دیوار سے ٹیک لگائے کھڑے اسے ٹک ٹک دیکھ رہے تھے۔ ان کی

نظریں چیخ رہی تھیں، "تم کسی سے محبت نہیں کرسکتیں عالیہ بیگم، تم سچ مچ ڈائن ہو"
اور جب جمیل بھیا کھڑے کھڑے ایک دم چلے گئے تو عالیہ نے کھڑکیوں کے پٹ بھیڑ دیئے اور سسکیاں بھر بھر کر رونے لگی ــــ "جمیل، میرے جسم میں جو تم جادو کی سوئیاں چبھو گئے ہو اسے اب کون سا شہزادہ آکر نکالے گا۔"

روتے روتے جب اس کا جی ہلکا پڑ گیا تو وہ اپنی بے وقوفی پر ہنسنے لگی ــــ حد ہی بھئی ــــ کیا وہ آپا اور کسم دیدی سے کچھ کم ہے ــــ ہونہہ! پتہ نہیں وہ کیسے پاگل ہو گئی تھی۔

وہ اپنے کورس کی کتاب اٹھا کر بڑے سکون سے پڑھنے لگی۔ اور پھر نہ جانے کس وقت کتاب اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر سینے پر گر پڑی تو کچی نیند میں وہ چونک پڑی۔
"ارے یہ چھمی اتنی ٹھنڈ میں ننگے پاؤں کیوں چپ چاپ کھڑی ہے ــــ" عالیہ نے کتاب میز پر رکھ دی۔

"تو کیا آپ اب تک جاگ رہی ہیں بجیا ــــ؟" کھڑکی کی طرف بڑھتے بڑھتے وہ ایک دم ٹھٹھک کر رہ گئی۔

"مگر تم کیا کرتی پھر رہی ہو۔ اس سردی میں؟ ادھر لحاف میں آجاؤ چھمی۔"
"منظور نے کہا تھا کہ رات بارہ بجے گلی میں کھمبے کے نیچے کھڑا ہوں گا تم کھڑکی میں آکر کھڑی ہونا ــــ خیر آپ سو جائیے، خواہ مخواہ نیند خراب کی میں نے ــــ" وہ کمرے کا دروازہ کھول کر جلدی سے چلی گئی۔

"ارے چھمی ــــ" عالیہ نے آواز دی مگر وہ تو سیڑھیاں طے کر کے اپنے کمرے میں جا چکی ہوگی۔

عالیہ نے کھڑکی کے پٹ کھول کر نیچے گلی میں جھانکا، کُہر بیٹھ گئی تھی۔ چاند کی

ملگجی روشنی گلی میں لوٹ رہی تھی، وہاں اور کچھ بھی نہ تھا

(۳۰)

جنگ جاری تھی۔ مہنگائی نے گھر میں جھاڑو پھیر دی تھی۔ جمیل بھیا کی تھوڑی سی آمدنی صحیح معنوں میں کسی کا بھی پیٹ نہ بھر سکتی تھی۔ گھر میں سب کتنے خود غرض ہو رہے تھے۔ اماں کی پیشانی پر ہر وقت شکایتی شکنیں پڑی رہتیں۔ بڑے چچا کی صورت سے انھیں نفرت ہو گئی تھی۔ انھیں شدت سے احساس تھا کہ اگر دکان کے روپے گھر میں آنے لگیں تو یہ حالت ذرا کے ذرا میں بدل جائے۔ ذرا ڈھنگ کی روٹی تو نصیب ہو، دھمکی کے طور پر وہ ہر وقت اپنے بھائی کے گھر جانے کی ضد کرتیں اور بڑی چچی اس خیال سے لرز اٹھتیں کہ اس طرح تو گھر کی بدنامی ہوگی۔ سب یہی کہیں گے نا کہ پیٹ بھر روٹی بھی نہ کھلا سکے۔ ادھر چھمی کی یہ حالت تھی کہ ہر وقت لڑنے بھڑنے پر تیار رہتی۔ چھینکے پر رکھا ہوا شکیل کا کھانا اتار کر چپکے سے کھا جاتی اور جب بدلے میں وہ بکواس کرتا تو مزے سے ہنستی یا پھر مارنے مرنے پر تل جاتی۔ نجمہ پھوپھی یہ ہنگامے دیکھ کر حقارت سے منھ پھیر لیتیں — "جہالت میں یہی سب کچھ ہوتا ہے۔ اگر سب کے پاس تعلیم ہوتی تو آج یوں بھوکے مرتے؟" وہ بڑے غرور سے کہتیں۔ اور پھر اپنی تعلیم کے آفاق پر بیٹھ کر بڑے فخر سے مسکرانے لگتیں۔ جمیل بھیا یہ سب کچھ دیکھتے، سنتے اور ان سب کے بیچ میں بڑے بے بس اور خاموش نظر آتے مگر وقت کی اس خرابی کے باوجود کریمن بوا ذرا بھی نہ بدلی تھیں۔ جنگ کی وجہ سے فقیروں کے گلّے پیدا ہو گئے تھے۔ کریمن بوا پچھلے زمانے کی دی ہوئی موٹی خیراتوں کو یاد کر کے کڑھا کرتیں۔ اور اسرار میاں کی روٹیوں کے ٹکڑے نوالے کاٹ کاٹ کر فقیروں کو خیرات لیے ہی دیا کرتیں۔ اس عجیب و غریب خیرات پر عالیہ کا جی جلنے لگتا۔ آخر یہ اسرار میاں اتنے دیانتدار

کیوں ہیں؟ کیا وہ دوکان سے ایک آدھ روپیہ اڑا کر عیش نہیں کر سکتے۔؟ اس ایثار اور شرافت کا چلہ کاٹ کر انھیں کیا مل جائے گا؟ اس طرح وہ دادا کی جائز اولاد تو کہنے سے رہے۔ کچھ بھی کرتے رہیں پھر بھی دادا کی داشتہ کی اولاد ہی کہلائیں گے۔ انھیں کوئی باپ کے نام سے یاد نہ کرے گا۔ یہ دنیا ان کے لیے میدان قیامت ہی رہے گی۔

گھر کی ایسی بری حالت دیکھ کر بھی بڑے چچا کا دل نہ پسیجا تھا۔ مقاصد کے تیروں نے انھیں اس بری طرح گھائل کر رکھا تھا کہ سارے دکھ درد ہیچ تھے۔ "جنگ نے آزادی کو بہت قریب کر دیا تھا"۔۔۔ وہ سب کی طرف دیکھ کر کہتے مگر کوئی بھی تو انھیں جواب نہ دیتا۔ وہ شرمندہ ہو کر سر جھکا لیتے۔ مجرموں کی طرح اُلٹے سیدھے نوالے توڑتے اور بیٹھک کی راہ لیتے۔

سردیوں میں اب وہ شدت نہ رہ گئی تھی۔ عالیہ رات گئے تک گلی کی کھڑکی کھلی رکھتی۔ اور گلی کی روشنی سے پڑھ پڑھ کر امتحان کی تیاری کرتی رہتی۔ ان دنوں اس نے سوچ بچار سے ہاتھ اُٹھا لیا تھا۔ ابا کے خط اس کی ہمت بڑھاتے رہتے۔

دھوپ ڈھل چکی تھی۔ ساری دوپہر چھت پڑھنے کے بعد بھی وہ چھت سے نہ سرکی۔ سائے کی وجہ سے اب اسے سردی لگ رہی تھی۔

پڑھتے پڑھتے اس نے سر اُٹھا کر دیکھا تو جمیل اس کے پاس کھڑی تھی۔ رات سے وہ چُپ چپ تھی اور صبح سے کئی بار عالیہ کے پاس سے گزری تھی۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ وہ کچھ کہنا چاہتی ہو مگر جب بھی عالیہ اس کی طرف دیکھتی تو چلی جاتی۔

"کیا بات ہے جمیلی؟"

"کچھ بھی نہیں بجیا، بس یوں ہی جی چاہا کہ آپ کے پاس بیٹھوں"۔ وہ عالیہ کے پاس کرسی پر ٹک گئی۔

جمیلی نے آج کتنی مدت بعد اسے پیار سے بجیا کہا تھا وہ اُسے بڑی پیاری لگ رہی تھی

کھوئی کھوئی سی بیٹھی اسے تک رہی تھی۔

"کچھ تو ضرور ہے چھمی ورنہ تم ایسی کیوں نظر آ رہی ہو" عالیہ نے اسے اپنے قریب سرکایا تو چھمی اس کے شانے پر سر رکھ کر رونے لگی۔۔۔ "وہ منظور بھی جنگ میں بھرتی ہو گیا بجیا، ایک سہارا تھا سو وہ بھی گیا" چھمی نے روتے روتے کہا۔

"ہونہہ! اگر اسے تم سے محبت ہوتی تو پھر جنگ پر کیوں جاتا پگلی، اور اب تم اسے یاد کر کے رو رہی ہو، بے وقوفی نہ کرو چھمی" عالیہ نے اسے لپٹا لیا۔

"بس ویسے ہی رونا آ گیا۔ کوئی مجھے اس سے محبت تھوڑی تھی۔ وہ مجھ سے محبت کرتا تھا اس لیے مجھے بھی اچھا لگنے لگا تھا۔ چلو کوئی مجھ سے محبت تو کرتا تھا" چھمی نے بے بسی سے ہنستے ہوئے آنسو پونچھ لیے۔

عالیہ سے کچھ کہتے نہ بن پڑی۔ بھلا وہ کہتی بھی کیا۔ "میں جو تم سے محبت کرتی ہوں چھمی؟"

"آپ، آپ مجھ سے محبت کرتی ہیں بجیا"؟ وہ زور سے ہنسی۔ کتنی تضحیک تھی۔ اس کی بے تحاشہ ہنسی میں۔ عالیہ اسے کیسے یقین دلا سکتی تھی کہ وہ اس سے محبت کرتی ہے۔ وہ اس سے ہمدردی رکھتی ہے۔ وہ چھمی کی ہنسی سے بوکھلا کر اس کا منھ تک رہی تھی۔

"یہ دیکھیے بجیا میرے پاجامے کی گوٹ کس بری طرح پھٹ گئی ہے میں نیچے جا کر اسے سی لوں تو پھر آؤں گی۔

چھمی بھدر، بھدر کرتی چلی گئی اور عالیہ کتاب گود میں رکھے بے وقوفوں کی طرح بیٹھی رہ گئی۔ یعنی اس نے ایسی بے کار بات کی تھی کہ چھمی کو پاجامے کی گوٹ سینا یاد آ گئی۔ چھمی اس کی محبت پر اعتبار نہیں کرتی۔ دنیا نے اس کے اعتبار کا جنازہ نکال دیا ہے۔ عالیہ رنجیدہ ہو رہی تھی۔

چھت کی منڈیر پر بیٹھا ہوا کوا کائیں کائیں کرتا ہوا اڑ گیا۔ دھوپ چھت کی منڈیروں

پر چڑھتے چڑھتے غائب ہو گئی تھی۔ اب اچھی خاصی سردی ہو رہی تھی۔ کتابیں سمیٹ کر وہ اپنے کمرے میں رکھ آئی۔ جمیل کے جانے کے بعد ایک لفظ بھی تو نہ پڑھ سکی تھی۔ تھوڑی دیر تک وہ آنکھیں بند کر کے اپنے بستر پر پڑی رہی اور پھر نیچے چلی گئی۔ کیاری میں گیندے اور گل عباس کے پھول بہار کا پتہ دے رہے تھے۔ عالیہ نے ایک پھول توڑ کر اپنے بالوں میں لگایا۔ مگر جب اس نے دیکھا کہ جمیل بھیا دالان کی محراب کے پاس کھڑے اُسے بڑے اشتیاق سے دیکھ رہے ہیں تو اس نے بوکھلا کر پھول کیاری میں اُچھال دیا۔ جانے کیسے اس کو احساس ہوا کہ سنگھار مرد سے محبت کرنے کی چغلی کھاتا ہے۔

پھول پھینک کر اس نے دیکھا کہ جمیل بھیا کی آنکھیں جیسے کمھلا گئی ہیں۔ وہ لوہے کی کرسی پر سر جھکا کر بیٹھ گئے۔

اماں تخت پر بیٹھی چھالیہ کاٹ رہی تھیں اور بڑی چچی چنے کی دال چُن رہی تھیں اُن کا دکھوں میں گھرا ہوا چہرہ کس قدر کھنڈر ہو رہا تھا۔ سارے دکھ، سارے درد ان کے چہرے کی رعنائی کو توڑ پھوڑ کر اب بھی اپنا چہرہ نہ چھوڑ رہے تھے۔ ادھر دو دن سے وہ ایک نئے دکھ میں مبتلا تھیں۔ دو دن ہو گئے مگر شکیل گھر نہ آیا۔ جمیل بھیا نے اُسے تلاش بھی کیا۔ لیکن کوئی پتہ نہ چلا۔ جانے وہ کتابوں کی تلاش میں کتنی دور چلا گیا تھا۔

"شامیں ہمیشہ اداس ہوتی ہیں" جمیل بھیا نے عالیہ کی طرف دیکھا۔

"سب شاعری ہے، مجھے تو کوئی اداسی نہیں لگتی" عالیہ ہنسی اور اماں کے پاس تخت پر بیٹھ کر بادام کی گٹھلیاں صاف کرنے لگی۔

"میرے سامنے اتنی خوبصورت اور اتنی مکمل غزل ہے کہ اب اپنا سارا کلام بے معنی معلوم ہوتا ہے۔ اس لیے شاعری واعری چھوڑ دی ہے، تم نے فیض اور ندیم کو پڑھا ہے؟" انھوں نے پوچھا۔

عالیہ خاموش رہی، وہ بھلا خود کو غزل کیسے سمجھ لیتی۔ یہ جمیل بھیا بھی خوب ہیں، ہر بات میں اپنا مطلب تلاش کر لیتے ہیں۔ اسے غصہ آ رہا تھا۔

"تمھارے بڑے چچا کی لائبریری میں نفیس اور ندیم کا کہاں گزر ہو سکتا ہے" وہ ہنسے "سنا ہے گاندھی پر اندر کوئی کتاب چھپی کہ نہیں؟" جمیل بھیا پھول پھینکنے کا انتقام لے رہے تھے وہ بڑے انہماک سے پاندان صاف کرتی رہی۔ اس نے نظر اٹھا کر بھی نہ دیکھا جیسے اسے معلوم ہی نہیں کہ اس سے کوئی مخاطب بھی ہے۔ جمیل بھیا کے لیے اس نے کچھ اور کبھی نہ سوچا تھا پھر بھی کیوں وہ ان سے گھبرانے لگی تھی۔

"کیا تم نے آج بھی شکیل کو تلاش کیا تھا۔ بھلا تم کو اپنی مسلم لیگ سے کب فرصت ملے گی" دال کے کنکر صاف کرتے کرتے بڑی چچی نے سر اٹھا کر پوچھا۔

"اماں، اب آپ اس کی فکر نہ کریں، وہ بمبئی چلا گیا ہے۔ وہاں مزے سے کما کھائے گا۔" جمیل بھیا نے جیسے ڈھیلا کھینچ مارا۔

"بمبئی میں؟" اتنی دور؟" بڑی چچی کی آواز لرز رہی تھی۔ "ارے اسے شرم نہ آئی، بھاگتے ہوئے۔ اسے اپنی ماں کا بھی خیال نہ آیا۔" بڑی چچی کلیجہ تھام کر رونے لگیں۔

عالیہ تخت سے کود کر بڑی چچی کی طرف لپکی اور انھیں اپنی باہوں میں لے لیا۔ "نہ روئیے بڑی چچی، وہ آجائے گا۔"

"وہ کیوں آئے گا عالیہ بیگم، یہاں اس کے لیے کیا رکھا تھا اور اب اسے کس کا خیال آئے گا۔ وہ اپنی زندگی بنانے گیا ہے۔ یا بگاڑنے، اس نے کچھ سوچا ہی ہوگا۔ اس گورکھ دھندے میں رہ کر کیا کرتا۔" جمیل بھیا کی نظروں تک میں طنز تھا۔

"جمیل میاں کوئی کیا کر سکتا تھا۔ اس کے باپ کا فرض تھا کہ گھر کی فکر کرتے، اپنی

اولاد کو دیکھتے، پڑھاتے لکھاتے، تربیت کرتے، وہ غریب آوارہ پھرتا رہا، کبھی پلٹ کر نہ پوچھا۔" اماں کو تو بڑے چچا کے خلاف زہر اُگلنے کا موقع ملنا ہی چاہیے تھا۔ اب مجبور تھیں جو کھلے خزانے ان کے سامنے کچھ نہ کہتیں۔ ان سے یہ احساس کوئی نہیں چھین سکتا کہ سب گھر کی تباہی کے ذمہ دار صرف بڑے چچا تھے۔ باقی تمام افراد معصوم تھے وہ بڑے یقین سے کہتی تھیں کہ بنیاد ٹیڑھی رکھی جائے تو ساری عمارت ہی ٹیڑھی بنے گی۔

جمیل بھیا سر جھکا کر جانے کیا سوچنے لگے۔ بڑی چچی دوپٹے کے پلو میں منہ چھپائے روئے جا رہی تھیں۔ ان کی کوکھ سے جنم لینے والا ان کے دکھوں پر تھوک کر ساتھ چھوڑ گیا تھا۔ وہ لاکھ آوارہ ہو گیا تھا پھر بھی ایک ماں کو اس سے کوئی آس تو تھی۔

"مت روئیے بڑی بھابی، جب ملک آزاد ہوگا۔ تو شکیل بھی واپس آجائے گا۔" اماں نے مضحکہ خیز طریقے سے کہا اور داد طلب نظروں سے دیکھنے لگیں۔

"اور جب ملک آزاد ہوگا تو سارے انگریز دُم دبا کر بھاگ جائیں گے۔ ہمارے پاکستان میں تو ایک بھی انگریز نہ رہے گا۔" تمیمی اپنے کمرے سے نکل آئی تھی۔

"میرے اللہ" عالیہ زیرِ لب بڑبڑائی۔ "ایک دفعہ پھر سب لوگ سن لو کہ شکیل بھاگ گیا۔ بڑی چچی کا کلیجہ صدمہ سے پھٹ رہا ہے۔ آپ لوگ ذرا دیر کو اپنی بحث سے ہاتھ اٹھائیں" عالیہ کے لہجے میں سختی تھی۔

ذرا دیر کے لیے سب چپ ہو گئے۔ شام اتنی ویران اور اداس ہو رہی تھی کہ عالیہ کو لگا کہ شکیل بھاگا نہیں بلکہ ابھی ابھی اس کی میت اٹھائی گئی۔ بڑی چچی کیسے بلک بلک کر رو رہی تھیں۔

"اماں اس کے لیے مت روئیے۔ وہ تو سخت نالائق لڑکا تھا۔" جمیل بھیا اپنی ماں کے پاس آکر کھڑے ہو گئے۔ "میں جو ہوں آپ کا خدمت گزار۔"

"تم بھی مجھے چھوڑ کر چلے جاؤ۔" بڑی چچی نے سسک کر کہا۔

"میں کہاں جاؤں گا اماں۔ میرا آپ کا تو جنم جنم کا ساتھ ہے اور تو اس دنیا میں میرا کوئی ساتھی نہیں۔" اُنھوں نے نظریں بچا کر عالیہ کو دیکھا تو اس نے گھبرا کر بڑی چچی کی آڑ لے لی۔

جمیل بھیا کی ذرا سی تسلی سے بڑی چچی چپ ہو گئیں، وہ چپ نہ ہوتیں تو کیا باتیں کرتیں۔ ان کی ساری زندگی ان کی مرضی کے خلاف گزرتی رہی، اور وہ صبر کی سِل سینے پر دھرے دوسروں کے اشارے پر چلتی رہیں۔

"اللہ اب اس گھر کو تباہیوں سے بچا لے۔" کریمن بُوا دعائیں کر کر کے لالٹینیں جلا رہی تھیں۔ اور سب لوگ بڑی عقیدت سے اذان کی آواز سن رہے تھے۔ نجمہ پھوپھی نے اپنے کمرے کی کھڑکی سے جھانک کر نیچے دیکھا اور اس طرح ہٹ گئیں جیسے کہہ رہی ہوں کہ مر جاؤ جاہلو، تم سب کی یہی سزا ہے، بھوکے مر مر کر ایک دن سب بھاگ جائیں گے۔

رات آٹھ بجے کے قریب بڑے چچا گھر میں داخل ہوئے تو بڑی گہری خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ کریمن بُوا نے تخت پر دسترخوان بچھا کر کھانا لگا دیا۔

"شکیل بھاگ گیا، بمبئی میں ہے۔" بڑی چچی نے خبر سنائی۔ اُن کی آواز بھرا رہی تھی۔

"ارے، بھاگ گیا؟ آخر کیوں بھاگ گیا۔ وہ مردود۔" مارے غصّے کے بڑے چچا کا منھ سُرخ ہو رہا تھا۔ "آئے گا تو اس کی ہڈیاں توڑ دوں گا۔ اُسے شرم نہیں آئی۔"

"تم کیوں ہڈیاں توڑو گے، تم نے اس کیلئے کیا کیا ہے؟ تم کو یہ بھی یاد نہ تھا کہ شکیل بھی تمھاری اولاد ہے۔" بڑی چچی نے تابڑ توڑ جواب دیا۔ آج پہلی بار وہ سب کے سامنے بڑے چچا سے لڑنے پر آمادہ تھیں۔

"وہ۔ وہ میں نے کہا کہ اُسے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔" بڑے چچا نے بوکھلا کر

سر جھکا لیا اور جلدی جلدی نوالے توڑنے لگے۔ تھمی دانتوں تلے انگلی رکھ کر اپنے مخصوص انداز سے ہنسنے لگی تو بڑی چچی نے اسے گھور کر دیکھا اور وہ اپنے کمرے میں چلی گئی۔

عالیہ نے بڑی خاموشی سے سب سنا، دیکھا اور کڑھ کر رہ گئی، بڑے چچا کا جھکا ہوا سر دیکھ کر اس کا دل تڑپ اٹھا تھا۔ کاش بڑے چچا سے اب کوئی کچھ نہ کہے۔ انھیں ان کے حال میں مست رہنے دیا جائے مگر یہاں تو کوئی انھیں معاف کرنے کو بھی تیار نہیں

کھانے کے بعد بڑے چچا بیٹھک میں چلے گئے تو عالیہ نے بڑی منتوں سے بڑی چچی کو کھانا کھلایا۔ آج تو وہ پیٹ کے دوزخ کو پاٹنے کے لیے بھی تیار نہ تھیں۔

کریمن بوا، بڑی بھابھی سے پوچھو کہ میں بمبئی جا کر شکیل کو تلاش کر دوں "

جب عالیہ اپنے بستر پر لیٹ رہی تھی تو اسرار میاں کی کپکپاتی آواز اس کے کلیجے کے پار ہو گئی۔ کیا سچ مچ یہ آواز اسرار میاں کی تھی اسے یقین نہ آ رہا تھا۔

(۳۱)

امتحان کے بعد جب عالیہ نے سر اٹھایا تو بہار جا چکی تھی۔ ہواؤں میں گرمی بس گئی تھی۔ نالی سے ڈھیروں پانی کیاری میں بہتا مگر پھولوں پر رونق نہ آتی۔ پتیاں مرجھا مرجھا کر جھڑتی رہتیں۔ سارے بیاس کے ننھی ننھی چڑیوں کی چونچیں کھلی رہیں اور چوں کے۔ پاس کام کرتے ہوئے کریمن بوا کے ہاتھ سے پنکھیا نہ چھوٹتی۔ شام کو صحن ٹھنڈا کرنے کے لیے کتنی ہی پانی کی بالٹیاں چھڑک دی جاتیں۔ پھر بھی سکون نہ ملتا۔ سارا ماحول جل رہا تھا۔

ان بے کار، ویران اور گرم دنوں میں بڑی چچی نے تھمی کے جہیز کے پانچ جوڑے کپڑے اس کے سپرد کر دیے تھے۔ دوپہر میں جب سناٹا چھا جاتا تو وہ مشین پر کپڑے

سینے بیٹھ جاتی ۔ بڑی چچی سے تو اب کچھ بھی نہ ہوتا تھا ۔ ہر وقت بُجھی بُجھی سی رہتیں ۔ ان کا کسی کام میں جی نہ لگتا ۔ اور اماں تو ویسے بھی چھمی کو برداشت نہ کرتیں ۔ ان کا بس چلتا تو جہیز کے کپڑوں سے چھمی کا کفن سی ڈالتیں ۔ بس ایک عالیہ رہ گئی تھی جو بڑے خلوص سے جہیز سی رہی تھی اور ہر وقت چھمی کے اچھے نصیب ہونے کی دعائیں کر رہی تھی ۔

ادھر چھمی تھی کہ اپنے نصیب کی بازی لگنے سے بے خبر سارے گھر میں اُودھم ڈھاتی پھر رہی تھی ۔ منظور کی محبت نے جو ذرا سی سنجیدگی پیدا کر دی تھی وہ بھی ختم ہو گئی تھی ۔ بڑے چچا کو دیکھتے ہی اُسے پاکستان کا خیال ستانے لگتا ۔ انگریزوں کو وہ بے نقط سُناتی کہ اماں کے چھکے چھوٹ جاتے اور جب سب کو چڑا چڑا کر وہ تھک جاتی تو پھر عالیہ کے پاس آ گھُستی ۔ "اے بجیا یہ کس کے کپڑے سِل رہے ہیں ، ہے اللہ کتنے پیارے ہیں ، یہ کون پہنے گا ۔ ؟" وہ اٹھلا کر پوچھتی ۔

"کسی کے ہیں چھمی ۔" عالیہ لرز کر بہانہ کرتی کہ کہیں سچی بات کا پتہ نہ چل جائے ۔

"ایک دوپٹہ ہمیں دے دیجئے ۔ اس میں سے لچکا لگا کر اوڑھوں گی ۔" وہ چنتے ہوئے دوپٹے کو اٹھا کر مروڑنے لگتی ۔ "وہ دیکھئے میرا دوپٹہ کیسا لتے ہو رہا ہے ۔"

"چھوڑو چھمی ۔ چنٹ کھُل جائے گی ۔" عالیہ دوپٹہ چھیننے لگتی ۔

"آخر یہ ہیں کس کے جہیز کے ، بے چاری بتا بھی نہیں سکتیں ، زبان تھکتی ہے ۔" مارے تجسس کے چھمی لڑنے پر آمادہ ہو جاتی ۔

"میں تم کو بتیوں گی جو مجھ سے لڑیں ۔" عالیہ بڑے پیار سے اپنی بڑائی کا رعب ڈالتی تو چھمی ہنسنے لگی ۔

آج وہ پھر بھی کیسا سناٹا تھا ۔ وہ چھمی کے دوپٹہ میں کرن ٹانک رہی تھی اور اپنے مستقبل کے خیال کو جان پر نازل کیے جا رہی تھی ۔ اگر وہ فیل ہو گئی تو کیا ہوگا ۔ اگر پاس

ہوگئی تو لے دے کے ایک ہی بات رہ جاتی ہے کہ بی ٹی کرے۔ اُستانی بن جائے مگر کیا وہ بی ٹی کر سکے گی۔ کیا اماں اسے علی گڑھ جانے دیں گی۔ اور کیا ماموں اسے اتنے روپے بھجواتے رہیں گے

ہائی اسکول کے احاطے میں آم کے درختوں پر کوئل مسلسل چیخے جا رہی تھی۔ اور پاس کے کمرے میں سوئی ہوئی نجمہ پھوپھی کے خراٹے چھت سر پہ اٹھائے ہوئے تھے اس کا جی چاہا کہ وہ بھی سو جائے اور اتنے خراٹے لے کہ نجمہ پھوپھی اپنی بے فکر نیند سے چونک پڑیں اور پھر ساری دوپہر بیٹھ کر کاٹ دیں۔

بالم آئے بسو مورے من میں۔ جل جلاتی دھوپ سے بچنے کے لیے کوئی راہ گیر بالم کا سایہ تلاش کرتا گلی سے گزر گیا۔

وہ ایک لمحے کو گلی میں جھانکی اور پھر کرن ٹانکنے لگی۔ کتنی صدیاں گزر گئیں۔ مگر ان بالم صاحب کی سج دھج میں فرق نہ آیا۔ کتنوں کو قبر میں سُلا دیا۔ مگر خود موت کا مُنھ تک نہ دیکھا۔

"کیا ہو رہا ہے۔ جمیل بھیا نے آتے ہی پوچھا۔

آج کتنی ہی مدت کے بعد وہ پھر اس کے پاس آ بیٹھے تھے — لو ایک اور بالم صاحب آ گئے۔ عالیہ بوکھلا کر اُلٹے سیدھے ٹانکے مارنے لگی۔ "تہمی کا ڈوپٹہ ٹانک رہی ہوں۔"

وہ ڈوپٹے کا ایک سرا پکڑ کر یوں ہی اُلٹنے پلٹنے لگے۔ عالیہ نے نیچی نیچی نظروں سے دیکھا کہ آج پھر ان کی آنکھوں میں پاگل پن جھانک رہا تھا۔ اور چہرے پر زندگی سے تھک جانے کے آثار اُمڈ رہے ہیں۔ ہائے یہ کون سا جذبہ ہے جو اتنی جھڑکیاں کھانے کے بعد بھی ختم نہیں ہوتا۔

"اچھا، تو تہمی بی بی کا جہیز تیار ہو رہا ہے" وہ جیسے بات کرنے کی خاطر بولے۔

"ہاں جمیل بھیا، ابھی خیر ہے۔ خوب سوچ لیجیے"

"عالیہ،" مارے غصے کے جمیل بھیا ایک دم چپ ہو گئے "تم مجھے چڑا کر خوش ہوتی ہو؟" چند لمحوں بعد وہ بولے تو ان کی آواز میں لرزش تھی۔

"بھئی حد ہے، آپ تو ذرا ذرا سی بات پر ناراض ہوتے ہیں۔" وہ ہنسنے لگی۔ اس نے سوچا کہ بات یوں ہی ہنسی میں ٹل جائے تو ٹھیک ہے۔ جمیل بھیا تو سخت سنجیدہ ہو رہے تھے

"عالیہ!" انھوں نے پکارا۔

"ہوں۔" عالیہ نے سر تک نہ اٹھایا۔

"ذرا یہ دوپٹہ تو اوڑھ کر دکھاؤ۔" ان کی آواز جذبات کے بوجھ سے بھاری ہو رہی تھی

"کیوں — ؟"

"بس یہی دیکھنا چاہتا ہوں کہ تم دلھن بن کر کیسی لگو گی۔"

"آپ کی دلھن کے لیے بھی ایسا دوپٹہ ٹانک دوں گی۔"

"میری کوئی دلھن نہیں۔"

"کہیے تو آپ کی چار شادیاں کرا دوں۔؟"

"بیویوں کا کیا ہے۔ وہ تو بہت سی مل جائیں گی مگر مجھے میری دلھن کبھی نہ ملے گی۔ تم میری شادیاں کرنے کی زحمت نہ کرو تو اچھا ہے۔"

جمیل بھیا کی آنکھوں میں ایسا دکھ تھا کہ وہ ڈوب کر رہ گئی۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے دوپٹہ کو اس طرح تان لیا جیسے اب سر پہ ڈال لے گی۔ وہ اس وقت تو جمیل بھیا کی فرمائش ضرور پوری کر دے گی۔ جمیل بھیا اسے کس شوق سے دیکھ رہے تھے۔ پھر ایک دم جیسے وہ چونک پڑی۔ اس نے دوپٹے کو لپیٹ کر ایک طرف رکھ دیا اور ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ اگر آج اس نے یہ دوپٹہ اوڑھ لیا ہوتا تو پھر یہی دوپٹہ گھونگھٹ بن جاتا۔ اور یہ گھونگھٹ اس کی آنکھوں پر پردہ بن کر پڑ جاتی۔ اس گھر میں ایک اور بڑی بچی زندگی کی

راہ پر بھٹکنے کے لیے جنم لے لیتی اور پھر ملک آزاد ہوتا رہتا۔

"تم یہ دوپٹہ اوڑھنا چاہتی ہو مگر بزدل ہو۔" جمیل بھیا پھر آپے سے باہر ہونے لگے "جانے تم کس قسم کی لڑکی ہو۔"

"جمیل بھیا صاحب، آپ اپنی اماں کی زندگی سے عبرت حاصل کیجیے، کسی سیدھی سادی عورت سے شادی کر لیجیے۔ اور بس، وہ سب سہہ جائے گی۔"

جمیل بھیا نے اسے غور سے دیکھا، شاید وہ اس کے طنز کی گہرائی کو پار کر گئے تھے۔ "مجھے نہیں معلوم کہ میرے باپ کس مٹی کے بنے ہیں، بہرحال یہ خیال غلط ہے کہ ملک کا غم گھروں کے غموں سے نجات دلا دیتا ہے۔ یا سیاست میں حصہ لینے والے کسی سے محبت نہیں کرتے۔" وہ جانے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے "تم اس شخص کے دکھ کا اندازہ لگا ہی نہیں سکتیں جس کا کوئی ارمان پورا نہ ہوا ہو۔"

وہ ذرا دیر ٹھہر کر چلے گئے مگر عالیہ نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ جواب دینا بھی نہ چاہتی تھی۔ اس وقت جمیل بھیا کے سامنے وہ کسی ڈھٹائی کا مظاہرہ کرنے کی طاقت نہ رکھتی تھی۔ اس وقت اسے ان کے دکھ کا احساس ہو رہا تھا۔ مگر ان دکھوں کا علاج اس کے بس میں نہ تھا۔ اس نے پھر سے دوپٹہ ٹانکنا چاہا مگر جی نہ لگا۔ ناامیدیوں کے بیلوں کے بیچ کا ٹانکنا کتنا بوجھل ہو رہا تھا۔ وہ بڑی دیر تک یوں ہی خالی الذہن سی پڑی ادھر ادھر دیکھتی رہی۔

شام کو جب وہ نیچے اتری تو کریمن بوا صحن میں پانی چھڑک رہی تھیں، جمیل بھیا لوہے کی کرسی پر بیٹھے انگلیاں مروڑ رہے تھے، اور بڑے چچا برآمدے میں ٹہل ٹہل کر جیسے کسی چیز کا انتظار کر رہے تھے۔ ان کا چہرہ اترا ہوا تھا۔ اور آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ بڑی چچی سب سے بے نیاز تخت پر بیٹھی اکو جھیل رہی تھیں۔

"بڑے چچا۔ آپ کی طبیعت کیسی ہے؟" عالیہ نے بڑے چچا کے قریب جا کر پوچھا۔

"سر میں درد ہے بیٹی۔"

بڑی چچی نے چونک کر اپنے شوہر کی طرف دیکھا — "کریمن بوا جلدی سے پلنگ بچھا دو۔ بس صحن ٹھنڈا ہو گیا۔"

"ناس جائے اس درد کا۔" کریمن بوا برآمدے میں ایک طرف کھڑے ہوئے پلنگ اُٹھا اُٹھا کر آنگن میں بچھانے لگیں۔

بڑے چچا جمیل بھیا کی طرف سے کروٹ لے کر لیٹ گئے۔ عالیہ کو سخت کوفت ہو رہی تھی کہ بیٹا پاس بیٹھا ہے مگر باپ کو پوچھتا تک نہیں۔ کتنا عرصہ ہو گیا۔ دونوں کے درمیان بات چیت بند تھی۔

"تم آج دو دن سے گھر میں کیوں بیٹھے رہتے ہو؟" بڑی چچی نے جمیل بھیا کی طرف دیکھا۔

"نوکری چھوٹ گئی ہے اماں، سرکار کے دفتر میں سیاسی لوگوں کا گزارا مشکل ہی سے ہوتا ہے۔"

عالیہ نے جل کر جمیل بھیا کو دیکھا۔ خوب، اسی برتے پر اپنی دھن تلاش ہو رہی تھی۔ اس نے سوچا اور پھر جمیل بھیا کو گھٹتی ہوئی نظروں سے دیکھ کر منھ پھیر لیا۔

"مسلم لیگیوں کی کھپت تو انگریز بہادر کے دفتروں ہی میں ہوتی ہے۔" بڑے چچا نے کروٹ بدلے بغیر کہا۔

"آپ کا خیال بالکل غلط ہے۔" اصل بات تو یہ ہے کہ جب کانگرسی سفارش کر دیتے ہیں تو پھر نوکری مل جاتی ہے۔" جمیل بھیا بھی کیوں چپ رہتے۔

"ہوں۔"

باپ بیٹے دونوں ہی اپنے طنز کی آگ میں جل کر خود بخود بجھ گئے اور دونوں نے اس طرح منھ پھیر لیا۔ جیسے ایک دوسرے کو بات کرنے کے لائق نہ سمجھ رہے ہوں۔ عالیہ نے

جمیل بھیا کو ملامت بھری نظروں سے دیکھا اور بڑے چچا کے پاس بیٹھ کر ہولے ہولے سر سہلانے لگی۔ اماں گیلے بال جھٹکتی ہوئی غسل خانہ سے نکل آئیں اور سب کو ایک جگہ جمع دیکھ کر بڑی بیزاری سے پاندان اُٹھا کر آخری پلنگ پر جا بیٹھیں۔

"اب کیا ہوگا"؟ بڑی چچی نے جمیل بھیا سے پوچھا۔

"فکر نہ کیجئے اماں، ایک بڑی اچھی نوکری ملنے والی ہے۔ آپ سب کے ٹھاٹ ہو جائیں گے"

"شکیل کی بھی کوئی خیریت معلوم ہوئی یا نہیں؟" بڑی چچی نے اچانک پوچھا۔

اماں آپ اس کی فکر نہ کیا کیجئے۔ وہ بڑے مزے میں ہے۔ یہاں کے سارے دُکھ بھول گیا ہوگا" جمیل بھیا نے پھر بڑی صفائی سے جھوٹ بولا۔ انھوں نے عالیہ کو ساری حقیقت بتا دی تھی کہ انھیں شکیل کا پتہ تک نہیں معلوم۔

"خیر جہاں رہے خوش رہے" بڑی چچی نے ٹھنڈی آہ بھری۔

"بڑے چچا آپ کا پلنگ باہر چبوترے پر بچھوا دوں، کھلی فضا میں درد کم ہو جائے گا" عالیہ نے پوچھا۔ دو مختلف کٹر نظریات ایک جگہ جمع ہو جاتے ہیں۔ تو اُسے ڈر لگنے لگتا۔ شکیل کے ذکر سے وہ پریشان تھی۔ جمیل بھیا موقع پر چوکنے کا نام نہ لیتے۔

"ہاں وہیں بستر لگوا دو تو بڑا اچھا ہو" بڑے چچا نے اسے ممنونیت سے دیکھا اور پھر باہر جانے کے لیے اُٹھ کھڑے ہوئے۔

گلی میں کانگریسی بچوں کا جلوس نکل رہا تھا وہ بڑے بے ہنگم طریقے سے شور مچا رہے تھے "جھنڈا اونچا رہے ہمارا" "کانگریس زندہ باد" "گاندھی جی زندہ باد۔ جواہر لال نہرو زندہ باد" "ہندوستان نہیں بٹے گا۔ جھنڈا اونچا رہے ہمارا"

بڑے چچا کے ہونٹوں پر ایک مبہم سی مسکراہٹ پھیل گئی اُن کی آنکھیں چمک رہی تھیں جمیل بھیا ہنس رہے تھے۔ اور اماں جو بڑی دیر سے چپ بیٹھی چھالیہ کاٹ رہی تھیں۔ آخر

بول ہی پڑیں "پہلے آزادی تو مل جائے۔ پھر سب ہوتا رہے گا۔ اور پھر یہ ہندوستانی لوگ پہلے حکومت کرنا بھی تو سیکھ لیں۔"

سب چُپ رہے کسی نے بھی تو اماں کو جواب نہ دیا۔ باہر بڑے چچا کا بستر لگ گیا تھا۔ وہ چلے گئے اور جمیل بھیا پھر انگلیاں مروڑنے لگے۔ جلوس کا شور دروازے کے قریب ہوتا جا رہا تھا چھمی دیوانوں کی طرح بھد بھد کرتی اپنے کمرے سے نکل پڑی۔ "اگر میرے دروازے کے پاس سے جلوس نکلا تو ڈھیلے ماروں گی۔" وہ دروازے کی طرف لپکی۔

"خبردار جو آگے بڑھیں بیٹھ جاؤ چپکے سے۔" جمیل بھیا زور سے گرجے اور چھمی جانے کے رعب میں آ گئی اس نے جمیل بھیا کو گھور کر دیکھا اور بڑبڑانے لگی "ہونہہ بڑے آئے بے چارے آج ہی مسلم لیگ کا جلوس نہ نکلا ہو تو میرا نام چھمی نہیں۔" جلوس دراصل دروازے کے پاس سے گزر گیا۔ تو جمیل بھیا کپڑے بدل کر باہر چلے گئے۔ چھمی جیسے ان کے جانے کا انتظار کر رہی تھی۔ جمیل بھیا کے جاتے ہی برقع اوڑھ کر خود بھی باہر نکل گئی۔ عالیہ اُسے روک نہ سکی۔

زمانے زمانے کی بات ہے۔ پہلے تو جب بی بیاں گھروں سے نکلتیں تو دو دو چار چار مامائیں ساتھ ہوتی تھیں۔" کریمن بوا چھمی کے یوں باہر نکل جانے پر ہمیشہ کڑھا کرتیں۔

عالیہ نے کواڑوں کی اوٹ سے جھانک کر باہر دیکھا بڑے چچا اپنے صاف ستھرے بستر پر پاؤں پھیلائے سکون سے لیٹے تھے اور اسرار میاں ان کے قریب آرام کرسی پر بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ سامنے بیل کے گھنے درخت سے چاند کی روشنی ابھرتی معلوم ہو رہی تھی عالیہ کا جی چاہ رہا تھا کہ وہ بھی باہر چبوترے پر جا بیٹھے۔ اسرار میاں کی باتیں سُنے۔ انھیں پاس سے دیکھے۔ وہ کس طرح بولتے ہیں، وہ کیسی باتیں کرتے ہیں وہ جو اس کے دادا کی بدنیتی کا نتیجہ ہیں۔ ان کی سان کی آنکھوں میں کونسی کیفیت ہوگی۔ اپنے آپ کو پہچاننے کے بعد کون سے اثرات ان کے چہرے پر لرزاں ہوں گے۔ وہ کیا سوچتے ہوں گے اور جب

وہ یہ سب کچھ معلوم کرے گی تو ایک بار انہیں چپکے سے اسرار چچا کہے گی کہ وہ بھی اسے بڑے چچا کی طرح عزیز ہیں وہ ان کی بے حد عزت کرتی ہے۔ اور زندگی میں ایک بار ان کی خدمت کرنا چاہتی ہے اور وہ ان کے دل سے ان تمام تیروں کو کھینچ پھینک دے گی جو کرمن بوا نے پیوست کیے ہیں۔ وہ انہیں سمجھائے گی ان کی کسی بات کا برا نہ مانا کریں۔ وہ کسی کی دشمن نہیں وہ خود کچھ نہیں کہتیں۔ یہ ظالم تنہائی ان سے سب کچھ کہلواتا ہے۔

"عالیہ بیٹی۔ ایک پان کھلا دو۔" بڑی چچی نے فرمائش کی۔ تو وہ تخت پر آ بیٹھی اور پاندان کھول کر پان بنانے لگی۔ باہر چبوترے پر جا کر نہیں بیٹھ سکتی۔ اسے عجیب سی بے بسی کا احساس ہو رہا تھا۔

محلے کی مسجد سے اذان کی آواز آ رہی تھی۔ اس نے مارے احترام کے ساری کا پلو سر پر ڈال لیا۔ کرمن بوا جلدی جلدی لالٹینیں جلا رہی تھیں۔

"اللہ شکیل کو خیر سے رکھیو۔" بڑی چچی دونوں ہاتھ پھیلا کر دعا کرنے لگیں۔ وہ اس وقت کتنی دکھی اور مامتا سے بھرپور نظر آ رہی تھیں۔

اندھیرا ہر طرف در آیا تھا۔ مگر چھمی اب تک گھر نہیں لوٹی تھی۔ عالیہ کو خواہ مخواہ فکر ہو رہی تھی۔ اپنے گھر میں اور کسی نے نہ پوچھا کہ وہ ہے کہاں۔

ذرا دیر بعد چھمی آئی تو منہ سرخ ہو رہا تھا۔ سانس پھولی ہوئی تھی۔ "اے بجیا میں نے ایسا شاندار جلوس تیار کرایا ہے کہ آپ دیکھتی رہ جائیں گی۔ بس ذرا دیر میں ادھر سے گزرنے والا ہے۔ عذرا کی اماں نے جھنڈا بنایا۔ طاہرہ کی اماں نے ایک بوتل مٹی کا تیل دیا تھا۔ میں نے مشعلیں تیار کیں۔ سارے محلے کے لڑکوں کو جمع کر دیا ہے۔ ہائے بڑے چچا دیکھیں گے تو آنکھیں کھل جائیں گی۔ میں نے سارے بچوں کو سمجھا دیا ہے کہ میرے دروازے پر آ کر خوب نعرے لگائیں۔" چھمی ایک ہی سانس میں سب کچھ کہہ گئی۔ اور پھر برقعہ پھینک کر جلوس

کے انتظار میں ٹہلنے لگی۔

خوشیوں کا کوئی پیمانہ اس وقت چھمی کی مسرت کو نہیں ناپ سکتا تھا۔ عالیہ نے اسے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ پریشان ہو رہی تھی کہ کہیں یہ ننھے منے بچوں کا جلوس گھر میں فساد نہ کرا دے۔ اس نے یہی بہتر سمجھا کہ اوپر اپنے کمرے میں کھسک لے۔ دور سے بچوں کے نعروں کی آواز آ رہی تھی۔

بڑے کمرے سے گزرتے ہوئے اس نے دیکھا کہ نجمہ پھوپھی اپنے صاف ستھرے بستر پر بیٹھی کوئی موٹی سی کتاب پڑھ رہی ہیں۔ گرمیوں میں بڑی چھت پر نجمہ پھوپھی کا ڈیرہ جمتا تھا اس لیے وہ اپنے کمرے کے پاس والی چھوٹی چھت پر گزارا کر لیتی۔ اتنی قابل نجمہ پھوپھی کا اور اس کا ساتھ کیسے ہو سکتا تھا۔

جلوس قریب آ گیا۔ بچے بڑے زور زور نعرے لگا رہے تھے "مسلم لیگ زندہ باد قائد اعظم زندہ باد"، "بن کے رہے گا پاکستان"، "دھتیا راج نہیں ہوگا، چُٹیا راج نہیں ہوگا۔"

عالیہ چھت کی منڈیر سے جھک کر گلی میں جھانکنے لگی، دو بڑے لڑکے مشعلیں اُٹھائے سب سے آگے تھے۔

"نہیں دیکھنے دیا ظالم نے ---" چھمی بھاگتی ہوئی آئی اور عالیہ کے برابر کھڑے ہو کر نیچے گلی میں آدھی لٹک گئی --- "ہائے کیا شاندار جلوس ہے، وہ آپ کے بڑے چچا نے مجھے دروازے سے جلوس نہیں دیکھنے دیا۔ جل کر خاک ہو گئے حضرت۔"

"چھمی ذرا سرک کر جھانکو کہیں جلوس کے ساتھ تمھاری لاش بھی نہ نکل جائے۔" عالیہ نے چھمی کے لٹکے ہوئے دھڑ کو اپنی طرف کھینچا۔

"ہائے بجیا۔ میں نے مشعلیں کیسی اچھی بنائی ہیں۔ ہیں نا؟" چھمی نے داد طلب نظروں سے دیکھا --- "مگر آج آپ کے بڑے چچا جلتے جلتے ختم ہو جائیں گے۔"

"چھمّی، کیسی باتیں کرتی ہو۔ بس پتہ چل گیا کہ لگی وگی کچھ نہیں ہو، بڑے چچا کو جلانے کے لیے یہ سوانگ رچایا ہے۔"

"واہ، ہوں کیوں نہیں۔" وہ شرمندہ سی ہو گئی اور عالیہ کے گلے میں ہاتھ ڈال کر جھول گئی۔

جلوس گلی کے موڑ پر غائب ہو گیا۔ تو تھکی تھکی سی چھمّی عالیہ کے بستر پر لیٹ کر لمبی لمبی سانسیں لینے لگی، اور عالیہ خاموشی سے ٹہلتی رہی۔ اب کتنے دن یوں سب کو جلانے کے لیے چھمّی بیٹھی رہے گی۔ آخر تو ایک دن اپنے گھر چلی ہی جائے گی، جانے وہ گھر بھی اس کا گھر بنے گا کہ نہیں۔ چھمّی کو وہاں محبت ملے گی یا نہیں کیا وہاں بھی سب سے بدلے چکانے کے طریقے ایجاد کر کے زندگی گزارے گی۔

"عالیہ بٹیا اور چھمّی بٹیا دونوں کھانا کھانے نیچے آجاؤ۔" کریمن بوا کی آواز آئی۔

(۳۲)

وہ پاس ہو گئی تھی مگر اب پورا سال برباد جا رہا تھا۔ وہ بی۔ٹی کرنے علی گڑھ نہ جا سکی بس اتنی سی بات تھی کہ وہ اپنے قلم سے لکھ کر ماموں سے زیادہ روپوں کی فرمائش نہ کرنا چاہتی تھی۔ جب اماں سے بات ہوئی تو انھوں نے بڑے لاڈ سے کہا تھا کہ اپنے ماموں کو لکھو۔ وہ زیادہ روپے بھجوا دیں گے۔ اس وقت عالیہ نے سختی سے انکار کر دیا تھا اس نے یہ تک کہہ دیا تھا۔ کہ وہ انھیں خط لکھنا پسند نہ کرتی تھی۔ بس اسی دن سے اماں نے منھ پھلا لیا تھا اپنے بھائی اور انگریز بھاوج کے لیے اپنی اکلوتی اولاد کے دل میں عناد پا کر ان کے تن بدن میں آگ لگ گئی تھی انھوں نے عالیہ سے بات کرنا چھوڑ دی تھی اور اسی طرح ایک قیمتی سال ضد کی بازی پر ہار دیا تھا۔ سارے ارد و کر بی اے کر لیا، یہی غنیمت ہے اور کر بھی کیا سکتی تھی، غریب، ایک دن تجربہ بھی

بول ہی پڑیں۔ شاید انھیں یقین ہوگا کہ بس اب تعلیم کا سلسلہ ختم۔ عالیہ نے سُن کر مُنھ پھیر لیا۔ وہ اس کے ابّا کی بہن تھیں۔ وہ ان کے مُنھ نہ لگنا چاہتی تھی۔ اگر اس کے حالات نہ خراب ہوتے تو ایم اے بھی اُردو ہی میں کرتی۔ اردو تو اس کی مادری زبان تھی اس کے جیتے چچا کی زبان تھی۔ بڑے چچا تو انگریزی تو زبان تک سے نفرت کرتے تھے۔ انھیں کے کہنے سے اس نے بی اے میں اُردو بھی لی تھی اُسے خود انگریزی زبان سے نفرت نہ تھی اور نہ وہ نالائق تھی وہ تو انگریزی میں ایم اے کرکے تجمہ پھوپھی کے مُنھ پر اپنی ڈگری مار سکتی تھی۔ مگر یہ سب کچھ کرنے کے لیے اُسے بڑے چچا کا حکم ٹالنا پڑتا۔

ستمبر کی بیس تاریخ چھمّی کے نکاح کے لیے مقرر ہو چکی تھی۔ امّاں کے لاکھ منع کرنے کے باوجود عالیہ نے چھمّی کا سارا جہیز تیار کیا تھا۔ اسرار میاں نے بازار کے پچاسوں چکر لگانے کے بعد چھمّی کے جہیز کے برتن خریدے تھے۔ نقشین لوٹا، کٹورا، جگ، اگالدان، پاندان، دو پتیلیاں اور چھ پلیٹیں جب بکس میں رکھی جا رہی تھیں تو کریمن بوا دیر تک سر پکڑے بیٹھی رہیں۔ ان کی آنکھوں کو یہ زمانہ بھی دیکھنا تھا کہ اُن کے مالک مرحوم کی پوتی کو ایسا جہیز دیا جائے، اچھے زمانے میں تو ایسا جہیز باندیوں کی بیٹیوں کو دے کر رخصت کیا گیا تھا۔ بس اتنا ہی فرق تھا کہ وہ برتن نقشین نہ ہوتے تھے۔

جب بڑی چچی برتن بند کرکے اٹھیں تو کریمن بوا کو بے تحاشا رونا آگیا۔ بڑی چچی نے انھیں سمجھا بجھا کر بڑی مشکل سے چُپ کرایا۔ کیا فائدہ تھا جو چھمّی کو پہلے سے خبر ہو جائے سب اُس سے ڈرے ہوئے تھے، بڑے چچا کی لگائی ہوئی شادی سے کہیں انکار ہی نہ کر دے۔

بڑی چچی کو شادی کے دن کا سخت انتظار تھا۔ شادی میں شریک ہونے کے لیے ساجدہ آپا بھی آ رہی تھیں۔ ساجدہ آپا کی شادی کو کتنا عرصہ گزر گیا تھا مگر بڑی چچی گھر کے دھندوں سے چھوٹ کر ایک دن کے لیے بھی اپنی بیٹی کے گھر نہ جا سکیں۔ ساجدہ آپا شروع شروع میں تو گھر آتی رہیں

پھر جیسے سب کی طرف سے صبر کر کے بیٹھ رہیں۔ یہاں تو ساجدہ آپا کے لیے کون بکھیڑا کیا جا رہا تھا۔ عالیہ نے شاید دو چار دفعہ ہی اُن کا ذکر سُنا تھا۔ پھر میکے میں ان کے لیے کون سے جوڑے بنا کر رکھے تھے جنھیں لے کر خوشی خوشی رخصت ہوتیں اُدھر ان کے میاں بھی یہاں آنے سے کتراتے۔ جب سے کانگریس کو خیرباد کہا تو بڑے چچا بھی چھوٹ گئے تھے ان کے سامنے کس منہ سے آتے۔

جوں جوں شادی کے دن قریب آ رہے تھے۔ عالیہ کو یہ فکر ستا رہی تھی کہ وہ تہمی کو کیا دے۔ اماں نے تو اپنے جہیز کے کپڑوں سے لگا ہوا جوڑا نکال کر تہمی کے نام کر دیا تھا اس طرح وہ اپنے فرض سے سبکدوش ہو گئی تھیں۔ اُنھوں نے عالیہ سے مشورہ تک نہ کیا تھا عالیہ کو اپنی اماں کی اس زیادتی کا شدت سے احساس تھا۔ اُدھر بڑی چچی بھی عالیہ سے کچھ کم پریشان نہ تھیں۔ جمیل بھیا کو روزانہ ٹوکے دیتی رہتیں کہ کچھ روپے کا انتظام کر کے تہمی کے لیے کپڑا خرید لاؤ۔ جمیل بھیا ان کی باتیں سُن کر چپ ہو رہتے۔ آج کل ٹیوشنوں سے گھر کا کچھ کام چل رہا تھا۔ نوکری وغیرہ کے سلسلے میں وہ کوئی خاص فکر مند بھی نظر نہ آتے مُسلم لیگ کے کارکنوں نے اُنھیں دُنیا کی فکروں سے نجات سی دلا دی تھی۔ مگر جمیل بھیا کے سلسلے میں بڑی چچی بھی ہار ماننے والی نہ تھیں۔ جب بھی وہ گھر میں آتے، پیچھے پڑ جاتیں۔

"تم کو کب ملے گی نوکری۔ مہنگائی نے کھا لیا ہے۔ گھر میں دھیلا نہیں پھر تہمی کی شادی کے دن قریب ہیں۔ کیا تمہاری مُسلم لیگ نے کچھ دینے کا وعدہ کر رکھا ہے؟"

"سب کچھ ہو جائے گا اماں آپ پریشان نہ ہوجیے"۔ جمیل بھیا شرمندہ ہو جاتے۔

"میں کوئی ابا کی طرح ہوں جو اپنے گھر کو تباہ ہوتے دیکھوں گا"

"ابا کے طعنے مت دو کچھ کر کے دکھاؤ"

"اماں میں تو سب کچھ کرنے کو تیار ہوں مگر کوئی کرنے نہیں دیتا" وہ عالیہ کی طرف

دیکھنے لگتے تو وہ منھ پھیر لیتی ۔

کون نہیں کرنے دیتا ۔ میں اس کا کلیجہ کھالوں گی ، وہی نا تمھاری مسلم لیگ ۔" ؟

" نہیں اماں ۔" جمیل بھیا زور سے ہنستے تو عالیہ اپنے کمرے میں پناہ لینے چلی جاتی ۔ اتنی فضول باتیں سن کر وہ اکتا جاتی ۔

ادھر کچھ دنوں سے چھمی بالکل خاموش رہنے لگی تھی ۔ جانے اسے کیا ہو گیا تھا ۔ کوئی بات کرتا تو اس طرح جواب دیتی ۔ جیسے بار گزر رہا ہو ۔ کھانا کھانے کے لیے اپنے کمرے سے نکلتی اور پھر جا چھپتی ۔ بہت ہوتا تو گراموفون پر ریکارڈ بجانے لگتی ۔ اس کے چہرے سے ساری شگفتگی غائب ہو گئی تھی ۔ عالیہ اسے یوں چپ چاپ دیکھ کر مارے فکر کے گھلی جاتی ۔ کہیں چھمی کو اپنی شادی کے سلسلہ میں شبہ نہ ہو گیا ہو ۔ کہیں وہ بڑے چچا کی عزت برباد نہ کر دے ۔ یہ چھمی ہے ۔ ساجدہ آپا نہیں ہو سکتا ہے وہ یوں ہی چپ ہو ۔ وہ اپنی اتنی سی عمر میں اتنا بول چکی ہے کہ اب تک تھک گئی ہو گی اور کیا پتہ وہ منظور کی جدائی میں سوگوار ہو مگر چھمی منظور سے محبت کب کرتی تھی وہ تو اسے صرف سہارا سمجھتی تھی ۔ اس کی محبت سے لطف لیتی تھی ۔ عالیہ ، چھمی کے سلسلے میں سوچ سوچ کر تھکی جاتی ۔ لاکھ اس کے ساتھ سر کھپاتی مگر چھمی ٹھی ٹھی کر کے ٹال دیتی ۔

بڑے چچا دلی گئے ہوئے تھے ۔ بیٹھک سونی پڑی تھی ۔ جمیل بھیا بھی آج صبح سے غائب تھے ۔ چھمی گونگی بن گئی تھی اور یہ بادلوں سے لدا پھندا دن بے حد اداس ہو رہا تھا ۔ کوئی کام نہ تھا جس سے عالیہ اپنا جی بہلا لیتی ۔ چھمی کا جہیز تیار ہو چکا تھا ۔ بڑے چچا کی لائبریری سے کتابیں پڑھتے پڑھتے تھک چکی تھی اور اب آج اس کی سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ کیا کرے ۔ یہ رینگتا ہوا دن کسی طرح تو کٹے اور کچھ نہیں تو چھمی ہی اسے چھیڑے ۔ اس سے لڑے ، شور کرے یہ ویران خاموشی کسی طرح تو دور ہو ۔

عالیہ چھمی کے کمرے کی دہلیز پہ جا کر کھڑی ہو گئی۔ "اور نہیں چلتیں میرے کمرے میں"
اس نے پوچھا۔

"مجھے نیند آرہی ہے بجیا۔" چھمی نے کروٹ بدل لی۔ اس نے اپنی مسہری سے
اُٹھنے کی زحمت تک نہ کی۔

دو تین گھنٹے کی بارش نے جیسے ساری ویرانی اور اُداسی کو دھو دیا تھا۔ شام کو
جب جمیل بھیا گھر آئے تو وہ بھی خوش نظر آرہے تھے۔ عالیہ نے سوچا کہ آج یہ حضرت
خوش کیوں ہیں، کون سا کارنامہ انجام دے کر آئے ہیں جو آج اسے دیکھنے کے بعد
بھی صورت پر ماتم نہ برسا وہ تو جیل بھیا کے لیے سچ مچ تعزیہ بن گئی تھی۔

"اماں، حیدرآباد سے ظفر چچا کا خط آیا ہے اور مزے کی بات یہ ہے کہ میرے نام
ہے۔" وہ لوہے کی کرسی پر بیٹھ کر سب کی طرف دیکھ کر ہنسے۔ "بھئی یہ انھیں میری شکایتیں
کون لکھتا ہے، میری بیکاری کی کس نے اطلاع دی ہے۔؟"

"تمھاری نجمہ پھوپھی سے خط و کتابت ہے، انھوں نے لکھا ہے۔ اور تو کسی کو پوچھتے
بھی نہیں۔" بڑی چچی نے کہا۔

"میری شکایتیں لکھنے کی وجہ سے خط و کتابت ہو گی، بھلا میرا کوئی کیا بگاڑ رہے گا۔"
چھمی اپنے کمرے کی دہلیز پر بیٹھے بیٹھے بولی۔

"کیا لکھا ہے انھوں نے؟" اماں نے پوچھا۔

"انھوں نے لکھا ہے کہ حیدرآباد چلے آؤ۔ یہاں کسی چیز کی کمی نہیں۔ یہ ہندوستان
پاکستان کا قصہ چھوڑو۔ یہاں تو بنا بنایا پاکستان ہے۔" جمیل بھیا ہنسنے لگے۔

"تو پھر چلے جاؤ نا، جہاں روپیہ ہے وہاں سب کچھ ہے۔" اماں نے مشورہ دیا۔

"پھر میں سب کچھ بھول جاؤں گا۔ آپ میں سے کوئی یاد نہ آئے گا۔ وہاں کے

پانی کا یہی اثر ہے۔"

"بس یونہی بکواس کرتا رہتا ہے۔" بڑی چچی کو غصہ آ گیا۔ "پھر یہاں کوئی نوکری کرکے دکھانا ۔۔؟"

"نوکری تو مل گئی ہے اماں، بس اب جانے والا ہوں۔" جمیل بھیا نے اطلاع دی۔

"کہاں ۔۔؟" مارے اشتیاق کے بڑی چچی کی آنکھیں کھل گئیں۔

"فوج میں بھرتی ہونے کی درخواست تھی سو منظور ہو گئی اور اب بندہ آپ کو ڈھیروں روپے بھیجا کرے گا۔"

"فوج میں؟" بڑی چچی کی آنکھیں اس طرح ساکن ہو گئیں جیسے وہ مر گئی ہوں۔ ارے تو بولا گیا ہے۔ جمیل پھر مجھے زہر کیوں نہیں دے دیتا۔"

"بھئی حد کرتی ہیں اماں، ہزاروں آدمی فوج میں جاتے ہیں تو کیا سب مر جاتے ہیں اور پھر جناب اگر ہٹلر کا مقابلہ نہ کیا تو انگریزوں سے بدتر ثابت ہوگا۔ اس کی غلامی جھیلنا آسان نہ ہوگی ۔۔۔" جمیل بھیا نے سمجھانا چاہا مگر بڑی چچی بے بسی کی تصویر بنی بیٹھی تھیں عالیہ کا جی چاہا کہ جمیل بھیا کو چیخ چیخ کر کمینہ کہے، ظالم کہے۔ یہ اپنی بے روزگاری دور کرنے نہیں جا رہے ہیں۔ اور یہ نہیں جانتے کہ وہ خود اپنی اماں کے لیے کتنے عظیم ہٹلر ہیں۔

"اب اپنا نام کٹوا دو جمیل میاں۔" کریمن بوا نے بڑی التجا سے دیکھا تو جمیل بھیا ہنس پڑے۔ "کریمن بوا میں تو صرف تمہاری خاطر جا رہا ہوں۔ تمہارا باورچی خانہ آباد ہو جائے گا۔ اور تم گزرے ہوئے زمانے کو بھول جاؤ گی۔"

بڑی چچی رونے کے قریب ہو رہی تھیں۔ "جنگ پر جانے کے بجائے تم بھی شکیل کی طرح بھاگ جاتے تو پھر مجھے صبر آ جاتا۔" وہ رو پڑیں۔

"میری اماں ۔۔" جمیل بھیا ان کے لپٹ گئے۔ "اماں، کوئی میں بندوق اٹھا کر لڑوں گا

بھی میں تو قلم سے لڑوں گا۔ میں تو صرف ہٹلر کے خلاف پروپیگنڈا کروں گا۔ اور اپنی اماں کی خدمت کروں گا۔"

"تم لڑو گے نہیں ۔۔۔؟" بڑی چچی نے مشکوک نظروں سے دیکھا۔

"قطعی نہیں اماں، میں تو دوسرے ہی کام کروں گا۔"

"کیسے کام ۔۔۔؟" نجمہ پھوپی نے پوچھا۔ وہ جانے کیسے اس وقت سب کے بیچ میں آ بیٹھی تھیں۔

"میں فوج میں جا رہا ہوں۔" جمیل بھیا نے فوراً جواب دیا۔

"بہت اچھی بات ہے، اب اتنی تعلیم پر اور کوئی نوکری بھی کیسے ملتی۔" نجمہ پھوپی نے اطمینان کی سانس لی۔

"بالکل درست، وہ تو کہیے کہ عورتوں میں تعلیم نہ ہونے کے برابر ہے ورنہ آج آپ بھی بے کار پھر رہی ہوتیں۔"

نجمہ پھوپی الٹے پیروں واپس ہولیں، بھلا ان جاہلوں کے کون منہ لگے۔ اس گھر میں ان بے چاری کی قابلیت کی ذرا بھی تو عزت نہیں۔ عالیہ کو ہنسی آ رہی تھی۔

"میرے سر پر ہاتھ رکھ کر قسم کھاؤ کہ لڑو گے نہیں۔" بڑی چچی نے جمیل بھیا کا ہاتھ اپنے سر پر رکھ لیا۔

"اس سر عزیز کی قسم اماں۔" جمیل بھیا نے قہقہہ لگایا تو سب ہنس دیے اور چھمی جو اتنی دیر سے چپ بیٹھی تھی ایک دم اپنے کمرے میں چلی گئی۔ اس کا منہ سرخ ہو رہا تھا۔

(۳۳)

جمیل بھیا چلے گئے۔ جانے سے پہلے رات گئے عالیہ سے رخصت ہونے اس کے کمرے

میں آئے تھے اور بڑی دیر تک اس کے پاس کرسی پر بیٹھے پاؤں ہلاتے رہے تھے دونوں خاموش تھے اور باہر بارش ہوئی چلی جارہی تھی۔ عالیہ کو اپنی کمزوری پر غصہ آرہا تھا۔ آخر وہ کیوں نہیں بولتی۔ وہ اتنی خاموشی کے ساتھ کس سوگ کا اعلان کر رہی ہے۔

وقت گزرتا جا رہا تھا۔ بارش اب ہلکی ہوگئی تھی۔ خاموشی اور جمیل بھیا کی موجودگی سے اس کا دم گھٹا جا رہا تھا۔ "آپ صبح جا رہے ہیں۔؟" عالیہ نے بڑی ہمت کر کے پوچھا۔

"ہاں جا تو رہا ہوں، پھر؟" جمیل بھیا نے سخت اکھڑپن سے جواب دیا۔ اور ادھر ادھر دیکھنے لگے۔ جانے وہ اپنے کس جذبے کا گلا گھونٹ رہے تھے۔ جوان کی آنکھیں مارے درد کے چیختی ہوئی معلوم ہو رہی تھیں۔

"پوچھنا کوئی گناہ تو نہیں" عالیہ نے سر جھکا لیا۔ جمیل بھیا کے جواب سے دل پر چوٹ لگی تھی۔

"تم مجھے یاد کرو گی عالیہ؟" جمیل بھیا نے جیسے جھپٹ کر اس کے ہاتھ پکڑ لیے تھے۔

"نہیں! میں آپ کو کس لیے یاد کروں گی؟۔ آپ میرے لیے میرے چچا زاد بھائی سے زیادہ کچھ بھی نہیں ہیں۔ میں آپ کو اور کچھ سمجھنا بھی نہیں چاہتی۔ سچی بات تو یہ ہے کہ مجھے مرد کی محبت پر اعتبار ہی نہیں۔ اور اگر فرض کر لیجئے کہ کبھی اعتبار کیا بھی تو وہ آپ جیسا نہیں ہوگا۔ ابا اور بڑے چچا جیسا بھی نہیں ہوگا۔ پرائی آگ میں جلنے والے اپنی گھریلو آگ سے ہمیشہ بے خبر رہتے ہیں۔ بہر حال میں جسے چاہوں گی اس کے لیے کچھ نہیں بتا سکتی کہ کیسا ہوگا آپ سے یہ سب کچھ اس لیے کہہ رہی ہوں کہ آپ وہاں اتنی دور رہ کر مجھے کبھی یاد نہ کریں گھر سے دور رہ کر اور سب کو چھوڑ کر ان کی یادیں بہت اذیت ناک ہو جاتی ہیں تو آپ آج ہی اس اذیت سے چھٹکارا پا لیجئے۔ جہاں تک گھر اور بڑی چچی کا سوال ہے تو وہ آپ کے لیے کوئی حیثیت نہیں رکھتیں۔ بڑی چچی اور کتنے دن جئیں گی؟" عالیہ کی آنکھوں میں آنسو

آگئے تھے۔ جانے کیوں وہ اس وقت جی بھر کر رونا چاہتی تھی۔

"تم نے بہت اچھا کیا جو سب کچھ کہہ دیا۔ اگر تم نہ بھی کہتیں تو مجھے معلوم تھا ویسے میں تم کو یہ بتا دوں کہ اماں مجھے بہت عزیز ہیں اور جہاں تک پرائی آگ کا تعلق ہے تو وہ پرائی نہیں، میری اپنی آگ ہے، اس آگ میں جل کر میں ذرا بھی جلن نہیں محسوس کروں گا کاش اس آگ کو اور بھڑکانے والا کوئی ساتھی بھی ہوتا۔ تم میں اور جھمی میں فرق کیا ہے۔ خیر خدا حافظ ــ" جمیل بھیا اُٹھ کھڑے ہوئے ــ "مگر ایک بات تو بتاؤ کہ کیا بدلے کی قائل ہو، میرا خیال ہے کہ انسان جو کچھ کرتا ہے اس کا بدلہ ضرور چاہتا ہے۔ تو مجھے بھی جانے سے پہلے بدلہ چاہیے۔ شاید یہی بدلہ وہاں اتنی دور میرے لیے تسکین کا سامان بن سکے جمیل بھیا نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں تو وہ کانپنے لگی تھی۔

"کیسا بدلہ؟" وہ جانتے بوجھتے انجان بن رہی تھی۔

ذرا دیر کے لیے خاموشی چھا گئی۔ جمیل بھیا اُسے دیکھ رہے تھے۔ اُن کی نظروں میں تشنگی تھی، کچھ کھو جانے کا دکھ تھا۔ کچھ پا لینے کی تمنا تھی۔

"میں آپ کو کیا بدلہ دے سکتی ہوں۔؟" اس نے جمیل بھیا کو جو نکایا تھا۔ اب وہ اُن کی نظروں کا مقابلہ نہ کر پا رہی تھی۔

"بس یہی ــ" جمیل بھیا نے آگے بڑھ کر اپنے بازوؤں میں جکڑ لیا۔ وہ اُسے پاگلوں کی طرح چُوم رہے تھے۔ اُسے اپنے سینے میں جذب کر رہے تھے اور وہ ذرا سی مزاحمت بھی نہ کر سکی تھی وہ نفرت سے انھیں دھکا بھی نہ دے سکی تھی۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ یہ سب اتنے اچانک کیسے ہو گیا تھا۔ اور وہ یہ سب کچھ کیسے قبول کر رہی تھی۔ اور پھر جمیل بھیا جیسے اُسے بستر پر پھینک کر چلے گئے تھے اور وہ مارے بے بسی کے رونے لگی تھی۔ بھلا وہ کس بات کا بدلہ چکانے پر راضی ہو گئی تھی وہ خود کو ملامت کرتے کرتے جانے کب سو گئی۔

جمیل بھیا صبح صبح چلے گئے تھے، وہ تو اس وقت سو کر بھی نہ اٹھی تھی۔ چھمی اسے جگا کر شکایت کرنے آئی تھی "بجیا آپ سوتی رہیں۔ آپ نے تو جمیل بھیا کو رخصت نہ کیا۔ اچھا ہوتا کہ ابھی کچھ دن اور نہ جاتے۔"

"کیوں۔؟" بستر سے اٹھتے ہوئے اس نے چونک کر چھمی کو دیکھا۔ "یہاں سے کن دنوں کا انتظار ہے۔؟"

"بس نہ جاتے" وہ گڑبڑا گئی "بے چاری بڑی چچی سخت رنجیدہ ہو رہی ہیں، اس اولاد کا بھی کوئی سکھ نہیں ملتا۔ کیوں پالتی ہیں اب۔ میں سب سے اچھی جو خود بخود پل گئی میرے لیے کوئی دکھی نہیں" چھمی نے ٹھنڈی سانس بھری۔

"ہاں بے چاری بڑی چچی کو کوئی سکھ نہ ملا" عالیہ نے کہا اور چھمی کا ہاتھ تھام کر نیچے اتر آئی۔

شکیل کھو گیا۔ جمیل بھیا جنگ پر چلے گئے۔ بڑی چچی مئی جون کی پیاسی چڑیا کی طرح نظر آ رہی تھیں۔

"اللہ اسے خیریت سے رکھے۔ گھر میں پیسہ تو آئے گا۔ بڑی بھابھی، آپ کو سکھ تو ملے گا" اماں بڑی چچی کو سمجھا رہی تھیں۔ اور وہ خاموش بیٹھی ٹھنڈی سانسیں بھر رہی تھیں۔

"زمانے زمانے کی بات ہے۔ آج مالک مرحوم کی اولادیں نوکریوں کی تلاش میں کہاں کہاں جا رہی ہیں۔ کبھی وہ زمانہ بھی تھا کہ دولت اپنے قدموں چل کر آتی تھی اور کوئی اسے اٹھا کر رکھنے والا نہ تھا" کریمن بوا کی نظریں جانے کیا تلاش کر رہی تھیں۔

دوپہر میں بڑی چچی نے کپڑوں کا ایک بنڈل عالیہ کو تھما دیا۔ "یہ کپڑے جمیل چھمی کے لیے دے گیا ہے۔ اور کہہ گیا ہے کہ عالیہ سے سلوا لینا۔ سب کا خیال تو کرتا ہے مگر اس برے وقت نے اسے دور جانے پر مجبور کر دیا۔ اگر کوئی اچھی سی نوکری مل جاتی تو پھر وہ کیوں جاتا۔"

"خدا انھیں خیریت سے واپس لائے گا۔ بڑی چچی آپ پریشان نہ ہوں۔" وہ کپڑے لے کر اپنے کمرے میں چلی گئی اس کا جی چاہ رہا تھا کہ چھمی کو یہ کپڑے دکھا دے۔ اور اسے بتائے کہ جمیل بھیا اس کے لیے دے گئے ہیں۔ مگر کس لیے، وہ اس کا کیا جواب دے گی۔ اسے چھمی سے ڈر لگتا تھا۔ شادی میں صرف پندرہ دن رہ گئے تھے۔

شام کو بڑے چچا دلی سے آ گئے۔ جب انھیں معلوم ہوا کہ جمیل بھیا فوج میں چلے گئے ہیں۔ تو ایک دم بلبلا اٹھے۔ "ارے اس نالائق سے اور کیا ہو سکتا تھا۔ انگریزوں کی مدد کر کے ہی تو پاکستان بنائے گا، یہ سب انگریزوں کے پٹھو ہیں۔"

"تو کیا اللہ مارے کافروں کا ساتھ دیتا؟" اماں نے فوراً جواب دیا۔ اور بڑے چچا سر جھکا کر رہ گئے۔

"آپ کپڑے وغیرہ تو بدل ڈالیے بڑے چچا۔ سفر سے تھک گئے ہوں گے، ذرا دیر آرام کر لیجیے" عالیہ نے باتوں کا رخ بدلنا چاہا۔ بڑے چچا کا تھکا ہوا چہرہ دیکھ کر اس کا دل مل رہا تھا اتنے دن بعد وہ گھر آئے ہیں تو اب انھیں آرام کی ضرورت ہے۔

کریمن بوا چائے تیار کر رہی تھیں۔ اور بڑی چچی ان کے بکس سے کپڑے نکال رہی تھیں عالیہ ان کا سامان اٹھا کر کمرے میں رکھ آئی۔

بڑے چچا کپڑے تبدیل کرنے کے بعد بڑی چچی کے کمرے میں مسہری پر لیٹ گئے۔ شاید وہ اتنے تھک گئے تھے کہ بیٹھک تک جانے کو بھی جی نہ چاہا تھا۔ کریمن بوا نے سرہانے رکھی ہوئی تپائی پر لالٹین رکھ دی۔ عالیہ ان کے پاس بیٹھ کر سر دبانے لگی۔

"مجھے ڈر لگتا ہے، یہ لیگی ملک کو بانٹ نہ دیں" بڑے چچا نے دکھ سے کہا۔

"ہاں ڈر تو مجھے بھی ہے" اس نے بڑے چچا کا دل رکھنے کے لیے ہاں میں ہاں ملائی

"تم نے دیکھا جمیل فوج میں چلا گیا، یہ میری اولاد ہے"

"بہت بُرا کیا بڑے چچا ۔" وہ ہاں میں ہاں ملائے جا رہی تھی ۔ وہ ان سے یہ کس طرح پوچھ سکتی تھی کہ اگر تمہیں بھیا جنگ پر نہ جاتے تو پھر ان بیٹوں کی بھٹی کو کیسے سرد کیا جاتا ۔

"مظہر کا خط آیا ۔ ؟"

"ادھر کچھ دنوں سے نہیں آیا ۔" وہ ایک دم رنجیدہ ہو گئی ۔ اُسے ابا کے خط کا کتنا انتظار تھا ۔ وہ ساری کے پلّو کو کس طرح مروڑنے لگی کہ جھبرے ہو گیا ۔ "بہت پُرانی ہو گئی ہے ۔" وہ شرمندہ ہو کر ہنسی ۔

"ارے ہاں تمہارے کپڑے تو اب بہت پُرانے ہو گئے ہیں ۔ نئے کپڑے بنے بھی تو نہیں ۔" وہ بھی شرمندگی سی ہنسی ہنسے ۔

"ابھی تو میرے پاس کئی جوڑے رکھے ہیں ۔" وہ صفا جھوٹ بول گئی ۔ جانے کیوں وہ بڑے چچا کو ایک لمحے کے لیے بھی شرمندہ دیکھنے کو تیار نہ تھی ۔

بڑے چچا جانے کیا سوچنے لگے اور پھر انھوں نے اس طرح آنکھیں بند کر لیں جیسے سو رہے ہوں ۔ عالیہ دبے قدموں برآمدے میں آ گئی ۔ کمرے میں کتنی جلدی رات ہو گئی تھی ۔ مگر باہر تو ابھی مغرب کا وقت بھی نہ ہوا تھا ۔ کریمن بوا لالٹینوں کی چمنیاں صاف کر رہی تھیں اور چھمی صحن میں کرسی پر بیٹھی دس بارہ سال کے ایک بھکاری لڑکے کو باسی روٹی کھلا رہی تھی ۔ "یہ بہت اچھا گاتا ہے بجیا ۔ میں نے زینب کی ماں کے گھر گاتے سُنا تھا ۔" عالیہ کو دیکھتے ہی چھمی نے تعارف کرایا ۔ "بس اب گاؤ ۔" چھمی نے حکم دیا ۔

قمیص کے دامن سے ہاتھ منھ صاف کرنے کے بعد لڑکا آنکھیں بند کر کے گانے لگا ۔ "

چڑیوں نے باغ اجاڑا ، پتہ پتہ جگ ڈارا

عالیہ کو اس کی آواز بڑی اچھی لگی وہ بڑے شوق سے سُن رہی تھی ۔ مگر چھمی کو

جانے کیا ہوا کہ اچانک سسکیاں بھرتی اپنے کمرے میں بھاگ گئی۔ اور لڑکا گھبرا کر سب کی طرف دیکھنے لگا۔ پھر بھیک کی پوٹلی سمیٹ ڈرا ڈرا سا بھاگ نکلا۔ ب عالیہ پریشان کھڑی رہ گئی۔ جھمی دیوانی نے اس گانے سے کون سے رونے کے پہلو تلاش کر لیے مگر اس نے دیکھا کہ بڑی چچی بھی تو آنسو پونچھ رہی تھیں۔

"یہ زمانے بھی آ گئے کہ بھکاری لڑکے بی بیوں کے پاس ٹھہار گانے گائیں۔" دالان کی محراب کے کنڈے میں لالٹین لٹکاتے ہوئے کریمن بوا بڑبڑا رہی تھیں۔

"کریمن بوا ایک پیالی چائے بنا لاؤ۔ پڑھتے پڑھتے سر دکھنے لگا ہے۔" کھڑکی سے جھانک کر نجمہ پھوپی نے حکم دیا۔ اور کریمن بوا چولھے کی طرف سرک گئیں۔

عالیہ نے نجمہ پھوپی کی طرف دیکھا اور منہ پھیر لیا ہر وقت انگریزی کی موٹی موٹی کتابیں پڑھ پڑھ کر نجمہ پھوپھی کی آنکھوں میں کیسے حلقے پڑ گئے ہیں۔ آخر یہ کس لیے پڑھتی ہیں؟ یہ سب کس کام آتا ہے۔ یہ سب صرف اس لیے ہے کہ صحیح انگریزی بولنے پہ فخر کر سکیں۔

اب اندھیرا چھانے لگا تھا۔ اور صحن میں پڑی ہوئی لوہے کی کرسی اس اندھیرے میں ڈوبتی محسوس ہو رہی تھی۔ جمیل بھیا کا سفر ختم ہوا ہوگا کہ نہیں،۔ عالیہ کو بار بار خیال آ رہا تھا۔

"کریمن بوا، یہ کاشی بابو آئے ہیں۔ بڑے بھیا کو بتا دو۔" بیٹھک سے اسرار میاں کی آواز آئی۔

"انھیں کوئی آرام بھی نہیں کرنے دیتا۔ وہ سو رہے ہیں۔ وہ اس وقت نہیں آئیں گے۔" کریمن بوا نے جھلا کر جواب دیا۔ مگر بڑے چچا تو جیسے اسرار میاں کی آواز کے منتظر تھے۔

(۳۴)

شادی سے چار دن پہلے ساجدہ آپا اپنے چار عدد تلے اوپر بچوں کے ساتھ آ گئیں
بڑی اچھی مدت سے بچھڑی ہوئی بیٹی کو گلے لگا کر دیر تک روتی رہیں۔ اور پھر ساری موٹی موٹی
خبریں سنا ڈالیں۔ شکیل کا بھاگ جانا، جمیل بھیا کا فوج میں جانا اور چھمی سے شادی کی
خبر چھپانا۔ اتنی بہت سی دردناک خبروں کو سن کر ساجدہ آپا کا رنگ پیلا ہو گیا تھا اور چھا پھیلو
کی جدائی کے غم میں وہ دیر تک سر جھکائے بیٹھی رہیں۔

عالیہ نے اماں کی زبانی سنا تھا کہ ساجدہ آپا خوبصورت ہیں مگر اب وہ دیکھ
رہی تھی کہ بے چاری حسن کا کہیں دور تک نشان نہ تھا ہڈیوں کا ڈھیر تھا جس پر سفید کھال
منڈھی ہوئی تھی۔ وہ عالیہ سے اس قدر پیار سے پیش آ رہی تھی کہ اسے بار بار
اپنی تہمینہ آپا یاد آ رہی تھیں۔

ساجدہ آپا کے آنے پر نجمہ پھوپھی کو بھی ان سے ملنے کے لیے نیچے اترنا پڑا
وہ ان سے گلے ملنے کے بجائے الگ ہی کھڑی رہیں۔ "تمھاری صحت بہت خراب
ہو رہی ہے۔ ساجدہ" نجمہ پھوپھی نے انھیں غور سے دیکھ کر کہا۔

"بچوں نے تنگ کر رکھا ہے۔ نجمہ پھوپھی، اوپر سے گھر کے ڈھیروں کام۔ وہ
دو بھینسوں کی دیکھ بھال"

"تو تمھارے میاں ہل چلاتے ہیں" نجمہ پھوپھی نے حقارت سے پوچھا

"جی ہاں نجمہ پھوپھی"

کتنا پڑھے ہیں ۔۔؟"

"دس درجہ نجمہ پھوپھی" ساجدہ آپا نے فخریہ جواب دیا۔

بس پھر ٹھیک ہی ہے، اتنا پڑھ کر اور کیا کر سکتا ہے۔ بے چارہ۔ اور ساجدہ تمھارے بچے سخت شریر ہیں، انھیں خوب پڑھانا۔ کم از کم انگلش میں ایم اے ضرور کرانا۔

"ضرور پڑھاؤں گی نجمہ پھوپھی۔" ساجدہ آپا کا منھ لٹک گیا۔ اور نجمہ پھوپھی اپنے گوشۂ عافیت میں چلی گئیں۔ عالیہ تخت پر بیٹھی سارے مکالمے سن سن کر کڑھتی رہ گئی۔

جب سے ساجدہ آپا آئی تھیں کریمن بوا بہت خوش نظر آرہی تھیں۔ بچوں نے سارے گھر میں تہلکہ مچا رکھا تھا۔ اور کریمن بوا نہال ہو ہو کر ایک کے گندے ہاتھ دھلاتیں تو دوسرے کا منھ اور تیسرے کو بہلانے کے لیے روٹی کا ٹکڑا پکڑا دیتیں۔

شام کو بڑے چچا گھر آئے تو اپنی بیٹی کے پاس ٹک گئے۔ وہ بڑے چاؤ سے باتیں کر رہے تھے کہ چھمی کو ایک دم جوش آگیا۔ ساری سنجیدگی غرق ہوگئی اور وہ بچوں کو جمع کر کے نعرے لگانے لگی۔ "مسلم لیگ زندہ باد، بن کے رہے گا پاکستان، دھنیا راج نہیں ہوگا، چٹیا راج نہیں ہوگا۔"

بچے چھمی کے گرد جمع ہو کر ساتھ دے رہے تھے۔ بڑے چچا چپکے سے بیٹھک میں سرک گئے۔

"اللہ کی مار ہے ان منحوس نعروں پر، ادھر آؤ تم سب خبردار جو شور مچایا، شادی کا گھر اور یہ نعرے؟" ساجدہ آپا نے اپنے بچوں کو کھینچ کھینچ کر بٹھانا شروع کر دیا۔

"بھئی کس کی شادی ہو رہی ہے؟" چھمی فاتحانہ ہنسی ہنس رہی تھی۔

"تمھاری اور کس کی۔" اماں نے جل کر جواب دیا۔ اور سب نے گھبرا کر چھمی کی طرف دیکھا۔ عالیہ کو اپنے رونگٹے کھڑے ہوتے ہوئے محسوس ہو رہے تھے۔ چھمی نے سب کو حیران سی نظروں سے دیکھا اور سر جھکائے اپنے کمرے میں چلی گئی۔ بڑی چچی نے اطمینان کی لمبی سانس لی۔ چھمی سے کیسی کیسی توقعات وابستہ تھیں، مگر اس نے تو ہوں بھی

نہیں کی۔ سب کی توقعات کو ٹھکرا کر سر جھکا دیا۔

"لڑکی ذات کیسی ہی شریر کیوں نہ ہو مگر ہوتی اللہ میاں کی گائے ہے۔ جدھر چاہو ہنکا دو۔ ہوں نہیں کرتی" بڑی چچی آنسو پونچھنے لگیں۔

ذرا دیر بعد عالیہ چھمی کے کمرے میں گئی تو وہ اپنے بستر پر جانے کن خیالوں میں گم تھی

"آپ نے پہلے کیوں نہیں بتایا تھا بجیا؟" چھمی نے بھیگی بھیگی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھا۔ "خیر کوئی بات نہیں، جب سے ماجدہ آپا آئی تھیں اُن کے روپ میں میں اپنے آپ کو دیکھ رہی تھی۔

"ارے بابا میں نے تو صرف اس لیے نہیں بتایا کہ تم شرما کر کمرے میں چھپ ہو گی مجھے ایسی شرم سے چڑھ ہے آج تمھاری مہندی لگے گی تم مایوں بٹھائی جاؤ گی، بس آج شرم شروع کر دو۔"

"اچھا!" چھمی اسے جنتیوں کی طرح تک رہی تھی اس کے چہرے پر ذرا بھی شرم نہ تھی۔ وہ اُٹھ کر کمرے کی دہلیز پر اکڑوں بیٹھ گئی۔ اور عالیہ کو تہمینہ آپا یاد آ گئیں ڈھیروں خدشات نے اسے جکڑ کر رکھ دیا۔ اری چھمی تو بھی کہیں باؤلی نہ ہو جانا۔ اس نے سوچا کہ ان دنوں وہ چھمی کا سایہ بن جائے گی وہ چھمی کو کچھ بھی نہ کرنے دے گی عالیہ بھی چھمی کے قریب ٹک گئی۔ شام دبے قدموں چلی آ رہی تھی چھمی لٹی پٹی ویران بیٹھی تھی۔ سب مصروف تھے۔ بچے شور مچا رہے تھے کریمن بوا وزیر آباد کی مہندی پیس رہی تھیں مگر عالیہ کو محسوس ہو رہا تھا کہ ہر طرف سناٹا چھایا ہوا ہے۔ سیتا نے بن باس میں شاید ایسی ہی شامیں گزاری ہوں گی۔ ہائے یہ مہندی کی سل سے ایک چھوٹا سا گلابی ہاتھ کیوں اُبھر رہا ہے۔ عالیہ نے گھبرا کر اپنا منھ چھپا لیا۔ اور پھر چھمی کو لپٹا کر اس طرح بیٹھ گئی جیسے وہ ہاتھ چھمی کو گھسیٹے لیے جا رہا تھا۔

مغرب کے بعد اسرار میاں میراثنوں کو بلا لائے۔ صحن میں اُن کی کرخت اور کھٹکتی ہوئی آوازیں سُنائی دے رہی تھیں۔ عالیہ چھمی کے پاس سے اُٹھ کر صحن میں آگئی۔ امّی کی تلخ یادوں کا عذاب اس پر نازل ہو کر گزر چکا تھا۔

"دُلھن کی بہن جیوے، دُلھن کی چچی جیوے" عالیہ کو دیکھ کر میراثنوں نے دعائیں دینی شروع کر دیں۔

چوکی پر بیٹھی ہوئی ساجدہ آپا تھال میں مہندی سجا رہی تھیں۔ اماں، اور بڑی چچی دالان سے چنیریں سرکا سرکا کر مانگے کی دری بچھوا رہی تھیں اور ساجدہ آپا کے بچے مہندی لے بھاگنے کی تاک میں ادھر اُدھر منڈلا رہے تھے۔ عالیہ تھوڑی دیر تک کھڑی تماشہ دیکھتی رہی اور پھر چھمی کے پاس آگئی وہ کس قدر اجنبیوں کی طرح مسہری سے پاؤں لٹکائے بیٹھی تھی۔

"بجیا جب میں چلی جاؤں گی تو پھر اس کمرے میں کون رہے گا۔" چھمی نے اسے دیکھتے ہی پوچھا۔

میں رہوں گی، روز اسے صاف بھی کر دیا کروں گی۔ اور جب تم آیا کرو گی تو پھر تمہارا کمرہ چھوڑ کر بھاگ جایا کروں گی۔

چھمی ایک دم اُٹھی اور کھونٹی پر لٹکا ہوا میلا جمپر اُتار کر مسہریاں اور میز کرسی صاف کرنے لگی۔ عالیہ خاموش بیٹھی دیکھتی رہی۔ انسان کو اپنی جگہ سے کتنی محبت ہوتی ہے مگر اس کا تو کوئی ٹھکانہ نہیں وہ کسی جگہ کو اپنا نہ کہہ سکتی۔

صفائی کرنے کے بعد چھمی بیٹھ گئی اور دونوں ہاتھوں سے مُنھ چھپا کر سسکیاں بھرنے لگی۔ عالیہ نے اُسے لپٹا لیا۔ "یہ کیا بے وقوفی ہے چھمی، ایک دن سب کی شادی ہوتی ہے"

"ٹھیک ہے عالیہ بجیا۔ مگر میری شادی ہو جائے گی اور کسی کو خبر بھی نہ ہو گی۔"

چھمی برابر روئے جا رہی تھی۔

"تم نے مجھ سے کہا ہوتا تو منظور کے سلسلے میں بات کرتی۔ مگر اس نے بھی تو پیغام نہیں دیا چھمی، پھر وہ بے مروت تم کو چھوڑ کر جنگ پر چلا گیا۔ اب اُسے کیوں یاد کرتی ہو چھمی۔"

چھمی نے اُسے کچھ ایسی نظروں سے دیکھا کہ عالیہ پہچان نہ سکی ان نظروں کے سامنے اس کا علم اور سمجھ جواب دے گئی۔ "کیا بات ہے چھمی؟" اُس نے الجھ کر پوچھا۔

"کچھ نہیں بجیا۔" آنسو پونچھ کر وہ ہنسنے لگی۔

"یہ گیس کا ہنڈا اندر لے جاؤ۔ کریمن بوا اور اگر سب نے چائے پی لی ہو تو" بیٹھک سے اسرار میاں کی آواز آئی تو عالیہ کا جی دکھ گیا۔ آج تو کریمن بوا کا ہے کو چائے دینے لگیں۔

"کبھی تو چائے بھول کر بھی دے جایا کرو۔ اسرار میاں آج ایک گلاس پانی پی لو" کریمن بوا جواب دیتے ہوئے ہنس رہی تھیں۔ اور میراثنیں ان کا ساتھ دے رہی تھیں۔ ارے اسرار میاں اتنے عالم آشکارا راز ہیں۔ عالیہ کا جی چاہا کہ سب کے منھ نوچ لے۔

بڑی چچی ساجدہ آپا اور اماں مہندی کا تھال اور پیلا جوڑا لیے اندر آگئیں تو چھمی نے سر جھکا کر دوپٹے میں منھ چھپا لیا۔ رسم کے مطابق یہ جوڑا اور مہندی سسرال والوں کو لے کر آنا چاہیے تھا۔ لیکن ایسا نہ ہوا، کون آتا۔ اتنی دور سے۔

صدر دروازے پر بھکاری لڑکے کے گانے کی آواز آرہی تھی — "چڑیوں نے باغ اجاڑا —" "بھاگ جا منحوس کہیں کا۔ بھاگ جا" کریمن بوا دھاڑ رہی تھیں چادر کی آڑ میں چھپ کر چھمی نے پیلا جوڑا پہن لیا۔ اور ساجدہ آپا نے اس کے

ہاتھوں میں مہندی لگا کر اپنے آنسو پونچھ لیے۔

ہاتھی جھولیں سمبر درد جوا۔ میراثنوں نے گانا شروع کر دیا۔ اور عالیہ کو خیال آیا کہ اس نے سا جو وہ آیا ہے چھمی کی سسرال کے لیے تو کچھ پوچھا ہی نہیں۔

مہندی لگا کر سب باہر چلے گئے چھمی نے پھر بھی نظریں نہ اٹھائیں، "تمیل بھیا تمہارے جہیز کے لیے ایک بڑا خوبصورت جوڑا بنا گئے ہیں"۔ عالیہ نے اطلاع دی۔

"اچھا" چھمی نے بڑی اعتنائی سے اس کی طرف دیکھا اور مہندی کریدنے لگی۔

اڑ یا یہ جوڑ بھوجی دیا تو جلاؤ"۔ میراثنیں بہت جوش سے گائے چلے جا رہی تھیں۔ رسم سونی سونی دیکھ کر میراثنیں ماجھے کے گیتوں کے بجائے گراموفون ریکارڈوں کے چلتے ہوئے گانے گانے لگیں۔

چھمی تم مجھے (بھی) سسرال بلاؤ گی نا ـ" عالیہ اُسے بہلانے کے لیے برابر باتیں کیے جا رہی تھی۔

دیکھیے کس حسن سے پوشیدہ غم کا راز ہے
تیر میرے دل میں ہر پردے میں تیر انداز ہے

میراثنیں اب قوالی پر اُدھار کھائے بیٹھی تھیں۔

"مجھے کیا معلوم ـ" چھمی نے آہستہ سے جواب دیا۔

"اچھا تم مجھے نہیں بلاؤ گی ـ بس معلوم ہو گئی تمہاری محبت ـ" عالیہ بن کر روٹھی مگر چھمی تو جیسے کچھ سن ہی نہ رہی تھی۔

"آنے والے جلد آؤ آخری آواز ہے" میراثنیں گاتے گاتے چپ ہو گئیں۔ چھمی یوں ہی خالی خالی نظروں سے کمرے میں ادھر ادھر دیکھے جا رہی تھی۔ "آنے والے جلد آؤ آخری آواز ہے ـ" دیکھتے دیکھتے چھمی گنگنانے لگی۔

«تمھیں یہ قوالی اتنی پسند کیوں ہی تھی؟» عالیہ نے جیسے بھیر کر پوچھا۔

«واہ تو میں کسی کو بلا تھوڑی رہی ہوں۔» تھمی نے بھی غصّے سے جواب دیا۔

عالیہ کا جی چاہا کہ تھمی کو پیٹ کر رکھ دے اور آنے والا نہ آئے تو افیون کھا لو گی، مر جاؤ اور اسے دنیا کے سینے پر دڑانے کے لیے چھوڑ کر قبر میں جا رہو۔

بڑی دیر تک وہ دونوں ایک دوسرے سے نہ بولیں اور جب میراثنیں گا بجا کر چلی گئیں تو تھمی اپنے بستر پر لیٹ گئی۔ «آپ اوپر کمرے میں جا کر سو رہیے۔ خواہ مخواہ اتنی دیر سے بیٹھی ہیں۔» آنکھیں بند کیے کیے تھمی نے اکھڑپن سے کہا۔

«میں تو یہیں تمھارے پاس لیٹوں گی۔» عالیہ نے اُسے پیار سے لپٹا لیا۔ خواہ مخواہ تھمی سے یوں بات کی، ویسے ہی بے چاری کا دل ٹوٹا ہوا ہے۔

پرسوں برات آ رہی تھی مگر تھمی کے ابا ابھی تک نہیں آئے تھے۔ ادھر بڑے چچا کو اپنے کاموں سے فرصت نہ ملتی۔ کریمن بوا سخت فکر مند ہو رہی تھیں۔ «اب کیا اسرار میاں برات کی آؤ بھگت کریں گے۔ اگر انھیں پتہ چل گیا کہ یہ کون ہے تو کیا کہیں گے دل میں۔ آخر تو انھیں معلوم ہی ہو جائے گا نا۔» وہ برابر بڑبڑائے جا رہی تھیں۔ عالیہ ان کی باتیں سُن سُن کر جل رہی تھی۔ اور اگر انھیں نہ معلوم ہو تو تم بتا دینا کریمن بوا۔ تم تو اسرار میاں کا ڈنکا ہو۔

صبح سے بڑی گہما گہمی تھی۔ شام کو چار بجے برات آ رہی ہے۔ عالیہ نے کریمن بوا کے ساتھ مل کر بیٹھک صاف کرا دی تھی۔ دولہا کو بٹھانے کے لیے تخت کی چاندنی اور گاؤ تکیے غلاف بدل دیا گیا تھا۔ باہر اسرار میاں انتظام کرتے پھر رہے تھے۔ سکول کے میدان کو ایک دن کے لیے مانگ لیا گیا تھا۔ شامیانے لگ چکے تھے اور پلاؤ زردے کی دیگیں کھڑک رہی تھیں۔

دو بجے کے قریب عالیہ تھک کر اماں کے پاس تخت پر ٹک گئی۔ میراثنیں بڑے

زور سے گا رہی تھیں - آیا ری ہریالا بنا --- " اماں اور بڑی چچی مہمان عورتوں کو پان تمباکو کھلا رہی تھیں - ساجدہ آپا اپنے بچوں کو نئے کپڑے پہنا رہی تھیں - اور کریمن بوا آج روٹی ہانڈی کی فکر سے آزاد ہو کر ادھر ادھر چہکتی پھر رہی تھیں - " مالک کے زمانے میں تو دس دس دن تک گھر کے باہر مجرا ہوتا تھا - سب سے اچھی رنڈیاں آتی تھیں - گھر میں مہینہ مہینہ پہلے میراثنیں ڈھول لے کر بیٹھ جاتی تھیں اور جب گھر سے جاتیں تو ان کی جھولیاں روپوں سے بھری ہوتیں، واہ کیا زمانے تھے "

اتنی گہما گہمی کے باوجود عالیہ کو لوہے کی کرسی بڑی تنہا اور اداس لگ رہی تھی - وہ آج بھی پہلے کی طرح صحن میں پڑی تھی - ساجدہ آپا کے بچوں نے ننگے پاؤں رکھ رکھ کر اسے مٹی سے لیس دیا تھا - عالیہ جب چھمی کے پاس جانے لگی تو جانے کس جذبے کے تحت کرسی کے پاس کھڑی ہو گئی - ساری کے پلو سے اس کی مٹی پونچھی اور چلی گئی -

" ابا نہیں آئے بجیا " چھمی نے اسے دیکھتے ہی سوال کیا اور مہندی سے رچا ہوا ہاتھ اس کے ہاتھ پر رکھ دیا -

" نہیں آئے چھمی، وہ تو بیمار ہیں - کھانے وغیرہ کے لیے دو سو روپے اور بھجوا دیئے ہیں " عالیہ جھوٹ بول رہی تھی -

" شاید وہ بے چارے موت کی بیماری میں مبتلا ہوں گے " چھمی نے نفرت سے ہر طرف دیکھا اور سر جھکا لیا -

عالیہ خاموش رہی بھلا وہ کہتی بھی کیا - جھوٹ کے پاؤں کب ہوتے ہیں - ظفر چچا اگر آ ہی جاتے تو کیا بگڑ جاتا - مگر وہ کیوں آتے، ان کے آرام میں خلل پڑ جاتا وہ اپنی حیدرآباد کی جنت سے کیوں نکلتے -

بارات آنے میں اب تھوڑی دیر رہ گئی تھی - اس نے چھمی کو غور سے دیکھا - وہ

شرمائی ہوئی بیٹھی تھی۔ تہمی کے چہرے سے اسے کسی قسم کا خطرہ نظر نہ آرہا تھا۔ وہ اٹھ کھڑی ہوئی کیونکہ اُسے بھی تیار ہونا تھا۔

"کریمن بوا ذرا میری بات سُن لو۔ کریمن بُوا۔" اسرار میاں کی آواز آئے جا رہی تھی۔ مگر کریمن بوا تو بہری ہو گئی تھیں۔ ورنہ کیا آج کے مبارک دن بھی وہ اسرار میاں کے کام کرتیں۔ عالیہ نے ہمت کر کے اسرار میاں کو جواب دے ہی دیا۔

"یہ کپڑے تہمی بٹیا کے لیے خریدے ہیں۔ انھیں میری طرف سے دے دینا اور کچھ نہ کر سکا" اسرار میاں کی آواز آنسوؤں میں ڈوبی ہوئی تھی۔ اور بڑھا ہوا ہاتھ کانپ رہا تھا۔ کریمن بوا کی سماعت فوراً تیز ہو گئی ——— "یہ آپ کا کام نہیں عالیہ بٹیا۔" انھوں نے عالیہ کے ہاتھ سے بنڈل لے لیا۔

اماں اور بڑی چچی کپڑے دیکھ رہی تھیں۔ "واہ کتنے اچھے کپڑے ہیں یہ اسرار میاں نے تہمی کو دیے ہیں۔" عالیہ نے فخریہ کہا۔

"اسرار میاں نے؟ واہ خوب رہی، یہ اپنے مال پر یا حسین۔" کریمن بُوا جلبلا اٹھیں۔ "زمانے زمانے کی بات ہے، اسرار میاں اس گھر کی بیٹیوں کو جوڑے دیں۔ مالکن کو خدا جنت نصیب کرے اسرار میاں کی ماں کو اپنے پرانے کپڑے دے دیا کرتی تھیں۔"

"چلو اب تو کپڑے آ ہی گئے۔ یہ جوڑا بڑے بھیا کی طرف سے ہو جائے گا۔ آخر تو انھیں کی دوکان سے پیسے کاٹ کاٹ کر بنایا ہوگا۔" اماں نے فوراً فیصلہ کر دیا۔

"ٹھیک ہی چھوٹی دولھن۔" کریمن بُوا نے اطمینان کی سانس لی۔

عالیہ نے کپڑوں کو اس طرح اُٹھا لیا جیسے وہ کوئی بڑی متبرک چیز چھو رہی ہو۔ اُس کا جی چاہ رہا تھا کہ زور زور سے چیخ۔ سب کو بتا دے کہ یہ کپڑے اسرار میاں نے بھجوائے ہیں یہ اُن کی محبت اور شرافت کا تحفہ ہے۔ مگر وہ کچھ بھی نہ کہہ سکی۔ اُس نے

دھیرے سے کپڑے پلنگ پر رکھ دیئے اور اپنے کمرے میں چلی گئی۔

نجمہ پھوپھی اپنے کمرے میں بیٹھی میک اپ کر رہی تھیں۔ اس وقت زرد وزری سے لسی ہوئی ساری پہنے تھیں۔ اور سخت بے زار نظر آ رہی تھیں۔ اب تک انھوں نے کسی کام میں حصّہ نہ لیا تھا۔ مگر آج چھمی کو رخصت کرنے جیسے مجبور ہو گئی ہوں۔

ساری بدل کر عالیہ پھر نیچے آ گئی۔ دھوپ پیلی پڑ کر دیواروں پر چڑھ گئی تھی۔ سب برات کے منتظر تھے۔ وہ چھمی کے پاس جا کر بیٹھ گئی۔

برات آنے کا شور مچا تو چھمی کا رنگ فق پڑ گیا۔

"بجیا!" جیسے کسی چیز سے ڈر کر اس نے پکارا۔

"کیا ہو چھمی"؟ اس نے چھمی کو لپٹا لیا۔

"کچھ بھی نہیں۔ آپ میرے پاس سے ہٹیے گا نہیں۔ جی گھبراتا ہے"

"میں کہیں نہیں جا رہی ہوں چھمی" وہ کانپتی ہوئی چھمی کو لپٹائے بیٹھی تھی۔ مگر اسے کیا ہو رہا تھا۔ وہ تو خود بھی کانپ رہی تھی۔

اماں، بڑی چچی، ساجدہ آپا اور کریمن بوا۔ سب کمرے میں آ گئے۔ کریمن بوا کے ہاتھوں میں تھال تھا جس میں سسرال سے آیا ہوا نکاح کا جوڑا، زیور اور سہرا سجا ہوا تھا۔

"سب لوگ پردہ کر لو۔ نکاح کے لیے آ رہے ہیں" اسرار میاں کی آواز آئی۔ تو کریمن بوا نے چادر تان کر پردہ کر دیا۔ اور سب اس کے پیچھے چھپ کر بیٹھ گئے۔ وہ آج کے دن تو بڑے میاں گھر پر رہتے۔ اپنی بھتیجی کا نکاح تو پڑھواتے۔ خدا کی قدرت اسرار میاں نکاح پڑھوانے آئیں۔ اللہ نصیب اچھے کرے" کریمن بوا مارے دکھ کے رو رہی تھیں چھمی نے اتنی آسانی سے ہوں کر دی کہ عالیہ حیران رہ گئی اسے تو ایسا محسوس ہو رہا

تھا۔ کہ قیامت تک براتی یوں ہی دروازے پر پڑے رہیں گے۔ ہوں سُننے والے گواہوں پر سے صدیاں گزر جائیں گی۔ اور چادر کے اس پردے کو آندھیاں بھی نہ ہٹا سکیں گی۔

گواہ وکیل چلے گئے، میراثنیں مبارک بادیاں گا رہی تھیں۔

ہو مبارک تری سُسرال سے آیا سہرا

اور عالیہ کو ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ گانے کی آوازیں کہیں کوسوں دور سے آ رہی ہیں۔

ساجدہ آپا نے چھمی کو سُرخ جوڑا پہنا کر ذرا سی دیر میں دُلھن بنا دیا۔ عالیہ الگ بیٹھی رہی، جیسے وہ مفلوج ہو گئی ہو۔

جب سب لوگ کمرے سے چلے گئے تو عالیہ نے چھمی کی گھونگھٹ الٹ دی۔ کیا سچ مچ وہ اتنی ہی خوبصورت تھی۔ "شادی ہونی تھی سو ہو گئی۔ کھیل ختم، پیسہ ہضم" چھمی نے آنکھیں کھول کر دھیرے سے کہا۔ عالیہ کچھ نہ بولی۔ یہ بھی کیسی کیفیت ہوتی ہے کہ بعض وقت کہنے سُننے کے لیے کچھ رہ ہی نہیں جاتا۔

عالیہ خاموشی سے باہر چلی گئی گیس کی دودھیا روشنی میں چھمی کی سُسرال والیاں چاندنی پر بڑے ٹھسے سے بیٹھی تھیں۔ پان پر پان کھائے جا رہی تھیں۔ بار بار تمباکو پھانکی جا رہی تھی اور اُن کے بیچ میں نجمہ پھوپھی اپنے وقت کی ہیروئن بنی بیٹھی تھیں۔ "کتنا پڑھا ہے دولھا"؟ انھوں نے پوچھا۔

"آٹھ درجے، اسے پڑھنے کی کیا ضرورت، بیٹیں بیگھے زمین ہے، دو بھینسیں ہیں اللہ کا دیا سب کچھ ہے" چھمی کی ساس نے غرور سے بتایا۔

"ٹھیک ہے۔ چھمی کے لیے اور کیا چاہیے" نجمہ پھوپھی ان دیہاتی جاہل عورتوں کو بڑی حقارت سے دیکھ دیکھ کر مُسکرا رہی تھیں۔

ایک میراثن چھمی کو گود میں اٹھا کر باہر لے آئی تو سسرال والیوں میں ہڑبونگ مچ گئی۔ سب چھمی پر ٹوٹی پڑ رہی تھیں۔ باہر سے دولھا اپنے شہ بالے کے ساتھ آ گیا اُلٹے ہوئے سہرے سے اس کا ٹھیٹ دیہاتی پکے رنگ کا چہرہ صاف نظر آ رہا تھا۔ عالیہ کا جی چاہا کہ اپنا منہ چھپا لے۔ یہ چھمی کا دولھا ہے۔ چھمی جو پہلے جمیل بھیا کو چاہتی تھی اور منظور کو پسند کر کے مارے فخر کے پھولے نہ سماتی تھی۔ بدلے میں اسے بس یہی کچھ ملا ہے۔

میراثنیں، آرسی مصحف کی رسم ادا کرنے لگیں تو چھمی نے اس طرح دولھا کو دیکھا کہ میراثنیں دانتوں تلے انگلی دبا کر رہ گئیں۔

کھانے کے بعد چھمی کی رخصتی کا سامان شروع ہو گیا۔ گلی میں کھڑے ہوئے تانگوں پر جہیز کا سامان لادا جا رہا تھا اور میراثنیں بڑی رقت سے گا رہی تھیں "بھائیوں دنیا محل دو محلے، ہم کو دیا پردیس رے۔ لکھیا بابل مورے۔" بڑی چچی اور کریمن بوا رو رہی تھیں۔ اماں سر جھکائے جانے کیا سوچ رہی تھیں اور نجمہ پھوپھی بڑی بیزاری سے جاہلوں کی محفل کے خاتمے کا انتظار کر رہی تھیں۔

"ہائے بجیا۔ بڑے چچا کو اتنا اچھا دولھا کہاں سے مل گیا؟" چھمی نے عالیہ کی گود میں سر رکھ کر دھیرے دھیرے سسکتے ہوئے کہا۔ عالیہ نے اُسے لپٹا کر کچھ کہنا چاہا مگر اُسے مہلت نہ ملی اور وہ اتنا اچھا دولھا میراثنوں کے ٹھٹھوں کے بیچ میں چھمی کو اٹھا کر پردہ لگے تانگے پر بٹھا آیا۔ عالیہ نے اپنی چیخ گلے میں گھونٹ لی۔ راون سیتا کو لے گیا۔ جمیل بھیا کاش تم ہی رام بن سکتے۔

(۳۵)

چھمی کے جانے کے بعد گھر بالکل ویرانہ بن گیا تھا۔ مسلم لیگ اور کانگریس پارٹیاں

اس گھر سے رخصت ہوگئی تھیں۔ کوئی کسی کو نہ چھیڑتا۔ سب ٹھہرے ہوئے تالاب کی طرح پرسکون تھے۔ بڑے چچا مزے سے گھر میں آتے اور چلے جاتے۔ اب بیٹھک کے دروازے بند کرنے کی کوئی ضرورت نہ پڑتی۔ کم بخت کافر کانگریسیوں کے خلاف کوئی نعرہ نہ گونجتا۔ بڑی چچی سر شام ہی برآمدے کے پردے گرا کر تخت پر بیٹھ رہتیں۔ مٹی کی کنڈالی میں کوئلے دہکتے رہتے اماں اور بڑی چچی ہاتھ سینک سینک کر جانے کیا سوچا کرتیں۔ کوئی چھمی کی باتیں نہ کرتا۔ کسی کو اس کے خط کا انتظار نہ تھا۔ چھمی جیسے کبھی اس گھر میں رہی ہی نہ تھی۔

آج کل گھر کی حالت اچھی ہو رہی تھی۔ جمیل بھیا کی تنخواہ نے چولھے میں ذرا سی جان ڈال دی تھی اور کریمن بوا مارے مصروفیت کے گزرے ہوئے وقت کو کم ہی یاد کرتیں انھیں تو اب یہ دکھ کھا رہا تھا کہ بڑے چچا اپنی ہانڈی الگ پکواتے تھے۔ انھوں نے بڑی صفائی سے انکار کر دیا تھا کہ وہ جمیل بھیا کی کمائی کا ایک پیسہ بھی اپنے اوپر خرچ نہ ہونے دیں گے۔ جمیل بھیا نے یہ ملازمت کر کے انگریزوں کا ساتھ دیا تھا۔ "مجھے پتہ نہیں تھا کہ یہ جمیل، میری اولاد، میری دشمن ہوگی۔" بڑے چچا نے کئی بار عالیہ سے کہا تھا اور وہ چچا کی بیقراری دیکھ دیکھ کر حیران رہ گئی وہ گھنٹوں سوچتی رہتی کہ انسان کے مقاصد میں اتنی دھار کہاں سے آجاتی ہے کہ سارے رشتے ناتوں کو کاٹ کر پھینک دیتی ہے۔ بڑے چچا نہ کسی کے باپ ہیں، نہ چچا، نہ شوہر۔ اسی لیے چھمی راحت کے ساتھ لنکا چلی گئی۔ ساجدہ آپا اپنے خاندان کی ساری بڑائی اور شاہی ابارت کو گوبر میں ملا کر اُپلے تھاپ رہی تھیں۔ شکیل بھاگ گیا اور جمیل بھیا ماموں کی آگ بھڑکا کر فاشزم کی آگ بجھانے چلے گئے۔

سخت سردی ہو رہی تھی۔ عالیہ چھت پر دھوپ میں پڑی پاتو بڑے چچا کی

لائبریری سے نکلی ہوئی کتابوں سے جی بہلاتی یا پھر آوارہ روح کی طرح بھٹکتی پھرتی۔ اماں اپنے آپ میں مگن رہتیں۔ ماموں کے لمبے چوڑے محبت میں ڈوبے ہوئے خط آتے رہتے وہ ان خطوں کو حتی الامکان نہ پڑھتی۔ اس نے اماں سے اگلے سال علی گڑھ جانے کی بات بھی نہ کی تھی پھر بھی فیصلہ کر لیا تھا کہ ضرور جائے گی۔

کبھی کبھار ابا کا خط بھی آجاتا۔ جسے پڑھ کر وہ نئی زندگی محسوس کرتی اور بڑی بے قراری سے ان کی رہائی کے دن گننے لگتی۔

خالی وقت کیسے کٹے۔۔۔ وہ کس سے بولے کس سے بات کرے؟ عالیہ کبھی کبھی تو اتنی الجھن محسوس کرتی کہ رو پڑتی۔ کاش نجمہ پھوپھی ہی اسے بات کرنے کے لائق سمجھ لیں مگر اس نے تو بی اے میں ہی اردو لی تھی۔ اس لیے وہ بالکل جاہل تھی۔ ان کی نظر میں۔

رات بھر ہلکی ہلکی بارش ہوتی رہی اور بادل اتنے زور سے گرجتے رہے کہ دل دہل کر رہ جاتا۔ تھوڑی دیر تک اولے پڑتے رہے اور جب کھڑکی کے بند پٹوں سے آکر ٹکراتے تو ایسا معلوم ہوتا کہ کوئی ڈھیلے مار رہا ہے۔ بارش ہلکی پڑنے پر وہ سو گئی مگر بڑی اچاٹ سی نیند میں اس نے جمیل بھیا کو خواب میں دیکھا وہ اولوں سے سر بچاتے جانے کہاں بھاگے جا رہے تھے۔ عالیہ نے انھیں زور زور سے آواز دی تو رک گئے۔ "میں تم سے نہیں بولتا عالیہ" اور پھر اس کی آنکھیں کھل گئیں۔ بادل بڑے زور سے گرج رہے تھے۔ خدا کرے وہ خیریت سے واپس آئیں۔ بڑی چچی کی مامتا ٹھنڈی رہے۔۔۔ عالیہ نے بلک کر دعا کی مگر وہ یہ سوچنے سے کترا رہی تھی کہ جمیل بھیا اس کے خوابوں میں کہاں سے آدھمکے۔

صبح بے حد سرد تھی۔ رات کی بارش سے چھت کی منڈیر بہہ گئی صحن اب تک گیلا پڑا تھا۔ اس نے کھڑکی کے بھڑے ہوئے پٹ کھول دیے کہیں دور سے بینوں کی آواز آرہی تھی۔ کون مر گیا۔۔۔؟ وہ بستر سے اٹھ بیٹھی ان دنوں تو محلے کے کئی آدمی جنگ پر مارے

گئے تھے مگر یہاں اتنی دور رونے کی آوازیں نہ آئی تھیں۔ بس یوں ہی خبریں سنی تھیں مگر ادھر کچھ دنوں سے تو سارا محلہ اس گھر سے کٹ گیا تھا۔ جھمی جب محلے میں گھوم پھر کر آتی تو ساری خبریں سنا دیا کرتی۔ محاذ پر کون ختم ہو گیا، کس کی بیٹی کی شادی ہو رہی ہے، کس کے ہاں لڑکا پیدا ہوا، کون اپنی پارٹی کے پیچھے جیل چلا گیا اور کون سا بوڑھا مدتوں کی بیماری جھیل کر ختم ہو گیا۔

وہ جلدی سے نیچے چلی گئی۔ صحن میں پڑی ہوئی لوہے کی کرسی رات کی بارش سے دھل کر چمک رہی تھی اور کیاری کے پودے اولوں کی چوٹ سے دب کر زمین پر جھک گئے تھے۔

وہ چپ چاپ تخت پر جا بیٹھی جہاں اماں اور بڑی چچی رونے کی آوازوں پر کان لگائے خاموشی سے بیٹھی چائے پی رہی تھیں۔ کریمن بوا پراٹھے پکاتے ہوئے اپنے گھر کی سلامتی کی دعائیں کر رہی تھیں۔

"کون مر گیا۔؟" بڑی چچی نے جیسے اپنے آپ سے سوال کیا۔

صدر دروازہ زور سے کھلا اور کمر پر جھوا رکھے بھنگن صحن میں آ گئی — وہ تھانہ دار کے صاحبزادے منظور میاں جنگ پر مارے گئے۔ ہائے کیسے کڑیل جوان تھے ماں اپنی جان بیچے لیتی ہے۔ صحن میں کھڑے کھڑے اس نے اطلاع دی اور پھر کام میں جُت گئی

"مجھے لینا، میں چلی۔" بڑی چچی نے سینے پر ہاتھ رکھ لیے اور آگے کو جھک گئیں — "میرا جمیل ——"

وہ ٹھیک ہوں گے بڑی چچی، وہ بالکل خیریت ہوں گے، وہ محاذ پر نہیں جائیں گے ان کا دوسرا کام ہے۔" عالیہ نے بڑی چچی کو تھام لیا۔ پراٹھا

توسے پر جل رہا تھا اور کریمن بوا بڑی چچی کو پانی پلا رہی تھیں۔

"ذرا ہمت سے کام لیجئے بڑی بھابی، اللہ نے چاہا تو جمیل خیریت سے ہوگا کلکتہ یہاں سے کون سا دور ہے اسرار کو بھیج کر خیریت معلوم کرالیں" اماں بھی سمجھا رہی تھیں مگر بڑی چچی کی بیقراری کم نہ ہو رہی تھی۔

"کیا منظور مر گیا۔" بڑے چچا نے پوچھا وہ آج دیر سے سو کر اٹھے تھے ان کا منھ سرخ ہو رہا تھا یہ انگریز بہادر اپنے مفاد کے خاطر ہمارے خون سے ہولی کھیل رہے ہیں اماں کی تیوریوں پر بل پڑ گئے تھے۔ مگر اس وقت وہ کچھ نہ بولیں۔ بڑی چچی اب اپنے آپ کو سنبھال کر بیٹھ گئی تھیں۔ رونے کی آوازیں مدھم پڑتے پڑتے کھو گئی تھیں۔

"اور سنا ہے کہ زینب بیگم کا لڑکا جرمنوں کی قید میں ہے" کھنگن نے جاتے جاتے دوسری اطلاع دی۔

بڑے چچا چوکی پر بیٹھے ہاتھ منھ دھو رہے تھے۔ عالیہ نے دیکھا کہ ان کے ہاتھ کانپ رہے ہیں وہ گھبرا گئی۔ "آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے بڑے چچا۔؟" اس نے قریب جا کر پوچھا۔

"میں بالکل ٹھیک ہوں" وہ کھسیانی ہنسی ہنسنے لگے۔

"اتنے دن سے جمیل کا خط بھی تو نہیں آیا۔" بڑی چچی کی آواز میں خدشات لرز رہے تھے۔

سردیوں کی ٹھٹھری ہوئی دھوپ دیواروں سے اتر کر صحن میں پھیل رہی تھی نجمہ پھوپھی کالج جانے کے لیے نیچے اتریں تو کریمن بوا نے خبر سنائی۔ "نجمہ بٹیا تھانیدار کے صاحبزادے بھی جنگ پر مارے گئے۔ اللہ جمیل میاں کو خیریت سے رکھے۔

"اس گھر کی کیسی بدنصیبی ہے کہ اتنی تعلیم بھی نہ حاصل کر سکے جو آرام سے روزی

کرا لیتے۔" نجمہ پھوپھی کے چہرے سے فکر ظاہر ہو رہی تھی۔

"جی ہاں اور آپ تو اعلیٰ تعلیم حاصل کرکے بڑے معرکے سر کر رہی ہیں۔" جانے کیسے عالیہ نے انگریزی میں بات کرنے کی جرأت کی تھی۔

"اوہ! تم۔۔ سے کس نے کہا ہو کر غلط سلط انگریزی بولا کرو۔ گھروں میں بیٹھے بیٹھے بی اے کر لیا تو سمجھا کہ بس قابل ہو گئے۔" نجمہ پھوپھی نے بری طرح ڈپٹا۔ ان کے لہجے میں اتنی ہتک تھی کہ عالیہ کا جی چاہا کہیں زمین میں دفن ہو جائے۔

"نجمہ بی، زیادہ باتیں نہ بناؤ، کسی کی دولت سے قابل بنی ہو۔ میرا اور بڑی بھابی کا گلا کاٹ کاٹ کر یہ صلہ دے رہی ہو، میں مجبور نہیں ہوں جو تمھاری بات سنوں گی۔ میرا شوہر زندہ رہے، تم جلیبوں کو تو۔۔" اماں کچھ کہتے کہتے رک گئیں۔

"اُف، اُف! میں آپ لوگوں کے منھ نہیں لگنا چاہتی، وہ فارسی والے سعدی صاحب بھی کہہ گئے ہیں کہ جاہلوں سے اس طرح بھاگو جیسے تیر کمان سے۔۔" اور وہ ناشتہ چھوڑ کر کالج جانے کے لیے باہر نکل گئیں۔

"کریمن بوا بڑی بھابی سے کہو کہ پریشان نہ ہوں میں جمیل کی خیریت معلوم کرا دوں گا۔ اگر سب لوگ ناشتہ کر چکے ہوں تو۔۔" بیٹھک سے اسرار میاں کی کمزور سی آواز آئی۔

"تم سب کو پریشان ہونے دو اسرار میاں، تم اپنا ناشتہ کر لو۔۔" کریمن بوا چائے کی پیالی اور گھی چپڑی روٹی لے کر اس طرح جھپٹیں جیسے اسرار میاں کے منھ پر دے ماریں گی۔

"کہہ دو نا کہ خیریت معلوم کرا آئے اور کیا کام ہی اس نکمے کو۔" اماں نے کریمن بوا سے کہا۔ مگر وہ بڑی خاموشی سے جھوٹے برتن سمیٹتی رہیں۔

منظور کے گھر سے بین کی آوازیں پھر بلند ہونے لگی تھیں۔ بڑی چچی گھٹی گھٹی سی بیٹھی تھیں۔ گلی میں کوئی فقیر صدا لگاتا گزرا تو انھوں نے پاندان کی کلھیا سے ایک پیسہ نکال

کر کریمن بوا کی طرف بڑھا دیا۔

دوپہر کو جمیل بھیا کا خط اور منی آرڈر آ گیا۔ بڑی چچی خوشی سے کانپ رہی تھیں اور تھم تھم کر آنے والی بین کی آوازیں بھی اب اتنی درد بھری نہ معلوم ہو رہی تھیں بڑی چچی برابر جمیل بھیا کی باتیں کیے جا رہی تھیں اور کریمن بوا مزار پر چڑھانے کے لیے ملیدہ بنا رہی تھیں۔ خدا نے ان کی منت پوری کی تھی۔ جمیل بھیا کا خط آ گیا تھا۔

(۳۶)

فروری کے خوشگوار دن بہار دے رہے تھے مگر بڑے چچا کا چہرہ کیوں پیلا ہو رہا تھا ان کے ہاتھ پاؤں سوکھتے جا رہے تھے اور پیٹ بڑا ہوتا جا رہا تھا۔ گاندھی جی نے جیل میں اکیس دن کا برت رکھا تھا۔ آزادی کے لیے انھوں نے جان کی بازی لگا دی تھی اور ادھر بڑے چچا نے آرام کرنا چھوڑ دیا تھا۔ جانے کہاں مارے مارے پھرا کرتے یا پھر بیٹھک میں دوستوں کا ہجوم ہوتا۔ نت نئی اسکیمیں تیار ہوتی رہتیں۔ عالیہ بڑے چچا کی حالت دیکھ دیکھ کر کڑھتی رہتی۔ اللہ یہ بڑے چچا کس مٹی سے بنے ہوئے ہیں۔ کبھی جمیل بھیا کی خیریت نہیں پوچھی۔ سکیں مرتا ہو یا جیتا ہو انھیں کوئی خبر نہیں۔ بڑی چچی غموں کی آگ میں سلگ رہی ہیں مگر وہ پلٹ کر نہیں دیکھتے۔ گاندھی کے مر جانے کا خوف ستا رہا ہے عالیہ کئی دن سے سوچ رہی تھی کہ بڑے چچا کو سمجھائے گی، انھیں ان کی صحت کی خرابی کی اطلاع دے گی۔

رات کو جب سب لوگ بیٹھک کو خالی کر گئے تو وہ بڑے چچا کے پاس جا بیٹھی وہ جیسے تھک کر لیٹے تھے لالٹین کی پیلی پیلی روشنی میں ان کا چہرہ اور بھی کمزور لگ رہا تھا "تم کو پتہ ہے نا۔ گاندھی جی نے جیل میں برت رکھا ہے! مجھے معلوم ہے کہ وہ

کبھی نہیں مریں گے، مگر ۔۔"

"ہاں بڑے چچا معلوم ہے، اخبار میں پڑھا تھا مگر ۔۔" وہ گھگھیا گئی۔

"اگر خدانخواستہ انھیں کچھ ہوگیا تو انگریز بہادر اپنی ساری مکاری بھول جائیں گے، ایک اتنا بڑا طوفان آئے گا جو انگریز کو جنگ سے بھی زیادہ مہنگا پڑے گا۔" بڑے چچا مارے جوش کے بیٹھ گئے۔

"ٹھیک ہے بڑے چچا۔ اس نے کمزور سی آواز میں کہا۔ اب وہ انھیں کیسے سمجھائے اُن سے کیا کہے، وہ ہولے ہولے اُن کا سر سہلانے لگی ۔۔ "آپ اپنی صحت کی فکر نہیں کرتے بڑے چچا ہم سب آپ ہی پر ہیں۔"

"وہ میں نے اسرار میاں سے کہہ دیا ہے کہ میرے لیے حکیم محمود صاحب سے کچھ معجونیں بنوا لائیں، بس دو دن میں طاقت آجائے گی۔ بڑے پائے کے حکیم ہیں اور ملک کی آزادی حاصل کرنے کے لیے سب سے آگے رہتے ہیں مجھے بھی کچھ ایسا لگ رہا ہے کہ ان دنوں کمزور ہو رہا ہوں، ذرا لالٹین کی بتی اونچی کر دو، بس جیسے ہی آزادی ملی بجلی کا کنکشن بحال کراؤں گا یہ لالٹین کی روشنی رات کو پڑھنے نہیں دیتی۔"

عالیہ نے اُٹھ کر لالٹین کی بتی اونچی کر دی۔ کون جانے آزادی کے بعد کیا ہوگا۔ پھر ملک کی خدمت شروع ہو جائے گی۔ بجلی کا کنکشن بحال کرانے کی کسے فرصت ہوگی۔ یہ گھر تو اندھیرے ہی میں ڈوبا رہے گا۔ عالیہ نے دل ہی دل میں سوچا اور پھر بڑے چچا کے سرہانے آبیٹھی۔ اس وقت ان کے چہرے پر کتنی مسرّت تھی۔ شاید آزادی کا تصور مچل رہا تھا۔

"پھر تو سب کچھ ہو جائے گا بڑے چچا" عالیہ نے جیسے ہار کر کہا۔

"تم میری کتابیں پڑھتی ہو نا؟" انھوں نے پوچھا۔

"ہاں پڑھتی ہوں بڑے چچا"

"نجمہ کیسی ہے۔ بہت دنوں سے دیکھا نہیں؟"

"وہ جاہلوں میں نہیں بیٹھتیں۔ اچھی ہیں۔"

اتنا پڑھنے کے بعد بھی وہ لڑکی گنبد کی آواز ہے۔ انگریزوں کی تعلیم کا مقصد یہی تھا!

بڑے چچا نے ٹھنڈی سانس بھری۔ عالیہ نے کوئی جواب نہ دیا۔ بڑے چچا تو آنکھیں بند کر کے شاید سونے کی تیاری کر رہے تھے۔ ذرا ہی دیر میں وہ خراٹے لینے لگے تو عالیہ دبے قدموں کمرے سے چلی گئی۔

باہر ٹھنڈی ہوا سائیں سائیں کر رہی تھی اور بادلوں کے چند ٹکڑے ادھر ادھر دوڑتے پھر رہے تھے۔ اماں اور بڑی چچی شاید اپنے کمروں میں سو رہی تھیں مگر کریمن بوا اب تک چولھے کے پاس بیٹھی اپنی بوڑھی ہڈیاں سینک رہی تھیں۔ وہ جیب سیڑھیوں پر ہو لی۔

نجمہ پھوپھی اب تک پڑھ رہی تھیں۔ عالیہ نے ان کی طرف کھلنے والے دروازے بند کر لیے اور اپنے بستر پر لیٹ گئی۔ ہائی اسکول کی طرف سے الّو کے بولنے کی آواز آ رہی تھی۔ گلی میں کچھ آوارہ کتے لڑ رہے تھے۔ اسے رات بڑی ڈراونی معلوم ہوئی اور کریمن بوا کی بات یاد آ گئی۔ جب کتے روتے ہیں تو کوئی آفت آتی ہے۔ اب اور کون سی آفت آنے کو رہ گئی ہے۔ ابا جیل میں دن کس طرح گزارتے ہوں گے۔؟

رات جانے کس طرح گزری۔ گزری نہیں رات نے اسے گزار دیا۔ کیسی بے چینی کیسی بے کلی۔ جاگتے جاگتے آنکھوں میں جلن ہونے لگی۔ اللہ۔ اللہ۔ وہ بار بار جیسے کراہتی اور گلی میں کتے روئے چلے جاتے تھے۔

رات کے پچھلے پہر جب میونسپلٹی کی روشنی بجھ گئی تو کمرے میں گھور اندھیرا چھا گیا۔ مرغوں کی اذانوں کی آوازیں آنے لگیں تو وہ بڑے سکون سے سو گئی۔ صبح کے تقدس نے اسے کے دماغ سے ساری بلاؤں کو ٹال دیا تھا۔

کسی نے زور سے زنجیر کھڑکائی تو اس کی آنکھ کھل گئی۔ بجمہ پھوپھی کی لرزتی ہوئی آواز اس کے کانوں کو چھید گئی۔ "ہائے منظر بھیا جیل میں مر گئے۔" اماں کی چیخیں بلند ہو رہی تھیں۔ بڑی چچی اونچی آواز سے رو رہی تھیں اور کریمن بوا کے سینہ پیٹنے کی آوازیں صاف سنائی دے رہی تھیں۔ پھر بھی وہ اپنے بستر پر بے حس و حرکت پڑی رہی۔ وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ہر طرف دیکھ رہی تھی۔ یہ صبح صبح رات کیسے ہو گئی۔ سورج کدھر غائب ہو گیا کیا سچ مچ ابا مر گئے۔

وہ رونا چاہتی تھی۔ چیخنا چاہتی تھی۔ اسے اپنا دل پھٹتا ہوا محسوس ہو رہا تھا مگر وہ کچھ بھی نہ کر سکی۔ اور کریمن بوا سینہ پیٹتی اس کے پاس آ گئیں اسے اپنی چھاتی سے لپٹائے لپٹائے نیچے لے گئیں۔ اور وہ ان کے ساتھ اس طرح چلتی رہی جیسے گھسٹ رہی ہو۔ اس کے پیروں میں جان کہاں تھی۔

بڑے چچا صحن میں کھڑے تھے۔ کیا یہ بڑے چچا ہیں؟ کیا یہ زندہ ہیں؟ انھیں کیا ہو گیا ہے؟ بڑے چچا نے اس کی طرف دیکھا بھی نہیں وہ ان کے برابر کھڑی رہی۔ اماں بے تحاشہ رو رو کر تڑپ رہی تھیں۔ ان کی آنکھوں میں کیسی بے بسی تھی۔ کتنی حسرت تھی ان کے چہرے پر بے چارگی کی دھول اڑ رہی تھی۔

عالیہ لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے اماں کی طرف بڑھی، اور لپٹ گئی اور پھر اسے محسوس ہوا کہ وہ بھی رو سکتی ہے۔

"اسے انگریزوں نے مار دیا ہوگا، وہ خود نہیں مرا، وہ مر ہی نہیں سکتا۔ وہ میرا بھائی" بڑے چچا لوہے کی کرسی کو تھام کر بیٹھ گئے "میں اسے لینے جا رہا ہوں۔" بڑے چچا اپنے گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر جیسے بڑی مشکل سے کھڑے ہو گئے۔

"جلدی سے چلیے بڑے بھیا" بیٹھک سے اسرار میاں کی آنسوؤں سے بھیگی

ہوئی آواز آئی - لیکن اس وقت تو کریمن بوا ان کی آواز سن ہی نہ رہی تھیں -

سب روتے روتے تھک گئے - برآمدے میں بچھی ہوئی دری پر اب سوگوار بیٹھے تھے دھوپ صحن سے سرک کر دیواروں پر چڑھ گئی تھی اور کوے ایک ساں کائیں کائیں کیے جا رہے تھے - بھلا اب یہ کس کی آمد کی اطلاع دے رہے ہیں - کہاوتوں میں کوئی جان نہیں ہوتی، عالیہ کا جی چاہ رہا تھا کہ دیوار پر بیٹھے ہوئے کووں کو مار مار کر اڑا دے -

سب کی نظریں صدر دروازے پر لگی ہوئی تھیں - مغرب کا وقت ہو رہا تھا اور بڑے چچا ابا کو لے کر اب تک نہیں آئے تھے - گلی میں کسی کے بھی قدموں کی چاپ ہوتی تو سب چونک پڑتے - کوئی فقیر صدا لگاتا گزرتا تو ایسا جان پڑتا کہ بین کر رہا ہو -

کریمن بوا نے صحن میں چولھا بنا کر بڑے پتیلے میں پانی چڑھا دیا تھا اور سیلی ہوئی لکڑیوں کو پھونک پھونک کر گود میں رکھے ہوئے قرآن شریف پڑھتی جا رہی تھیں - صحن میں ہوا کتنی سرد ہو رہی تھی -

گلی میں بہت سے قدموں کی چاپ سنائی دی اور پھر اسرار میاں کی آواز آئی - "سب پردہ کر لیں - مظہر بھیا آ گئے -"

تھمے ہوئے طوفان نے پھر سے زور پکڑ لیا برآمدے میں بچھے ہوئے پلنگ پر ابا کی لاش رکھ کر جب سب لوگ بیٹھک میں چلے گئے تو عالیہ دوڑ کر پلنگ کے پاس آ گئی اماں پلنگ کی پٹی سے سر پھوڑ پھوڑ کر رو رہی تھیں - نجمہ پھوپھی اپنے بھیا راجہ کو پکار رہی تھیں - بڑی چچی اماں کو لپٹائے بیٹھی تھیں اور کریمن بوا سر جھکائے قرآن شریف پڑھے جا رہی تھیں -

عالیہ نے ابا کے منہ پر سے چادر سرکا دی - کیا سچ مچ یہ ابا ہیں - اس نے بہت

چاہا جیل نے کچھ بھی تو نہ چھوڑا تھا۔ بڑے چچا" ۔عالیہ نے بڑے چچا کا ہاتھ تھام لیا تھا وہ اپنے بھائی کے سرہانے سر جھکائے خاموش کھڑے تھے۔ "میرے بھائی کو انھوں نے مار ڈالا اس نے تو انگریز حکمران کو مار کر ثواب بھی نہیں کمایا تھا اور انھوں نے اتنی بڑی سزا دے دی میں سب کو بتاؤں گا۔ میں اس جنازے کو جلوس کی صورت میں لے جاؤں گا۔ بڑے چچا جوش کے مارے چیخ رہے تھے۔

"کون نکالے گا جلوس؟" اماں تن کر کھڑی ہوگئیں۔ "جب یہ زندہ تھے تو آپ کے تھے، آپ کا سایہ تھے اب یہ میرے ہیں ان کی لاش کی کوئی بے حرمتی نہیں کر سکتا۔"

بڑے چچا کا سر ایک دم جھک گیا۔

پھر ابا چلے گئے۔ ایک ہنگامہ ہوا اور ٹھہر گیا۔ آخری دیدار میں کتنی ہوس ہوتی ہے۔ وہ حیران تھی کہ ابا کی تصویر اس کی پتلیوں میں کیوں نہیں کھنچ گئی۔

رات گیارہ بجے کے قریب اسرار میاں اور بڑے چچا قبرستان سے واپس آگئے۔ اس وقت آنسو تھم چکے تھے۔ اور صبر کی سل سینوں پر سرک آئی تھی۔

"کریمن بوا، چھوٹی دلھن سے کہو اگر ان کے بدلے میں مجھے موت آجاتی تو میں ضرور مرجاتا، یہ بندہ بڑا بے بس ہے۔" اسرار میاں کی آواز سناٹے کو چیر گئی۔

"تم نہیں مر سکتے اسرار میاں، تم زندہ رہو گے، تم نہیں مر سکتے۔" کریمن بوا نے قرآن شریف پڑھتے پڑھتے اسرار میاں کی زندگی پر لعنت بھیج دی۔

تیسرے دن شام کو حیدر آباد دکن سے ظفر چچا اور ماموں دونوں ہی آگئے۔ اماں اپنے بھائی سے مل کر بہت بیقرار ہو رہی تھیں۔ ان کی آنکھوں میں عجیب سی بھیک اور التجا تھی مگر ماموں نظریں چرا رہے تھے، وہ کچھ نہیں دیکھنا چاہتے تھے کیا ان کی انگریز بیوی نے ان کی زندگی کا پھندا گلے میں ڈال کر خودکشی کر لیتی۔؟

ظفر چچا صدمے سے نڈھال تھے اور بار بار کہہ رہے تھے کہ اگر میرا بھائی حیدر آباد میں رہتا تو آج یہ حشر نہ ہوتا۔ پھر شام کو وہ اپنی محفوظ حکومت کی سرزمین کی طرف روانہ ہو گئے۔ انھوں نے اماں کی ہر طرح مدد کرنے کا وعدہ کیا تھا۔

کئی دن بعد چھمی کا خط آیا تھا شاید اس نے رو رو کر لکھا تھا آنسوؤں نے روشنائی پھیلا دی تھی۔ آخر میں اس نے لکھا تھا کہ اب وہ اس گھر میں نہیں آنا چاہتی۔ چھوٹے گاؤں سے کیا ناتا۔ اس نے اپنے متعلق اب بھی کچھ نہ لکھا تھا۔ جمیل بھیا کا بھی خط آیا تھا۔ انھوں نے لکھا تھا کہ مظہر چچا کبھی نہیں مر سکتے۔ وہ ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ انھوں نے دو دن کی چھٹی پر آنے کو لکھا تھا۔

(۳۷)

اس دفعہ بہار کتنی جلدی گزر گئی۔ کیاری میں ڈھیروں گل عباس اور سورج مکھی کے پھول کھلے مگر ان میں کوئی دلکشی نظر نہ آئی۔ آم کے درختوں میں بور آتے ہی کوئل نے چیخنا شروع کر دیا تھا۔ مگر کسی نامعلوم سی تڑپ نے عالیہ کے کلیجے کو نہ مسلا۔ ابا کی موت کے بعد وہ کتنی دل شکستہ ہو گئی تھی۔

اماں اب ہر وقت سر نیوڑھائے جانے کیا سوچا کرتیں اور بڑی چچی ادھر ادھر کی باتیں کر کے انھیں بہلانے کی کوشش کرتی رہتیں، پھر بھی اماں کی فکروں میں کمی نہ ہوتی جانے وہ کیا سوچتی رہتی تھیں۔ عالیہ ان کے پاس پہروں بیٹھی رہتی مگر وہ دل کی بات نہ کہتیں۔

بڑے زور کی گرمی پڑنے لگی تھی۔ سر شام آسمان پیلا ہونے لگتا تو محلے کے بچے شور مچاتے۔ پیلی آندھی آئی۔ شاید ہی کوئی دن گزرتا جو آندھی نہ آتی ہو، سارا دن لو چلتی رہتی۔ گلی میں بگولے لوٹتے پھرتے اور عالیہ اپنے چھوٹے سے کمرے میں پڑے

بڑے اپنے مستقبل کے لیے سوچتی رہتی۔ یہ دن تو کاٹے نہ کٹ رہے تھے۔ وہ اب یہاں سے بھاگ جانا چاہتی تھی اس گھر کی ایک ایک چیز اُسے کاٹنے کو دوڑتی۔ دادی کے کمرے میں جاتی تو ان کی تیز تیز سانسیں سنائی دینے لگتیں، صحن میں بچھے ہوئے ہر پلنگ پر ابا کی لاش پڑی نظر آتی اور جب لوہے کی کرسی دیکھتی تو جانے کیوں وحشت ہونے لگتی اور پھر بھاگ جانے کی خواہش اور بھی جڑیں پکڑنے لگتی۔ جمیل بھیا اُسے تسلی دینے بھی نہ آسکے۔ اس کے باپ کی موت کتنی معمولی بات تھی اور پھر تو اُسے جمیل بھیا سے نفرت ہو کر رہ گئی تھی۔

دھوپ چھت کی منڈیروں پر چڑھتے چڑھتے غائب ہو گئی تھی تو عالیہ اپنے کمرے سے نکل کر چھت پر آگئی۔ نجمہ پھوپھی اب تک اپنے کمرے میں پڑی اونگھ رہی تھیں اور پھر کچھ دنوں سے وہ بھی بدلی بدلی نظر آتیں۔ کتاب ان کے سینے پر کھلی پڑی رہتی اور جانے کیا سوچتی رہتیں۔ عالیہ کو کئی بار خیال آیا کہ اس طرح نجمہ پھوپھی کی انگریزی کمزور ہو جائے گی۔

قریب قریب کی چھتوں سے لڑکے لال پیلی پتنگیں اُڑا رہے تھے۔ "وہ کاٹا" کی آوازیں آرہی تھیں اور گلی میں گلاب کی گنڈیریاں بیچنے والا تو جیسے اسی گلی کا ہو کر رہ گیا تھا۔

اس نے دل چسپی سے پتنگوں کو دیکھنا اور گننا چاہا مگر ذرا ہی دیر میں جی اُچاٹ ہو گیا۔ آج وہ بے حد اداس اور پریشان تھی۔ سارے دن کی دھوپ میں تپے ہوئے پلنگ پر منھ لپیٹ کر پڑ رہی۔

"عالیہ"

"اماں" عالیہ ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھی۔ اماں کے آنے پر اُسے حیرت ہو رہی تھی۔ مدتیں گزر گئیں اُنھوں نے زینے پر قدم بھی نہ رکھا تھا۔ کبھی تنہائی میں بیٹھ کر اس سے بات بھی نہ کی تھی۔ پھر ادھر ابا کے مرنے کے بعد تو وہ جیسے سدھ بدھ کھو چکی تھیں۔

"علی گڑھ جاؤ گی بی اے کرنے؟" انھوں نے عالیہ کے پاس بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

"ضرور جاؤں گی، آپ ماموں کو لکھ دیجیے کہ وہ زیادہ روپیہ بھیجنے لگیں۔"

اماں نے اُسے غور سے دیکھا۔ اور پھر کسی خیال میں گم ہو گئیں۔ بسیرا لینے والے پرند تنکارے اُڑے جا رہے تھے۔ عالیہ نے انھیں بے دلی سے دیکھا اور پھر اماں کا منھ تکنے لگی "اگر تمھاری جگہ کوئی لڑکا ہوتا تو مجھے اتنی مایوسی نہ ہوتی۔ خیر اب تو تم ہی سب کچھ ہو۔ تمھی کو سب کچھ کرنا ہے۔" اماں کی آنکھوں میں چمک تھی۔

"بس ایک سال کی دیر ہے اماں، پھر میں اپنے پیروں پر کھڑی ہو جاؤں گی۔"

"میں کہتی ہوں کہ اب تم علی گڑھ جانے کا خیال چھوڑ ہی دو۔ خدا جمیل کو خیریت سے واپس لے آئے، میں تمھارے ماموں سے سب روپے لے کر اُسے دے دوں گی تمھارے چچا کی یہی دوکانیں کچھ دن بعد چل نکلیں گی۔ وہ بہت اچھا لڑکا ہے اس نے میرا ہمیشہ ادب کیا ہے۔ خدا اسے خوش رکھے۔ میرا خیال ہے کہ اگر میں نے کہا تو جنگ سے آنے کے بعد تمھارے ماموں اُسے ضرور کوئی بڑا عہدہ بھی ضرور دلا دیں گے۔ رہے تمھارے بڑے چچا اور اسرار۔ تو میں انھیں جلد ہی اس گھر سے چلتا کر دوں گی۔ بنا بنایا گھر ہے، حویلی سے کچھ کم تو نہیں۔ سب تمھارے نام لکھوا لوں گی۔ شکیل تو سمجھو مر ہی گیا ورنہ کوئی خط وط لکھتا ماں کو۔" سب کہہ چکنے کے بعد اماں اس کا منھ دیکھ رہی تھیں۔

عالیہ سب کچھ سمجھ گئی تھی۔ اس نے آنکھیں پھاڑ کر اماں کو دیکھا۔ بچپن میں سُنی ہوئی کہانیوں کی چڑیل اماں کا منھ چھپا کر اس کے سامنے تھرکتی معلوم ہو رہی تھی۔ "میں علی گڑھ جاؤں گی، یہ گھر بڑے چچا کو مبارک رہے۔ آپ اس قسم کی باتیں نہ سوچیں تو بہتر تھا۔" عالیہ نے سختی سے کہا اور اس طرح منھ پھیر لیا جیسے اب کچھ نہ سننا چاہتی ہو۔

"وہی باپ والی فطرت ہے مجھے معلوم ہے کہ تم مجھے خوش نہیں دیکھ سکتیں۔ تم چاہتی ہو کہ میں ہمیشہ بے گھر رہوں۔ میرا کھویا ہوا راج پاٹ اب کبھی نہ ملے گا۔" اماں نے منھ پر دوپٹے کا

پو رکھ لیا اور سسک سسک کر رونے لگیں۔

عالیہ اجنبیوں کی طرح خاموش بیٹھی انھیں روتے دیکھتی رہی۔ اُسے اپنی اماں کی تباہ زندگی سے ہمدردی ہے۔ وہ انھیں سکھ دینا چاہتی ہے۔ مگر وہ کچھ نہیں جانتیں اور کتنی خطرناک اسکیم لے کر اس کے تباہ ہونے کا سامان کر رہی ہیں۔ وہ ماں ہو کر اسے دھوکا دے رہی ہیں۔ چچا نے کبھی ایک لمحے کو بھی زندگی کی خوشیاں سمیٹنے کی کوشش نہیں کی اور اب پیسہ کمانے بھی گئے ہیں تو مقصد فاشزم کو ختم کرنا ہے وہ کبھی چچی کی طرح عبرتناک زندگی نہیں گزارے گی۔ اور اماں نے خود کیسی زندگی گزاری ہے۔ ابا ایک منٹ کو بھی گھر کے نہ ہو سکے کیا اماں یہ سب کچھ نہیں سوچ سکتیں۔ کیا یہ سچ مچ اس کی ماں ہیں۔ اس نے دھندلائی ہوئی آنکھوں سے اماں کو دیکھا جو اب آنسو پونچھ کر اس سے منہ موڑے اُٹھ رہی تھیں۔

"تم علی گڑھ جاؤ تب اپنے بھائی کو لکھ دوں گی۔ میں تم سے کسی قسم کی توقع نہیں رکھتی۔ جو جی چاہے کرو۔"

عالیہ اماں کو جاتا ہوا دیکھتی رہی اپنے بھائی پر کتنا غرور تھا اُن کو؟ عالیہ کا جی چاہا کہ خوب زور سے ہنسے مگر وہ اماں کے جاتے ہی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی اس وقت اتنی بے بسی میں وہ خود کو بے حد تنہا محسوس کر رہی تھی۔

رو چکنے کے بعد وہ جیسے ہلکی پھلکی ہو کر کھرّے پلنگ پر لیٹ گئی۔ بسیرا لینے والے پرندے کیسی قطار سے اُڑتے جا رہے تھے

"کریمن بوا کیا سب لوگ چائے پی چکے؟" اسرار میاں کی کمزور سی آواز اس کے دکھے ہوئے دل کو اور بھی دکھا گئی — اسرار میاں تم اب تک چائے کے انتظار میں بیٹھے ہو۔ آج کریمن بوا نے کوئی جواب نہیں دیا۔ آج تم کو قیامت تک چائے نہیں ملے گی۔ عالیہ نے ٹھنڈی سانس بھری۔ کالج کھلنے میں کتنے دن باقی رہ گئے ہیں وہ دل ہی دل میں حساب لگانے لگی۔

(٣٨)

وہ پورے دس مہینے بعد علی گڑھ سے لوٹی تھی۔ بڑے دن کی چھٹیاں گزارنے بھی گھر نہ آئی تھی۔ اماں نے بھی اُسے نہ بلایا تھا۔ بڑی چچی کے کئی خط آئے تھے کہ وہ ضرور آئے اور بھی سب حال احوال لکھنے والی رہی تھیں اماں تو اتنے دنوں سے ناراض تھیں۔ اتنی مدت میں اماں نے ایک بھی خط نہ لکھا تھا۔ انھیں خبر بھی نہ تھی کہ وہ تبھی سے ناراض ہیں یا وہ راتوں کو تنہائیوں میں ان کے دکھوں کو یاد کر کے تڑپتی رہی۔ وہ اماں کو ایک لمحے کے لیے بھی اپنے ذہن سے اتار نہ سکی تھی۔ اس کے بعد اگر کوئی شدت سے یاد آتا تو وہ بڑے چچا تھے گرماگرم خبریں اور غیر معمولی حالات ان کی یاد میں اضافہ کرتے رہتے۔ اس نے بڑے چچا کو کئی خط لکھے مگر جواب کا انتظار ہی رہا۔

تانگے سے اتر کر وہ سب سے پہلے بڑی چچی سے ملی اور اپنی بے پناہ مسرت کو اپنے سینے میں سموئے اماں سے لپٹ گئی اور رو رو کر اماں کا سینہ تر کر دیا۔

گھر کا نقشہ کیا بگڑا بگڑا لگ رہا تھا۔ آندھیوں اور بارشوں نے دیوار کا رنگ چاٹ لیا تھا۔ کمروں کی سفیدی میلی اور مریضی معلوم ہو رہی تھی۔ دالان کے پردے کئی جگہ سے پھٹ کر لٹک گئے تھے۔ کریمن بوا انہی کی یادوں کے بوجھ سے کمر جھکا کر چلنے لگی تھیں اور اماں کی پیشانی کے سامنے بہت سے سفید بال جھانکنے لگے تھے۔ بڑی چچی تو جیتا جاگتا تعزیہ تھیں اور صحن میں پڑی ہوئی لوہے کی کرسی کے پایوں میں زنگ لگ چکا تھا۔

"تہمینہ کے لڑکی ہوئی ہے، ساجدہ کا خط آیا تھا" بڑی چچی نے اطلاع دی۔

"اوہ! پیاری تہمینہ اماں بھی بن گئی" وہ خوشی سے اچھل پڑی۔ "یہ اس کی بچی کا کرتہ ٹوپی لے کر کون جانے والا ہے، اب تو اس گھر میں ساری رسمیں مر چکی ہیں" وہ رنجیدہ ہو گئی

"شکیل کی کوئی خبر ملی۔ بڑی چچی؟" عالیہ نے پوچھا۔

"تمھارے جمیل بھیا نے لکھا تھا کہ وہ بڑے مزے میں ہے، ڈھیروں کماتا ہے اور اڑاتا ہے کسی کو یاد نہیں کرتا، اس کے لیے سب مر گئے ہیں، تمھارے جمیل بھیا بمبئی گئے تھے نا" شکیل کے نام پر بڑی چچی کی کچھ ایسی حالت ہو گئی جیسے چلچلاتی دھوپ میں ننگے پاؤں چل رہی ہوں " دیکھو جس نے پیدا کیا اسی کو بھول گیا۔ ایک لیے علتی کرتا ہے" انھوں نے لمبی آہ کھینچی

"ایک وہ بھی زمانہ تھا جب سارے چھوٹے صبح اُٹھ کر اپنے بڑوں کو سلام کرتے تھے۔ جو کچھ تھا سب ماں باپ کے ہاتھ میں تھا۔ کریمن بوا بڑبڑائیں۔

ہے۔ بڑی چچی کتنی معصوم ہیں۔ عالیہ سوچ رہی تھی۔ بھلا جمیل بھیا بمبئی میں کیوں تلاش کرتے پھریں گے۔ پتہ نہیں شکیل کہاں ہوگا پھر بھی شکر ہے کہ جمیل بھیا اپنی ماں کا دل رکھ رہے ہیں۔ ہائے کس پتھر کا بنا تھا شکیل۔

اوپر کے کمرے کی کھڑکی کھلی اور نجمہ پھوپھی کا سر جھانکا کیسی دھنس گئی تھیں نجمہ پھوپھی بھی۔ اس کا جی چاہا کہ انھیں بھی سلام کرے مگر انھوں نے لفٹ ہی نہ دی۔ اس کی طرف دیکھا بھی نہیں۔ نجمہ پھوپھی کو سلام کرنے کے لیے اب انگریزی میں ایم اے کرنا ہوگا۔

کریمن بوا نے بڑے چاؤ سے اس کے لیے چائے تیار کی تھی۔ اتنی مدت بعد اُن کے ہاتھ سے سوکھے پراٹھے کھانے میں بڑا مزا آ رہا تھا

"بڑے چچا کہاں ہیں؟" چائے پینے کے بعد اس نے پوچھا۔

"وہیں کہیں آزادی کا جھنڈا گاڑ رہے ہوں گے" اماں نے تیوریوں پر بل ڈال کر کہا اور بڑی چچی گھبرا کر ادھر ادھر دیکھنے لگیں۔

"کہیں باہر تو نہیں گئے ہیں؟" اس نے پھر پوچھا۔ وہ اُن سے ملنے کے لیے سخت بیتاب تھی

"نہیں عالیہ، یہیں ہیں" بڑی چچی نے جواب دیا

"بس اب تم جلدی سے ملازمت کی درخواستیں دینے لگو، میں بھر پائی ان مصیبتوں سے، اس اجڑے گھر میں جانے کس طرح دن گزارے ہیں۔ کبھی پیٹ بھر کھانا نہ ملا" اماں نے بڑی بے باکی سے کہا۔ اس وقت وہ بڑی مغرور نظر آ رہی تھیں

"ارے چھوٹی دلھن۔ میں نے تو اپنی جان سے زیادہ تمھارا خیال کیا ہے، اور" بڑی چچی سے کچھ کہتے نہ بن پڑ رہی تھی۔

"بس جناب آپ کے خیال کا شکریہ، آپ لوگ میری جان بخش دیں اور جوان نہ جائیں مجھے پتہ تھا کہ ایک دن یہی سننا ہوگا۔"

"اماں!" عالیہ نے حیران ہو کر اماں کو پکارا اور بڑی چچی کی طرف دیکھ کر سر جھکا لیا ابھی تو امتحان کا نتیجہ بھی نہیں نکلا، کیا یہی سب کچھ سننے کے لیے اس نے اپنے پیروں پر کھڑا ہونا چاہا تھا، اس کا جی چاہا کہ اپنے فیل ہونے کی دعائیں مانگنے لگے۔

بڑی چچی منھ پھیر کر دوپٹے کے پلو سے آنکھیں پونچھ رہی تھیں — "اتنی مدت بعد عالیہ آئی ہے۔ اس سے باتیں کرو دلھن" وہ جیسے رینگتی ہوئی اٹھیں — "صبح سے سارا کام پڑا ہوا ہے۔ کچھ بھی تو نہیں کیا"

خدا جب دینے پر آتا ہے تو اتنا بڑا کلیجہ دے دیتا ہے۔ وہ چپ چاپ بڑی چچی کو جاتا دیکھتی رہی۔

"عالیہ بیٹا خدا آپ کو پاس کر دے، آپ کے دن پھیرے، پرانا زمانہ یاد کرتی ہوں تو کلیجہ منھ کو آتا ہے" کریمن بوا اپنی کہے جا رہی تھیں۔ انھوں نے شاید اماں کی باتیں سنی نہیں تھیں۔ نل کی موٹی دھار کچے فرش پر تڑ تڑ گرے جا رہی تھی اور کیاری میں پانی رینگ رہا تھا۔ بہار کے کھلے ہوئے سرخ، پیلے اور اودے پھول اب مرجھا چکے تھے

"ہائے اب مجھے کتنا سکون ملا ہے۔ اب ہمارے دن پلٹ جائیں گے۔" اماں بڑے ذوق و شوق سے عالیہ کو دیکھے جا رہی تھیں۔

کیا آج اس کمرے میں بڑی چچی زندگی بھر کا کام نمٹالیں گی۔ عالیہ کا دھیان بڑی چچی میں لگا ہوا تھا۔ وہ اماں کی کوئی بات نہ سن رہی تھی۔

بڑے چچا آگئے۔ اماں نے ناگواری سے دوسری طرف منھ پھیر لیا۔ اور عالیہ ان کی اس حرکت کو نظرانداز کر کے ان کی طرف لپکی۔ "بہت دن بعد دیکھا ہے آپ کو بڑے چچا" وہ ان کے لپٹ گئی۔

"امتحان کیسا رہا؟" وہ اس کے سر پر ہاتھ پھیر رہے تھے۔

"بہت اچھا رہا۔ کامیابی کی پوری امید ہے۔"

"پھر اب تم ان بے کار دنوں میں خوب پڑھو، وہ میری لائبریری کی چابی اپنے پاس رکھ لو۔" وہ اپنی شیروانی کی جیب ٹٹولنے لگے۔ "ابھی گاندھی جی کی سوانح حیات منگائی ہے۔ ضرور پڑھو۔"

"اب آپ اسے بھی تباہ کر دیجیے بڑے بھیا۔ مجھے بیوہ کر کے آپ کو صبر نہیں آیا۔ میرے پاس کچھ بھی نہ رہنے دیجیے۔" اماں آج سب سے مقابلہ کرنے پر تل گئی تھیں۔ ان کی حالت تو کچھ ایسی ہو رہی تھی۔ جیسے کمینے کے ہاتھ پیسہ آگیا ہو۔

وہ ــ وہ، میں نے کہا، جمیل کی اماں کہاں ہیں؟ دو آدمیوں کا کھانا پکے گا۔ ذرا انتظام کرا دینا۔" بڑے چچا بوکھلا کر بیٹھک میں چلے گئے۔

"ضرور پڑھوں گی بڑے چچا، ہائے کتنی اچھی کتاب ہوگی۔" عالیہ نے اماں کی پروا نہ کرتے ہوئے کہا اور تھکے تھکے قدم اٹھاتی اوپر جانے والے زینوں پر ہولی۔

"کریمن بوا، عالیہ بٹیا کو دعا کہو اور کہو کہ اللہ انھیں کامیاب کر دے۔"

"بڑے بھیا کہتے تھے کہ پرچے بہت اچھے ہو گئے ہیں۔" اسرار میاں کی آواز گھر میں داخل ہوئی تو کریمن بوا کا چمٹا بڑے زور سے کھڑکا۔ "اسرار میاں کبھی تو تم چپ بھی رہا کرو۔ کوئی بھی مبارک موقع ہو تو ضرور دخل دو گے۔"

عالیہ ایک لمحے کو جیسے زینوں پر جم کر رہ گئی اور پھر تیزی سے اپنے کمرے میں چلی گئی۔ کریمن بوا، پیٹ کی ایسی ماری ہی کہ اب تم ذائقہ دار چیزوں کا مزا تک بھول گئیں اور تمہیں صرف اپنے بڈھے سرکار مرحوم کی حرام کاری کے اس پھل کی کڑواہٹ یاد رہ گئی۔ تمہاری زندگی کی ناکامی اور غلامی دشمن بن کر اسرار میاں کے پیچھے پڑ گئی ہے۔ اللہ یہ اسرار میاں کے حصے کی موت کس کتے بلی کو آگئی ہے۔ اتنی دیر سے پلکوں میں اٹکے ہوئے آنسو ڈھلک کر بستر میں جذب ہو گئے۔

(۳۹)

بہت دن بعد جمیل بھیا کا خط آیا تھا۔ بڑی چچی ننھی سی چڑیا کی طرح ہر طرف پھدکتی پھر رہی تھیں اور اماں بڑے اشتیاق سے عالیہ کی طرف دیکھے جا رہی تھیں مگر عالیہ کو اس وقت تمام ضروری کام یاد آ رہے تھے۔ اماں کے اشتیاق میں جو خوفناک ارادہ جھانک رہا تھا، اس سے وہ اچھی طرح واقف تھی۔ اماں دادی کی حویلی کی مالکن نہ بن سکیں، جاگیردارنی نہ کہلا سکیں اب وہ بھاگتے بھوت کی لنگوٹی پر اکتفا کر رہی تھیں۔ اور پھر جمیل بھیا تو سچ مچ انہیں اچھے لگتے تھے۔ کیا مزے سے اپنے باپ کا منہ چڑا کر انگریزوں کو شکست سے بچانے کے لیے دوڑ پڑے تھے۔

"عالیہ بیٹی ذرا ایک بار پھر سے خط پڑھ دو، اپنی آنکھیں تو اب کام نہیں دیتیں، اتنا پانی آتا ہے کہ سامنے دھند چھا جاتی ہے۔" بڑی چچی نے پاندان سے خط نکال کر عالیہ کی طرف بڑھا دیا۔

"میری پیاری اماں ۔ انتہائی مصروفیت کی وجہ سے آپ کو خط نہ لکھ سکا مگر اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ آپ کو بھول گیا ۔ اماں آپ تو ہر وقت یاد آتی ہیں ۔ عالیہ بی بی تو اب واپس آچکی ہوں گی ۔ خدا کرے وہ کامیاب ہو جائیں ۔ انھیں تحفے دینے کے لیے میرے پاس کیا بچا ہے اور ۔۔۔"

عالیہ کو ایسا محسوس ہوا کہ باقی خط وہ نہیں پڑھ سکے گی ۔ اس کے گلے میں کانٹے سے چبھ رہے تھے باقی خط ہزاروں خرابیوں سے پڑھا گیا ۔

"اس گھر کو چھوڑ کر پھر ہم ہمیشہ کے لیے گھر سے محروم ہو جائیں گے ۔ عالیہ جان" بڑی چچی کے اُٹھتے ہی اماں نے آہستہ سے کہا ۔

"اماں پھر میں کہیں چلی جاؤں گی آپ مجھے جہنم میں کیوں جھونکنا چاہتی ہیں ۔" عالیہ نے خود مختار لڑکیوں کے تیور سے اماں کو دیکھا اور پھر سر جھکا لیا ۔ خواہ ۔ اس گھر کی دیواروں تک سے لونا ٹپک رہا ہو کتنے برس اور یہ گھر اماں کی جاگیر بنا رہے گا ۔

اماں ناراض ہوئے بغیر خاموشی سے اس کو دیکھا کیں ۔ ان کی آنکھوں میں ناکامیوں کا احساس سسکتا ہوا معلوم ہو رہا تھا ۔ حویلی اور جاگیر سے محروم ہونے کے بعد اب وہ حقیر سے مکان کو بھی اپنا نہ کہہ سکتی تھیں ۔

"یہ آٹا کھانے کے لائق ہے؟ بوریاں لگی ہیں ۔ اللہ یہ دن بھی دکھانا تھا ۔ کبھی اپنی زمینیں سونا اگلتی تھیں ۔" کریمن بوا آٹا چھانتے ہوئے سوت جیسے باریک باریک کیڑے چن کر پھینک رہی تھیں ۔ لمبی جنگ نے صاف ستھرے گیہوں کے ایک ایک دانے کو ترسا دیا تھا ۔ کریمن بوا آئے دن اسی ہیجان کی شکار رہتیں ۔

"اپنی حکومت جیت جائے تو کریمن بوا سب کچھ کھانے کو ملنے لگے گا ۔ سب ہار گئے ہیں بس ایک جاپان ملک ہی تو رہ گیا ہے ۔ اللہ جانے یہ کس پتھر کے بنے ہیں ۔" اماں نے کریمن بوا کو تسلی دی ۔

"بیتا ہوا زمانہ پھر نہیں آتا، چھوٹی دلہن۔" کریمن بوا نے اپنے حساب بہت بڑی بات کہہ کر سب کی طرف دیکھا اور ٹھنڈی سانس بھر کر گندھتے ہوئے آٹے کی لگن ڈھانک دی۔ "جانے چھمی بٹیا کیسی ہوں گی اور شکیل میاں۔"

"چپ بھی رہو کریمن بوا، شکیل کا ذکر نہ کیا کرو۔ بڑی چچی سنتی تو رونے بیٹھ جاتی ہیں" عالیہ نے انھیں ٹوک دیا۔

دھوبن کپڑوں کا گٹھا اٹھائے اندر آ گئی تو بڑی چچی میلے کپڑے سبھوں سے جمع کرنے لگیں اور دھوبن پھولی ہوئی سانسوں کو ٹھیک کرتی تخت کے پاس زمین پر پھسکڑا مار کر بیٹھ گئی۔ "اے چھوٹی دلہن کلجگ ہے۔" دھوبن نے ہاتھ پھیلا دیا۔ "اک ذرا سی تمباکو تو کھلا دیجیے منھ سوکھ رہا ہے۔"

"کیسا کلجگ؟" اماں نے پان کا ٹکڑا اس کے ہاتھ پر رکھ دیا۔

"وہ جو حاجی صاحب کا لڑکا جنگ پر مارا گیا تھا نا، اس کی بیوی کسی کے ساتھ بھاگ گئی، تین سال ہوئے حاجی صاحب کے لونڈے کو مرے۔ ایسی شرافت سے گھر پر بیٹھی رہا کرتی کہ سب واہ واہ کرکے رہ جاتے، کسی کو کیا پتہ تھا کہ یہ گن بھرے ہیں۔"

"غضب خدا کا، کہیں مل جائے تو کھود کر دفنا دیں حرام زادی کو۔" اماں نے برا سا منھ بنایا۔ "چودھویں صدی ہے۔ ایک زمانہ تھا کہ بارہ تیرہ سال کی لڑکی بیوہ ہو کر یوں ہی بیٹھی رہتی۔ قبر کے سوا کسی دوسرے کا منھ نہ دیکھتی، پر اب تو سب ختم ہوتا جا رہا ہے۔ سچ کہا ہے بزرگوں نے کہ چودھویں صدی میں گائے گو کھائے گی۔ اور کنواری بر مانگے گی۔"

کریمن بوا بھی چپ نہ رہ سکیں۔

"کریمن بوا یہ گائے ماتا کی بات نہ کیا کرو۔ کسی ہندو نے سن لیا تو لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔ اب وہ بھائی چارہ نہیں رہا۔ جسے دیکھو پاکستان کے خلاف ہو رہے ہیں۔۔

کہنے سُننے سے نہیں جو کہتیں ہم تو چپکے سے کپڑوں کا گٹھا اُٹھا کر چلے آتے ہیں ۔ اللہ بچائے اس قوم سے ، کال پور میں کیسے کیسے فساد نہیں ہوتے رہتے " دھومن نے اپنا سر تھام لیا

اپنے کئی عزیز کانپور کے فساد میں مر چکے ہیں "

یہ سب ٹھیک ہی ، زمانے بدل گئے " کریمن بوا جیسے اتنی بہت سی باتوں سے

اوب کر جھوٹے برتن سمیٹنے لگیں ۔

(۴۰)

ساری رات بارش ہوتی رہی ۔ چھاجوں پانی برس گیا ۔ صبح بھی آسمان صاف

نہ تھا ۔ ابر کے سیاہ ٹکڑے اِدھر اُدھر ڈولتے پھر رہے تھے ۔

عالیہ نے کھڑکی کے بھڑے ہوئے پٹ کھول دیئے ۔ سامنے ہائی اسکول کے احاطہ کے درخت رات کی بارش سے نہا کر خوب نکھر گئے تھے اور کسی درخت میں چھپی ہوئی کوئل برابر چیخے جا رہی تھی ۔ گلی میں پڑی ہوئی آموں کی گٹھلیوں اور چھلکوں کی بو ہوا میں رچی ہوئی تھی اور اخبار والا بڑی تیزی سے گلی سے چیختا گزر رہا تھا ۔ "خوف ناک بم ۔ جاپان کی کمر ٹوٹ گئی ۔ ہیروشیما تباہ ہوگیا ۔ اتحادیوں کی فتح قریب ہی ۔ آگیا ۔ آگیا آج کا اخبار ، ہیروشیما ۔۔"

اچھا تو ایک پورا شہر ایک بم سے ختم ہوگیا ۔ پھر اس کے بعد کیا ہوگا ؟ جمیل واپس آجائیں گے ، انگریزوں کے حق میں پروپیگنڈا کرنے کے سارے ہتھیار ختم کرکے خالی خولی واپس آجائیں گے ۔ مگر وہ بے چارے جو جنگ کی آگ میں جل مرے اب اُن کے انتظار کرنے والوں پر کیا گزرے گی ؟ " اس سوال کا جواب نہ پاکر عالیہ بستر سے اُٹھ پڑی ۔ آج اسے اخبار پڑھنے کی سچی طلب ستا رہی تھی ۔

بڑے چچا بیٹھک میں جا چکے تھے اور اخبار کے صفحے اُٹھا لیے۔ ہیروشیما میں آگ کے شعلوں کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔

اخبار رکھ کر وہ گم سم سی بیٹھ گئی۔ اللہ یہ حکومتیں شہروں کو کیوں نشانہ بناتی ہیں ان کا کیا قصور، انھیں کیوں موت کے گھاٹ اتارا جاتا ہے۔ مگر یہ تو ہمیشہ سے ہوتا آیا ہے۔ تاریخ کبھی مسکرائے گی بھی کہ نہیں، ایک ایک لفظ خون کی بوند معلوم ہوتا ہے۔ ہیروشیما کی آگ میں کیا کچھ نہ جل گیا ہوگا۔ پتہ نہیں لوگ اس وقت کس عالم میں ہوں گے۔ وہ اس وقت زندگی کے کتنے بہت سے کام انجام دینے کی سوچ رہے ہوں گے وہ کیا کچھ کرنے کو گھروں سے نکلے ہوں گے اور کیا پتہ اس وقت بھی بچے جاپانی گڑیاں خریدنے کسی دوکان پر کھڑے ہوں گے اور اس وقت اچانک خوفناک بم کا دھماکہ ہوا ہوگا اور "جلدی جلدی چائے پی لو عالیہ بیٹا، اسکول کا تانگہ آنے والا ہوگا۔ یوں ہی بیٹھی کیا سوچ رہی ہو" کریمن بُوا نے ٹوکا تو وہ جلدی سے چائے پینے بیٹھ گئی۔ ابھی تو اُسے تیار بھی ہونا تھا۔

"جاپان بھی ہار نے والا ہے۔ ان کا ایک پورا کا پورا شہر تو تباہ ہو گیا ہے" غسل خانہ سے نکل کر اماں نے بڑے اطمینان اور سکون سے خبر سُنائی۔

"جی ہاں" چائے پی کر وہ صحن میں آ گئی۔ بڑی چچی نل کے پاس بیٹھی ہاتھ منھ دھو رہی تھیں۔ کیاری میں سارے پودے بارش کے بوجھ سے دب کر زمین پر جھک گئے تھے۔

کپڑے تبدیل کر کے وہ بال ٹھیک کر رہی تھی کہ باہر سے آواز آئی "استانی جی تانگہ آ گیا ہے"

برقع ہاتھ پر ڈالے جب وہ زینے طے کرنے لگی تو آگے آگے نجمہ پھپھی بہت

اونچی ایڑیوں کی سینڈل پر جھومتی اتر رہی تھیں۔ "استانی جی تانگہ آگیا ہے" نجمہ پھوپھی نے گردن گھما کر کہا۔ ان کے ہونٹوں پر کیسی مضحکہ خیز مسکراہٹ تھی۔

"ہم دونوں ایک ہی کام کرتے ہیں، مگر آپ لکچرار کہی جاتی ہیں اور میں استانی"

"یہ فرق اگر نہ بھی مٹے تو کیا قیامت آجائے گی" عالیہ نے تلخی سے جواب دیا۔

"واہ یہ فرق مٹ بھی کیسے سکتا ہے۔ کیا تم نے انگلش میں ایم اے کیا ہے؟ گدھے اور گھوڑے میں کوئی فرق تو ضرور ہوتا ہے" نجمہ پھوپھی چائے پینے کے لیے بیٹھ گئیں۔

"استانی جی، کالج سے تانگہ آگیا ہے" باہر سے صمدا آئی۔

"تانگے والوں کے لیے ہم اور آپ دونوں برابر ہیں" عالیہ زور سے ہنسی۔

"آپ انھیں سمجھاتی کیوں نہیں؟" وہ تانگہ پر جا بیٹھی۔ نجمہ پھوپھی کیا کہہ رہی تھیں اس نے سنا نہیں۔

اسکول سے واپسی پر عالیہ نے دیکھا کہ کوئی صحن میں کھڑا ہے۔ وہ پشت سے پہچان نہ سکی مگر جیسے ہی دو قدم آگے بڑھی تو چھمی پلٹ کر اس سے لپٹ گئی۔

"ارے چھمی تم آگئیں؟" عالیہ اسے زور زور سے بھینچ رہی تھی۔ "اندر وہ برآمدے میں کون لیٹا ہے کھٹولے پر؟"

"پتہ نہیں بجیا" چھمی جھینپ گئی۔

"چھمی کی بٹیا ہے اور کون ہے" بڑی چچی نے نہال ہو کر بتایا۔

"اوہ!" عالیہ برقع اتارنا بھی بھول گئی اور بچی کی طرف بھاگی۔ "ہے کتنی پیاری ہے! بالکل چھمی کی طرح" عالیہ کا جی چاہا کہ اسے سوتے سے اٹھا کر خوب پیار کرے۔ اسے یاد آرہا تھا کہ اگر تہمینہ آپا زندہ ہوتیں تو شاید ان کے بھی ایک دو بچے ہوتے۔

بچی کے منھ پر سے دوپٹہ سرک گیا تھا اور گال پر مکھی آ بیٹھی تھی۔ عالیہ نے مکھی اُڑا کر منھ ڈھانک دیا۔ "کل میں اسکول سے آتے ہوئے اس کے لیے ایک چھوٹی سی مچھر دانی خرید لاؤں گی، پھر مکھیوں سے محفوظ ہو جائے گی۔" عالیہ نے کہا۔

"لو بھلا مکھیوں سے کون بچاتا ہے یہ تو سب ہمارے یہاں ہوتی تیلیاں ہیں بجیا۔" چھمی ہنس دی "اگر ہمارے گاؤں میں کوئی ایسی بات کرے تو سب مذاق اڑانے لگتے ہیں۔ بھلا مکھیوں سے بھی کوئی بچ سکتا ہے۔" وہ پھر ہنسنے لگی، کیسا دکھ تھا۔ اس کی ہنسی میں۔ وہ دبلی ہو گئی تھی۔ اس لیے کچھ زیادہ ہی خوب صورت لگ رہی تھی۔ جمیل بھیا نے چھمی کو کھو کر غلطی ضرور کی ہے عالیہ کو خیال آیا اور وہ برقع اتارنے لگی۔ "بڑے چچا سے ملیں؟" اس نے برقع لٹکاتے ہوئے پوچھا۔

"کہاں؟ وہ گھر اب آتے ہی نہیں۔" چھمی نے کہا اور پھر بڑی چچی کی طرف مڑ گئی۔ "اچھے تو ہیں بڑے چچا" اس نے بڑی بوڑھیوں کی طرح پوچھا۔

"بس اچھے ہی ہیں کمزور ہو گئے ہیں۔" بڑی چچی نے جواب دیا۔

"تم کھانا کھا چکی ہو چھمی؟" عالیہ نے پوچھا۔

"نہیں میں تو آپ کا انتظار کر رہی تھی بجیا۔"

چھمی کی بٹیا جاگ کر رونے لگی تو بڑی چچی نے اُسے اُٹھا کر کندھے سے لگا لیا۔ اور بڑی محبت سے تھپکنے لگیں۔ اماں تخت پر بیٹھی چھالیہ کاٹ رہی تھیں۔ انھوں نے ایک بار بھی چھمی یا بچی کی طرف نہیں دیکھا۔ جب سے عالیہ اسکول میں ملازم ہوئی تھی، اماں کی نظروں میں سب کے لیے کتنی حقارت پیدا ہو گئی تھی پھر چھمی سے تو وہ ہمیشہ کا بیر رکھتیں۔

"تمھارے میاں نہیں آئے چھمی؟"

"نہیں بجیا وہ کیسے آتے، ان کی بھینس بیمار تھی۔ انھوں نے مجھے زمانے بھر کے

میں بٹھا دیا تھا اور ایک بوڑھی عورت سے کہہ دیا تھا کہ مجھے دیکھے رہو۔" وہ ہنسنے لگی۔

"تم بہت یاد آتی تھیں چھمی" عالیہ نے اسے پیار سے دیکھا۔ چھمی اپنے ماحول سے مطمئن نہیں یہ سوچ سوچ کر اسے دکھ ہو رہا تھا۔

"میں بھی آپ ہی سے تو ملنے آئی ہوں۔"

"ہوں! تمھارے جانے کے بعد گھر میں سکون ہو گیا تھا۔ اس لیے تمھیں یاد کر کے تڑپتی تھی۔" اماں نے جلی کٹی نظروں سے چھمی کو دیکھا۔

"اچھا!" چھمی ان کے طنز کو سن کر ہنس پڑی۔

"ارے کیا چھمی اتنی ٹھنڈی پڑ چکی ہو۔" عالیہ کو یقین نہ آ رہا تھا کیسی سنجیدہ اور بھاری بھرکم سی لگ رہی تھی۔

"چھمی اس کو تو مجھے دے دے، اسے پال کر زندگی کے دن کٹ جائیں گے" بڑی چچی چھمی کی بٹیا کو چوم چوم کر کہہ رہی تھیں۔

"لے لیجیے بڑی چچی" چھمی نے کہنے کو تو کہہ دیا مگر اس کا چہرہ فق ہو گیا۔ شاید چھمی کو اپنی پرورش کا زمانہ یاد آ گیا تھا۔ اسے بھی تو یہاں پلنے کے لیے چھوڑ دیا گیا تھا۔

چھمی کی بٹیا بھوک سے بلبلا کر زور زور سے رونے لگی تو چھمی نے کھانا چھوڑ دیا اور ہاتھ دھو کر اسے گود میں لے لیا۔ بڑی چچی کمرے میں چلی گئیں۔ اماں پہلے ہی چھمی کے کمرے میں پاندان لے کر جا چکی تھیں شاید انھیں خطرہ ہو گا کہ چھمی اپنے کمرے میں ڈیرہ نہ ڈال دے۔

کتنی سخت گرمی پڑ رہی تھی۔ ہوا بند ہونے کی وجہ سے سخت حبس ہو رہا تھا دوپہریں کاٹے نہ کٹتیں۔

"کریمن بوا صاحبزادی کے لیے یہ کھلونے لے جاؤ۔ اور چھمی بٹیا کو میری دعا کہو

اور اگر سب لوگ کھانا کھا چکے ہوں تو ——" اسرار میاں بیٹھک کے کواڑوں کی آڑ میں کھڑے کہہ رہے تھے اور کریمن بوا سب کے آگے سے بچا ہوا سالن ایک پیالے میں جمع کر کے اسرار میاں کے ہیضہ مار کرنے کا سامان کر رہی تھیں۔

عالیہ نے ہاتھ بڑھا کر کھلونے لے لیے تو کریمن بوا جیسے بلبلا اٹھیں۔ "خدا کی شان ہے زمانے زمانے کی بات ہے۔ اسرار میاں چھمی بٹیا کی اولاد کے لیے کھلونے لائیں۔" کریمن بوا نے سالن کا پیالہ اور روٹیاں ان کے آگے بڑھتے ہوئے ہاتھ پر پٹخ دیا۔

"یہ کھلونے اسرار میاں نے دیے ہیں اور دعا کی ہے۔" عالیہ نے بچوں کی طرح جھنجھنا بجایا۔

"اس طرح تو اونچے ہونے سے رہے اسرار میاں، یوں ہی کھیل کھلاتے پھرتے ہو۔ اپنی اوقات بھی نہیں پہچانتے۔" کریمن بوا برآمدے میں اب تک بڑبڑا رہی تھیں۔

"کریمن بوا، اللہ کرے تم گونگی ہو جاؤ یا اسرار میاں مرجائیں۔" عالیہ نے دل ہی دل میں دعا کی اور پھر بڑی چچی کے پاس بیٹھ گئیں وہ کپڑوں کی گٹھریوں اور تلے دانیوں کو کھولے ریشمی ٹکڑے چھمی کی بٹیا کے لیے کرتہ ٹوپی سی رہی تھیں۔ اور برابر باتیں کیے جا رہی تھیں۔ "چھمی تمھاری ساس کیسی ہے؟ لڑتی تو نہیں؟ تمھارا میاں تو تم سے بہت محبت کرتا ہوگا۔"

چھمی ہنس ہنس کر ہر بات کا جواب ہاں میں دے رہی تھی مگر عالیہ دیکھ رہی تھی کہ چھمی سب سے نظریں بچا رہی ہے۔ "مجھے یہ اتنی پیاری کیوں ہے بجیا؟" تمام باتوں سے بچنے کے لیے چھمی نے دوسری بات شروع کر دی۔

"تمھاری بیٹی جو ہے۔"

"جب سے یہ سامنے آئی ہے ساری دنیا ہیچ ہو گئی ہے۔" چھمی نے ٹھنڈی سانس بھری اور اپنی بٹیا کو سینے سے لگا کر لیٹ گئی۔ "اس کے باپ اور دادی کو اس سے کوئی محبت

نہیں انھیں بیٹا چاہیے تھا۔"

ذرا ہی دیر میں چھمی سو گئی اور سوتے میں لمبی لمبی آہیں بھرنے لگی مگر عالیہ بڑی چچی کے ساتھ ساری دوپہر کرتہ ٹوپی سلاتی رہی۔

شام کو سب لوگ بیٹھے چائے پی رہے تھے کہ بڑے چچا آ گئے۔ چھمی نے ان کی طرف دیکھا اور منہ پھیر لیا۔

"بڑے چچا کھڑے ہیں، میں تو پہچانی نہیں،" وہ بڑے طنز سے ہنسی "تسلیم بڑے چچا، سنائیے آپ کی کانگریس پارٹی کا کیا حال ہے، ماشاءاللہ گاندھی میاں کی عمر تو لمبی ہوتی جا رہی ہے۔"

ارے یہ تو وہی چھمی ہے۔ بس اتنا فرق ہے نا کہ اب گود میں بچہ ہے۔ عالیہ اسے حیران نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

"تمھارے گھر میں سب خیریت ہے" بڑے چچا بولکھلا کر بیٹھک کی طرف پلٹے "کریمن بوا چائے باہر بھجوا دو۔"

"عمر لمبی نہ ہو تو کیا ہو بے چارہ ہندوستان پر حکومت کے خواب دیکھ رہا ہے، لو بھلا لنگوٹی باندھ کر حکومت کرے گا۔" اماں خوش ہو کر چھمی سے بولیں۔ ایسے معاملات میں تو وہ سو فی صدی چھمی کے ساتھ رہتیں۔ پھر ادھر تو وہ انگریز حکومت پر دل و جان سے قربان ہونے کو تیار تھیں۔ وجہ یہ تھی کہ جب سے عالیہ ملازم ہوئی تھی اماں کی انگریز ممانی بھی بہت محبت سے خط لکھنے لگی تھیں۔ ان خطوں میں وہ بڑے مزے مزے کی باتیں لکھتی تھیں، مثلاً یہی کہ اگر ہندوستان میں ہر عورت اپنے پاؤں پر کھڑی ہو جائے تو پھر یہ ملک بھی انگلینڈ کی برابری کر سکے گا۔

"چھمی اب تو تم اتنی بڑی ہو گئی ہو، اماں بن چکی ہو، کچھ تو لحاظ کریں بڑے چچا کا" عالیہ نے ضبط کرنے کے باوجود چھمی کو ٹوک دیا۔

"بس جانے کیا ہو گیا تھا۔ میں اُن سے معافی مانگ لوں گی بجیا"۔ وہ سر جھکا کر کچھ سوچنے لگی۔ "میں صبح چلی جاؤں گی۔" وہ کریمن بوا کی طرف مڑ گئی۔ "کریمن بوا ہمارے میاں سے کہہ دینا کہ صبح تانگہ لے آئیں اور مجھے گاڑی پر بٹھال دیں۔

"ارے تو کیا تم اتنی جلدی چلی جاؤ گی۔ چھمّی، ناراض ہو؟" عالیہ اماں کے پاس سے سرک کر کھڑی ہو گئی۔

بھئی حد کرتی ہیں آپ بھی، میں آپ سے ناراض ہو سکتی ہوں۔" آپ کو کیا پتہ کتنی مشکل سے ایک دن کی اجازت ملی ہے، آپ نہیں جانتیں عالیہ بجیا، آپ نہیں جانتیں"۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آرہے تھے۔ "جی تو یہی چاہتا ہے کہ یہیں پڑی رہوں پر اب یہ میری بٹیا جو ہے، ارے اس کا کوئی اچھا سا نام تو بتا دیں۔ بجیا، اس کی دادی نے تو اس کا نام تمیزن رکھا ہے"۔ چھمّی نام بتا کر ہنستے ہنستے لوٹ گئی۔

تم رک کیوں نہیں سکتیں۔ آٹھ دس دن تک مت جاؤ۔ گھر کتنا اچھا لگ رہا ہے لگتا ہے بہار آ گئی۔ عالیہ جذباتی ہو رہی تھی۔ "تمھارے جانے کے بعد کیا سناٹا چھایا ہے چھمّی، جی ادبھ جاتا ہے اس خاموشی سے"۔

"پھر آؤں گی بجیا"۔ چھمّی بڑے انہماک سے اپنی بٹیا کو تھپک رہی تھی۔

گلی میں تانگہ رکا اور نجمہ پھوپھی ساری کا پلّو سنوارتی گھر میں داخل ہوئیں "ارے واہ چھمّی آئی ہے۔ کیا حال چال ہے۔ اور یہ تمھاری بیٹی ہے؟ بڑی پیاری ہے، باپ پر بالکل نہیں پڑی"۔ انھوں نے پیار سے بٹیا کے گال تھپ تھپائے۔ "اسے خوب پڑھانا چھمّی ورنہ یہ بھی جاہل رہ جائے گی سب کی طرح"۔

"آپ کے پاس بھیج دوں گی، پڑھا دیجیے گا نا؟" چھمّی کا چھوڑا تیر نجمہ پھوپھی کی پیشانی کو بگاڑ گیا۔ "اچھا پھر باتیں ہوں گی۔ ابھی تو میں تھکی ہوئی ہوں"۔ وہ

کھٹ کھٹ کرتی زینے چڑھنے لگیں۔

"دیکھو شکیل کی بھی خبر لگی؟" چھمی نے سرگوشی کی۔

"نہیں چھمی" عالیہ نے چپکے سے جواب دیا۔

"اور ہمارے ابا نے بھی کبھی خط لکھا؟"

عالیہ نے کوئی جواب نہ دیا بچے کے گال سہلاتی رہی۔ چھمی جواب نہ پا کر ادھر اُدھر دیکھنے لگی۔

سب کو پوچھا مگر جمیل بھیا کو بھول گئی۔ اس محبت میں کوئی حقیقت نہیں ہوتی عالیہ کو عجیب سا محسوس ہو رہا تھا۔

رات آسمان اس قدر صاف تھا کہ چاندنی دودھ میں نہائی ہوئی معلوم ہو رہی تھی۔ آنگن میں برابر سے بچھے ہوئے پلنگوں میں آج ایک ننھے سے کھٹولے کا اضافہ ہو گیا تھا اور اس کھٹولے پر پڑی ہوئی ایک ننھی سی بچی کی غوں غاں رات کو اور بھی خوبصورت بنا رہی تھی۔ کل کی موسلا دھار بارش نے آج کی رات کو ہلکا سا سرد کر دیا تھا آج تو عالیہ نے بھی چھت پر سونے کے بجائے آنگن میں چھمی کے برابر اپنا بستر لگا لیا تھا۔ عجیب سی رونق کا احساس ہو رہا تھا۔ سب ایک جگہ جمع تھے، باتیں ہو رہی تھیں اور چھمی کی ٹیا برابر غوں غاں کیے جا رہی تھی۔ بس ایک نجمہ پھوپی تھیں، جو آج بھی الگ تھلگ جاہلوں کی صحبت سے دُور چھت پر اکیلی پڑی تھیں۔ ہاں بڑے چچا نے بھی چھمی سے ملنے کے بعد پھر گھر میں قدم نہ رکھا تھا۔ بیٹھک میں کھانا کھایا۔ اور باہر چبوترے پر بستر لگوا کر لیٹے جانے کس سے باتیں کر رہے تھے۔

"کریمن بوا ایک اچھی سی کہانی سنا دو" چھمی نے فرمائش کی۔ وہ اس وقت ذرا سی بچی لگ رہی تھی۔

اب تو یاد بھی نہیں آتی اچھی بیا" کرمین بوا سوچنے لگیں۔

"کوئی سی کہانی سناڈالو کرمین بوا کہ ہائے کتنے مزے کی ہوتی ہیں یہ کہانیاں بھی۔"

عالیہ بھی ضد کرنے لگی۔ کتابوں کی دنیا سے وہ تھک چکی تھی۔ اس وقت تو اس کا دل چاہ رہا تھا کہ کوئی معصوم سی کہانی سُنے۔

"ارے وہی کہانی سُنادو کرمین بوا کہ ایک بادشاہ تھا اس کی سات بیٹیاں تھیں ایک دن بادشاہ نے اپنی ساتوں بیٹیوں کو بلا کر پوچھا کہ تم کس کی قسمت کا کھاتی ہو تو سب نے کہا: آپ کی قسمت کا مگر سب سے چھوٹی بیٹی نے کہا کہ میں اپنی قسمت کا کھاتی ہوں اور بادشاہ نے اُسے جنگل میں ڈلوا دیا کہ اپنی قسمت کا کھاؤ اور پھر وہ لڑکی جنگل میں تنہا بیٹھی رو رہی تھی تو ایک دیو آیا۔ اور اس نے لڑکی کے لیے محل بنایا۔ اور بس۔ وہی سی کہانی سُنا دو کرمین بوا، اتنی بہت سی تو میں نے یاد دلا دی۔ چھمی اُٹھ کر بیٹھ گئی۔

"اچھا تو پھر سُنو۔ ایک تھا بادشاہ، ہمارا تمہارا خدا بادشاہ، ہاں تو اس بادشاہ کی سات لڑکیاں تھیں، ایک دن بادشاہ نے ان ساتوں کو بلا کر پوچھا۔"

کرمین بوا کہانی کہے جا رہی تھیں مگر عالیہ نے ایک لفظ نہ سُنا وہ تو سوچنے لگی تھی کہ آخر چھمی کو یہی کہانی کیوں یاد آئی۔ کیا چھمی کو اپنی قسمت سے کوئی امید تھی وہ تو کتنی مدت سے اپنی بدنصیبی کے جنگل میں بھٹک رہی تھی مگر اب تک کوئی دیو نہیں آیا۔ ارے چھمی یہ جو لوگ کچھ نہ پا سکنے کی حسرت میں معصوم کہانیوں سے جی بہلاتے ہیں۔ ان میں کوئی حقیقت نہیں ہوتی۔

کہانی ختم بھی نہ ہونے پائی تھی کہ چھمی کو نیند کی پری لے اُڑی۔ جانے کس محل میں لے گئی ہوگی۔ جانے کس شہزادے کے پہلو میں بٹھا آئی ہوگی۔

صُبح چھمی چلی گئی مگر سکول جاتے ہوئے عالیہ کو محسوس ہو رہا تھا کہ وہ رنجیدہ ہے آج

وہ اسکول میں جی سے نہ پڑھا سکے گی۔ کچھ دن کے لیے چھمی رک ہی جاتی تو کیا تھا۔

(۱۲)

ناگاساکی پر بم گرتے ہی جنگ ختم ہو گئی تھی۔ جاپان نے ہتھیار ڈال دیے تھے۔ دلی سے جمیل بھیا کا خط آیا تھا کہ اب وہ جلد آ جائیں گے، اب ان کا کام ختم ہو گیا اور آج جب چار بجے وہ سو کر اٹھی تو اس نے دیکھا کہ سچ مچ جمیل بھیا آ گئے ہیں۔ اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کرے۔ فوراً نیچے چلی جائے یا یہیں بیٹھی رہے مگر اس طرح تو شاید بڑی چچی برا محسوس کریں۔ اور آخر وہ یہاں بیٹھی ہی کیوں رہے۔

وہ نیچے اتر گئی۔ اماں اور بڑی چچی جمیل کو گھیرے بیٹھی تھیں۔ کریمن بوا چائے کا سامان تیار کر رہی تھیں۔ کتنی مدت بعد بڑی چچی کا چہرا کھلا ہوا نظر آ رہا تھا۔

"مگر آپ لوگ ڈرتی کیوں تھیں؟ میں تو دلی میں بیٹھ کر اپنے قلم سے جنگ لڑ رہا تھا۔ میرا محاذ پر کیا کام تھا۔" جمیل بھیا ہنس ہنس کر کہہ رہے تھے۔

"بس میں ڈرتی تھی کہ کبھی تم بھی لڑنے کو نہ بھیج دیے جاؤ۔ جب کوئی بات ہوتی تو میں تڑپ جاتی، تم خط بھی تو نہ لکھتے جلدی۔ جب دیر ہوتی میں سمجھتی کہ تم بھی جنگ پر لڑنے بھیج دیا جائے گا۔" بڑی چچی اپنی بے وقوفی پر شرما رہی تھیں۔ "پھر تم کبھی آئے بھی تو نہیں۔ ارے دلی اتنی دور تو نہ تھی۔"

"اور ہمارے ابا نے بھی کبھی نہ سمجھایا کہ میرا کام کیا ہے؟ میں کہاں کہاں جا سکتا ہوں۔ خواہ مخواہ آپ پریشان رہیں۔" جمیل بھیا بڑی چچی کے لپٹے جاتے۔ "... اتنے دن نہ آیا تو کیا ہوا اب تو آ گیا۔" انھوں نے مڑ کر دیکھا۔ "اوہ عالیہ بی بی۔۔۔"

"اچھی تو ہو، اب تو تم بڑی آدمی ہو گئی ہو، ہم تو یوں ہی جاہل رہ گئے

مجھے پڑھاؤ گی کہ نہیں ؟"

"یہ چھوٹے بڑے کا کیا ذکر لے بیٹھے آپ، سنائیے کیسے رہے ؟" عالیہ نے ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرنے کی کوشش کی مگر جلد ہی نظریں جھک گئیں۔ فوجی وردی میں جمیل بھیا خاصے خوبصورت لگ رہے تھے۔

"جچتی ہے نا۔ یہ وردی، لگتا ہوں نا بے وقوف، یا پھر خوبصورت ؟" جمیل بھیا شاید اسے چھیڑ رہے تھے۔

"جنگ کی کوئی بھی نشانی خوبصورت ہو سکتی ہے ؟" اس نے بڑی سنجیدگی سے جواب دیا

"ارے بھئی اماں جلدی کیجئے میں اپنی وردی اتاروں تاکہ کچھ تو خوبصورت لگوں میرے بکس کہاں ہیں، آپ کپڑے نکال دیجئے۔" جمیل بھیا زور سے ہنسے۔ "میں گھر آکر کتنا خوش ہوں، کتنی مدت بعد سب کو دیکھا ہے۔" انھوں نے بڑی گہری نظروں سے عالیہ کی طرف دیکھا۔ "دور رہ کر انسان کتنا صابر ہو جاتا ہے" وہ ایک دم سنجیدہ ہو گئے

"بھئی تم نے بھی مجھے یاد کیا تھا ؟" انھوں نے عالیہ سے پوچھا۔

"ہاں! جب بڑی چچی آپ کو یاد کر کے روتی تھیں تو آپ یاد آجاتے تھے۔" اس نے بڑی بے تعلقی سے جواب دیا۔

"تم بالکل نہیں بدلیں، بالکل ویسی ہی ہو۔"

"آپ اپنے سلسلے میں کچھ بتائیے۔" اس نے بات ٹالی۔

"اپنے لیے کیا بتاؤں، ملازمت سے چھٹی لے کر آیا ہوں، اب پھر وہی بے کاری ہوگی۔ اور ہم" انھوں نے بجھی سی آواز میں کہا۔

"تو آپ نوکری چھوڑ کیوں آئے، جمیل بھیا، اب ظاہر ہے کہ بے کاری کا منہ دیکھنا ہی پڑے گا۔ پہلے آپ نے اس ملازمت کو کیسے قبول کر لیا تھا، بڑے چچا کی ضد میں ؟"

"اوہ! میں ان سے کیا ضد کروں گا ۔" ان کے لہجے میں سختی تھی ۔ "میرا مقصد پورا ہو گیا ۔ تو ملازمت بھی گئی ۔ کوئی ضروری تھا کہ جو کیا ہی اس پہ قائم رہوں ؟ اب تو آزاد ہونے کے بعد ہی ملازمت کروں گا ۔"

"دیکھو جمیل میاں ، یہ باتیں مت کرو ، اب تو تم نے دیکھ ہی لیا کہ انگریز سے لڑ کر بڑے بڑے ملکوں کو بھی کیا بھگتنا پڑا ، اس لیے آزادی کے خواب دیکھنا چھوڑ دو ۔" اماں نے جمیل بھیا کو سمجھایا ۔

"ٹھیک کہتی ہیں آپ ، میں تو اب سب کچھ چھوڑ چکا ہوں ۔" وہ بڑی سعادت مندی سے سر جھکا کر بیٹھ گئے ۔

"تم شکیل سے ملے تھے ؟" بڑی چچی نے جمیل بھیا کو کپڑے دیتے ہوئے سوال کیا ۔

"ملا تھا اماں مگر اس نے تو منھ پھیر لیا ۔ وہ بڑا آدمی ہو گیا ہے ، وہ ہم لوگوں سے کوئی واسطہ نہیں رکھنا چاہتا ۔ آپ اس نالائق کو مت پوچھا کیجیے ۔"

"جاؤ نہا لو ۔" بڑی چچی نے ٹھنڈی سانس بھری ۔

"اماں ہمارے ابا کہاں ہیں ۔ ؟"

"صبح سے کہیں گئے ہیں ، بس آتے ہی ہوں گے ۔" بڑی چچی نے بتایا ۔

"کبھی بڑے چچا بھی آپ کو یاد آتے تھے ؟" عالیہ نے ہنس کر پوچھا ۔

"ابا کبھی مجھے یاد کرتے تھے ؟" وہ بھی ہنسے اور پھر اس کی طرف مڑ گئے ۔ "اور تم تو مجھے یاد کرتی ہی نہیں تھیں ۔" انھوں نے بڑی امید سے اس کی طرف دیکھا ۔

"ان یادوں وغیرہ سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں ۔" اس نے نظریں جھکا لیں ۔

وہ چپ ہو گئے ۔ چند منٹ تک کچھ سوچتے رہے اور پھر کریمن بوا کے لپٹ کر کھڑے ہو گئے ۔ "میری کریمن بوا ! تم تو مجھے یاد کرتی تھیں نا ، تم آج میرے لیے کیا پکا رہی ہو ؟"

"میں نے تو تڑپ کر دن گزارے ہیں، آپ کی نمک خوار ہوں جمیل میاں۔"

کریمن بوا نے ان کی بلائیں لے لیں ۔ "اچھے جمیل میاں کے لیے پلاؤ پکا رہی ہوں"

جمیل بھیا نے کنکھیوں سے اس کی طرف دیکھا تو اس نے منھ پھیر لیا۔ کاش آج اس کی چھٹی نہ ہوتی، آج بھی وہ اسکول میں لڑکیوں سے سر کھپا رہی ہوتی۔

"ارے ہاں وہ ہماری نجمہ پھوپھی کہاں ہیں اماں؟" جمیل بھیا نے پوچھا۔

"وہ تو اب اس گھر سے سخت بیزار رہتی ہیں۔ اس لیے اپنی ایک سہیلی کے گھر جا بیٹھتی ہیں، وہ بھی ان کے کالج میں پڑھاتی ہیں۔" بڑی چچی نے جواب دیا۔

"پھر تو یقیناً وہ انگلش میں ایم۔ اے ہوں گی، دو لیے دوستی کیسے ہو سکتی ہے۔" جمیل بھیا نے ایک قہقہہ لگایا اور کپڑے اٹھا کر غسل خانے چلے گئے۔

بڑی چچی سخت مصروف تھیں، جمیل بھیا کے بکس ٹھیک ہو رہے تھے، اماں تخت پر دسترخوان بچھا رہی تھیں اور عالیہ سر نیوڑھائے سوچے جا رہی تھی کہ اب اس گھر میں کیسے گزارہ ہو گا، یہ ہر وقت کی ذہنی اذیت کیسے برداشت ہوگی، جمیل بھیا تو جنگ ختم کر آئے مگر اس کے ذہن میں جو جنگ ہوگی اسے کون سا ایٹم بم ختم کرے گا۔

"جمیل آ گیا ہے تو گھر کیا اچھا لگ رہا ہے۔" بڑی چچی نے اماں کی طرف دیکھا۔

"گھر کا مالک جو ہے۔ اسی کے دم سے رونق ہے۔ بڑی بھابی" اماں نے نہال ہو کر کہا۔

"اس کے مالک بڑے چچا ہیں۔" عالیہ خواہ مخواہ بیچ میں کود پڑی۔

اماں نے اسے کوئی جواب نہ دیا۔ جب سے وہ کمانے کھانے کے لائق ہوئی تھی اماں اس کی ساری باتوں کو پی جایا کرتیں۔

عالیہ بڑے چچا کے لیے ہڑکنے لگی۔ جانے صبح سے کہاں مارے مارے پھر رہے ہیں، نہ وقت پر کھانا ہے نہ آرام، کتنے کمزور ہو گئے ہیں۔ اور اب تو جمیل بھیا آ گئے ہیں، ہر وقت

کا مقابلہ ہوگا۔ اتنے دن سے بچھڑے ہوئے یہ باپ بیٹے جانے کس طرح ملیں گے۔

جمیل بھیا نہا کر نکل آئے اماں انھیں اپنی جاگیر کی طرح سمیٹ کر پہلو میں بٹھانے کی کوشش کر رہی تھیں۔ عالیہ کی جان سلگ اٹھی وہ اپنی اماں کی اس محبت کی ذمے دار نہیں وہ انھیں جمیل بھیا جیسا شاندار داماد دینے سے قطعی مجبور ہے۔

جمیل بھیا اماں کے پاس دو چار منٹ بیٹھنے کے بعد اٹھ کر ٹہلنے لگے اور جب ٹہلتے ہوئے اس کے پاس سے گزرے تو اس نے اطلاع دی "چھمی آئی تھی۔"

"اچھا!" جمیل بھیا منھ لٹکائے آگے بڑھ گئے اور جب دوسرے چکر میں اس کے پاس سے گزرے تو وہ پھر بھی چپ نہ رہ سکی۔ "اس نے آپ کو ذرا بھی یاد نہ کیا، اس کی ایک پیاری سی بیٹی ہوگئی ہے۔"

"بہت خوب! مگر میں نے کب کہا ہے کہ تم ساری کتھا سنا ڈالو۔ میں نے کب چاہا تھا کہ وہ مجھے یاد کرے۔" وہ بھن بھناتے ہوئے اماں کے پاس جا بیٹھے۔

جمیل بھیا کو ستا کر اسے بڑی خوشی محسوس ہو رہی تھی۔ اس نے ان کے ٹہلنے اور اسے چھو کر نکل جانے کا سارا مزا کرکرا کر دیا تھا۔

"کریمن بوا جلدی سے کھانا تیار کر لو، کھا پی کر باہر نکلوں، کچھ دیکھوں بھالوں،" جمیل بھیا سخت بدمزہ ہو رہے تھے۔

"لو اتنی جلدی پڑ گئی باہر نکلنے کی؟" بڑی چچی نے پیار بھرے غصے سے ان کی طرف دیکھا۔

"کاروبار جو دیکھنا ہوا بڑی چچی۔" عالیہ نے طنز کیا مگر سب اس قدر مونڈیں تھے اگر سمجھے ہی نہیں اور ہنسنا شروع کر دیا۔ جمیل بھیا اسے اندھیری آنکھوں پیچھے تک رہے تھے۔

کھانے کے بعد جمیل بھیا باہر چلے گئے اور عالیہ اوپر کمرے میں آگئی۔ رات بدل گئی تھی۔ اب دن میں بس معمولی سی گرمی ہوتی پھر بھی اُسے محسوس ہو رہا تھا کہ آج بڑے زور سے گرمی پڑ رہی ہے۔ اس کا سارا جسم جل رہا ہے وہ آرام نہیں کر سکتی۔ ساری دوپہر بستر پر کروٹیں بدل کر گزر گئی وہ اپنے متعلق سوچ سوچ کر تھک چکی تھی۔

شام کو جب عالیہ چائے پینے کے لیے نیچے اُتری تو جمیل بھیا اپنی لوہے کی کرسی پر بیٹھے شاید چائے کا انتظار کر رہے تھے۔ "عالیہ بی بی" انھوں نے دھیرے سے پکارا۔

"جی!" وہ آگے بڑھتے بڑھتے رُک گئی۔

"یہاں آکر عجیب سا احساس ہو رہا ہے۔ دوری بھی کتنی اچھی چیز ہوتی ہے۔ فاصلے بہت کچھ مٹا دیتے ہیں۔" انھوں نے لمبی سانس لی۔

"ٹھیک ہے جمیل بھیا" اس نے نظریں جھکائے ہوئے جواب دیا اور جلدی سے برآمدے میں چلی گئی۔

اماں ابھی تک کمرے سے نہ نکلی تھیں اور بڑی چچی جانے کن انتظامات میں جٹی ہوئی تھیں۔

کریمن بُوا نے چائے دم کر کے تپائی پر رکھ دی تو اسی وقت بڑے چچا شیروانی کا بٹن کھولتے ہوئے گھر میں داخل ہوئے

عالیہ پیالیوں میں چائے بنا رہی تھی کہ سب چھوڑ چھاڑ گھبرا کر کھڑی ہو گئی۔

"السلام علیکم" جمیل بھیا نے کھڑے ہو کر کہا۔

بڑے چچا نے جیسے چونک کر جمیل بھیا کو دیکھا ۔۔۔ "وعلیکم السلام" وہ منھ ہاتھ دھونے کے لیے چوکی پر بیٹھ گئے ۔۔۔ "سب خیریت ہے؟"

"سب خیریت ہے" جمیل بھیا چائے کی پیالی اٹھا کر پھر کرسی پر جا بیٹھے۔

عالیہ چائے بنانے لگی ۔ یا اللہ یہ باپ بیٹے ہیں ! اتنی مدت کے بعد یہ اسی طرح مل سکتے تھے ؟ نظریئے کی کھائی دونوں کے بیچ میں حائل ہو ، دونوں میں سے کوئی بھی اسے پھلانگنے پر تیار نہیں تھا ۔ یہی شکر ہو کر کبھی کی طرح جمیل بھیا نے منھ نہیں پھیرا ۔ منھ ہاتھ دھو کر بڑے چچا بیٹھک میں چلے گئے اور کریمن بوا نے وہیں چائے پہنچا دی ۔

" زندگی کٹھن بھی ہو اور آسان بھی ۔ یہ سب کچھ انسان کے اپنے ہاتھ میں ہو کر وہ اپنی زندگی سے کس طرح کا سلوک کرنا چاہتا ہو ، کیا خیال ہو تمھارا ؟ " انھوں نے چائے کی پیالی اس کی طرف بڑھا دی ۔ " ایک پیالی اور بنا دو عالیہ بی بی ۔ " جمیل بھیا اس وقت بہت رنجیدہ نظر آ رہے تھے ۔

" میرا بھی یہی خیال ہو ، اگر آپ چاہیں تو اپنی زندگی کو آسان بنا سکتے ہیں ۔ " عالیہ نے ان کی طرف پیالی بڑھائی ۔ " لیجیے پیجیے " وہ پیالی پکڑ کر اٹھ کھڑی ہوئی ۔ اور اس نازک بحث سے بچنے کے لیے اپنے کمرے کی طرف بھاگی ۔ اماں اور بڑی چچی چائے پینے کے لیے آ رہی تھیں ۔

شام کو اداسی ہر طرف رچی ہوئی تھی ۔ سورج بیل کے گھنے درختوں کے پیچھے ڈوب رہا تھا ۔ وہ دھیرے دھیرے چھت پر ٹہلنے لگی ۔ قریب کے گھروں سے دھواں اٹھ اٹھ کر فضا کو بوجھل بنا رہا تھا ۔ مصالحوں اور بگھار کی خوشبو ہوا میں بسی ہوئی تھی ۔

ٹہلتے ٹہلتے تھک کر وہ کمرے کی چوکھٹ پر بیٹھ گئی ۔ سورج ڈوبتے ہی ہوا سرد ہو گئی تھی ۔ اسے اپنے ہاتھوں میں ٹھنڈک دوڑتی محسوس ہو رہی تھی ۔ جمیل بھیا نے آتے ہی اسے پریشان کر دیا تھا ۔ بس کا سکون درہم برہم ہو رہا تھا ۔ وہ سوچنے لگی کہ جمیل بھیا جب دنیا میں کسی رشتے ناتے کو نہیں مانتے تو محبت پر کس طرح ایمان لے آئے ۔ یہ حضرت انسان بھی خوب چیز ہوتے ہیں ۔ نہیں مانتے تو خدا کو بھی حرف غلط سمجھنے لگتے ہیں

اور جب ماننے پر آتے ہیں تو پیروں کی چوکھٹ پر اُس کا جلوہ دیکھنے لگتے ہیں۔ جمیل بھیا تم نے مجھے کس مصیبت میں مبتلا کر دیا ہے وہ سوچتے سوچتے بڑبڑانے لگی۔

زینوں پر کھٹر پٹر ہوئی اور نجمہ پھوپھی آکر آرام کرسی پر دراز ہو گئیں۔ سارا دن اپنی دوست کو بھگت کر آئی تھیں اس لیے خاصی تھکی تھکی نظر آ رہی تھیں۔ عالیہ اُن کے کمرے کی چوکھٹ سے اُٹھنے ہی والی تھی کہ نجمہ پھوپھی نے کھنکار کر اُسے آواز دی۔ "ادھر آؤ عالیہ" اس نے چونک کر نجمہ پھوپھی کی طرف دیکھا، مارے حیرت کے اس سے اُٹھا نہ جا رہا تھا۔ نجمہ پھوپھی پہلی بار اُسے اپنے پاس بلا رہی تھیں۔

"کہیے" وہ مسہری پر ان کے پاس ٹک گئی۔

"اس گھر میں کوئی اس لائق نہیں جس سے بات کی جائے۔ گھر میں کم سہی پھر بھی تم نے تھوڑا بہت پڑھا تو ہے۔ شاید تم مجھے مشورہ دے سکو" نجمہ پھوپھی نے غور سے اس کی طرف دیکھا۔

"مشورہ دینے کی صلاحیت تو نہیں پھر بھی شاید کچھ سوچ سکوں" اس نے اپنے غصّہ کو قابو میں رکھتے ہوئے جواب دیا۔

"شادی کے متعلق تمھارا کیا خیال ہے؟ میرے ساتھ کی ساری لکچرار شادیاں کر رہی ہیں۔"

"آپ بھی کر لیجیے، میرا خیال ہے کہ شادی اچھی چیز ہے، خصوصیت سے آپ کے لیے" اس نے بے حد سنجیدگی سے کہا۔

"یعنی صرف میرے لیے؟ کتنی فضول بات کر رہی ہو، کیا تم شادی نہیں کرو گی؟" وہ ذرا سا بپھر گئیں۔ "خیر تمھاری شادی تو گھر ہی میں جمیل میاں کے ساتھ ہو سکتی ہے، تم کو اس سے زیادہ کیا مل سکتا ہے، مگر میرے لیے میرے برابر کا آدمی ملنا مشکل ہے

عالیہ کا جی چاہا کہ نجمہ پھوپی کے مُنھ پر تھوک دے مگر وہ ضبط سے کام لے گئی۔ تھوکنے کے بعد تو بات ختم ہو جاتی تھی، اور اس کا جی چاہ رہا تھا کہ بات ختم نہ ہو، وہ خوب کھری کھری سُنا لے۔ ”دیکھئے نجمہ پھوپھی جہاں تک جمیل بھیا کی قابلیت کا سوال ہے تو اس گھر میں کوئی ان کی برابری نہیں کر سکتا، ویسے میں ان کو بہ حیثیت انسان پسند نہیں کرتی۔ وہ میرے چچازاد بھائی ہیں اور بس۔ اس لیے آپ دوسرے رشتے مت سوچیے، اپنی بات کیجئے۔ میرا خیال ہے کہ اس اتنے بڑے ملک میں کسی نہ کسی شخص نے انگریزی میں ایم اے ضرور کیا ہوگا۔ اور وہ آپ کا شوہر بن سکے گا۔ اس کام کے لیے آپ ڈھنڈورا پٹوا دیجئے۔“

”یہ سب کیا بکواس کر رہی ہو، اس گھر میں سب جاہل ہیں، میں کس سے بات کروں خدایا۔“

”آپ اتنی عظیم ڈگری رکھنے کے بعد بھی کسی سے مشورہ کی ضرورت سمجھتی ہیں؟“

عالیہ اٹھ کر چھت پر آگئی۔ نجمہ پھوپھی کیا کہتی رہ گئیں، اُس نے کچھ بھی نہ سُنا۔

”سب لوگ کھانا کھالو“ نیچے صحن میں کھڑی ہوئی کریمن بوا پکار رہی تھیں۔

(۴۲)

اس گھر میں وقت کٹھن ہے۔ زندگی پل صراط پر گزرنے کا نام ہے۔ کتنا اچھا ہوتا کہ وہ یہاں سے بھاگ سکتی۔ جمیل بھیا سے پیچھا چھڑا سکتی مگر یہ سب کچھ کتنا ناممکن تھا۔ اگر وہ چلی جائے تو بڑے چچا کیا کہیں گے؟ یہی نا کہ جب اپنے پیروں پر کھڑی ہو گئی۔ تو آنکھیں پھیر لیں۔ اب تو گھر کی حالت بھی پہلی جیسی ہو گئی تھی۔ جمیل بھیا ملازمت سے سُبکدوش ہو کر جو بیٹھے تو آج تک بیکار تھے۔ بڑی چچی نے جو تھوڑی بہت رقم جمع کی تھی۔ وہ اس بے کاری کے زمانے میں ختم ہو چکی تھی۔ عالیہ نے کتنا چاہا کہ بڑی چچی کو

کو اماں سے چھپا کر کچھ دے دیا کرے۔ لیکن انھوں نے بڑے پیار سے انکار کر دیا۔ شاید وہ اماں سے ڈرتی تھیں۔ جب سے وہ ملازم ہوئی تھی اماں کے طعنے کتنے خوفناک ہو گئے تھے۔۔ انھیں اس گھر سے کتنی سخت نفرت ہو گئی تھی۔

ایک ایک دن بیمار کی رات کی طرح گزر رہا تھا۔ دسمبر کی سخت سردی اپنے عروج پر تھی۔ صبح نو دس بجے تک کہر کی وجہ سے اندھیرا چھایا تھا۔ برآمدے کے پردے آندھیوں، بارشوں اور دھوپ میں پہلے ہی اپنی ساری حقیقت کھو چکے اب کی سردی میں تو ہوا ان پردوں سے یوں گزر جاتی جیسے میدان میں فراٹے بھر رہی ہو۔ کریمن بوا کی کمزور ہڈیاں سردیوں میں کڑکڑاتی رہتیں اور وہ چولھے کی کوکھ میں گھس کر بیتے ہوئے زمانے کی یاد میں ملکنے لگتیں ۔۔۔ "ہائے وہ بھی کیسا زمانہ تھا جب دالانوں کے پردے ہر دوسرے سال بدل دیئے جاتے، پر اب وہ زمانہ کہاں آئے گا"

عالیہ نے کریمن بوا کو اپنا ایک پرانا سوئٹر دے دیا تھا۔ جسے اتنی سردی میں پہننے کے بجائے انھوں نے سینت کر رکھا تھا۔ "اگر یہ سوئٹر دے دیا تھا تو اگلی سردی میں کیا پہنوں گی" کریمن بوا نے اپنے حساب بڑی سمجھداری کا ثبوت دیا تھا۔

بڑے چچا کئی دن سے دہلی گئے ہوئے تھے اور اسرار میاں کو دو تین دن سے بخار آ رہا تھا پتہ نہیں بیٹھک میں وہ کس عالم میں پڑے رہتے ہوں گے ان کا علاج معالجہ کون کرتا۔ جمیل بھیا کو جلسے جلوسوں سے فرصت نہ ملتی۔ گھر آنے تو ظالم عشق میں آگ لگی ہوتی۔ اب وہ اس آگ کو بجھاتے یا اسرار میاں کے پھنکتے ہوئے جسم پر دواؤں کے چھینٹے مارنے بیٹھ جاتے۔

عالیہ کا خود سے بُرا حال تھا۔ وہ ہر وقت سوچتی رہتی کہ پتہ نہیں ان کی طبیعت

کیسی ہوگی جو نہ جانے مانگنے کی صدا آتی ہو اور نہ کھانا لینے کے لیے ہاتھ پھیلاتے ہیں کرتین تو آپ سے بڑبڑا اٹھتیں اور بیٹھک میں جاکر کھانا پانی ڈال آتیں ۔ وہ خیریت پوچھتیں تو سخت ناگواری سے بتاتیں کہ سب ٹھیک ہو ۔ بخار ہو گیا ہو کوئی بڑی بیماری تو نہیں ۔"

خدا نہ کرے ان کو بڑی بیماری ہو۔ عالیہ اپنا کیجہ مسوس کر رہ جاتی ۔ کیا جی چاہتا کہ اسرار میاں کے سرہانے جا بیٹھے، ان کا سر دبائے انھیں اپنے ہاتھوں دوا پلائے مگر اماں کی کڑی نظروں کے سامنے وہ ان کی اتنی پرانی روایتوں کو کیسے توڑ دیتی ۔ اس خاندان میں کوئی بھی تو ان حرامی اولادوں کے سامنے نہ آتا تھا ۔ نجمہ پھوپھی بے پردہ تھیں ۔ اس کے باوجود کبھی اسرار میاں کا سامنا نہ کیا ۔ کالج سے تانگہ آتا تو وہ خود ہی ہٹ جاتے ، راہ چلتے دیکھتے تو منہ پھیر لیتے ۔ ایک بار عالیہ بیٹھک میں گئی تو اسرار میاں بیٹھے تھے وہ ان کی صورت بھی نہ دیکھ سکی تھی کہ اٹھ بھاگے "پردہ ہو بٹیا" اور وہ ہکا بکا کھڑی رہ گئی ، اب ایسی حالت میں وہ اسرار میاں کی تیمار داری کرتی بھی تو کیسے ۔ کیا پتہ وہ اس حالت میں بھی "پردہ ہو بٹیا" کہتے باہر بھاگ جائیں ۔ اور پھر اس کی اس حرکت سے اماں کے دل پہ کیا گزرے گی ۔ وہ کیا کہیں گی اب تو اماں نے صرف اس کی خاطر اس مکان اور جمیل بھیا دونوں سے ہاتھ اٹھا لیا تھا ۔ انھوں نے بڑی بے بسی کے ساتھ اس کے آگے سر جھکا دیا تھا ۔ سب کچھ کھو کر صرف اس کو اپنا سہارا بنا لیا تھا ۔ پھر کیا فائدہ تو اگر ان کا جی دکھایا جائے ۔ ان کی اتنی پرانی روایات کو ٹھوکریں ماری جائیں ۔ آخر کہیں، تو اسے بھی جھکنا ہوگا ۔

رات جب جمیل بھیا کھانا کھانے گھر آئے تو گھرے ہوئے بادل اتنے زور سے گرج رہے تھے کہ جی دہلا جاتا ۔

"شاید اولے پڑیں گے۔" کریمن بوا بار بار کہہ رہی تھیں۔

"کس نے سر منڈوایا ہے کہ کریمن بوا جو اولے ضرور پڑیں گے" جمیل بھیا نے ہنس کر پوچھا۔

آج بہت دنوں بعد ہنسنے بولنے کے موڈ میں نظر آ رہے تھے، ورنہ ادھر تو کچھ دنوں سے اس قدر خاموش رہنے لگے تھے جیسے منھ میں زبان نہ رہی ہو۔

"ارے میاں سر کسے منڈانا ہے، میرا ہی جی چونڈا منڈ رہا ہے، ذرا اسرار میاں کی خبر لو، بخار آ رہا ہے۔ کھانا پانی سب بُھّس میں پہنچا مانٹا ہے۔" کریمن بوا سخت بیزار نظر آنے لگیں۔

"کیا ہو گیا اسرار میاں کو؟" جمیل بھیا چونک پڑے۔

"کہا جو تھا کہ بخار آ رہا ہے، بڑے میاں دلی گئے ہیں ورنہ آپ ہی دوا دارو کر لیتے۔ ہمیں کیا پڑی تھی۔ جو بیچ میں دخل دیتے اب اگر اسرار میاں کو کچھ ہو گیا تو وہ آ کر ناراض ہوں گے۔"

"میں انھیں دیکھ لوں گا کریمن بوا، ویسے کتنی سخت نفرت ہے مجھے اس آدمی سے!"

"اس لیے کہ وہ بے چارے ہم میں سے ایک نہیں ہیں؟" عالیہ نے تڑپ کر سوال کیا۔

"یہ بات نہیں عالیہ بی بی، مجھے ان سے صرف اس لیے نفرت ہے کہ وہ ابا کے ساتھ رہ کر انھیں جیسے بن گئے ہیں اور مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ ابا کے ساتھ بیٹھ کر مجھ پر نکتہ چینی بھی کرتے ہیں۔ بس اب تو اتنی کسر رہ گئی کہ یہ دونوں حضرات اپنے ماتھے پر تلک لگا لیں۔" وہ سخت نفرت انگیز ہنسی ہنسے۔" ویسے تم اطمینان

رکھو عالیہ بی بی کہ مجھے ان کے ناجائز ہونے کا ذرا بھی خیال نہیں۔"

"خیر وہ تمہارے اپنے چچا کے برابر تھی مگر اب اس بے کار بحث سے کیا فائدہ" اماں نے بیزار ہو کر کہا۔

"خدا نہ کرے، نصیب دشمناں، بھلا اسرار میاں چچا کے برابر ہو سکتے ہیں" کریمن بوا اماں کے طنز کو نہ سمجھتے ہوئے ایک دم بھپھر گئیں۔ "زمانے زمانے کی بات ہے کہ آج محلوں کی رانیاں اُسے چچا بنا ڈالیں" کریمن بوا زندگی میں پہلی بار گستاخی کر رہی تھیں۔

اماں، بڑی چچی، اور جمیل بھیا ان کی سمجھ پر ہنسنے لگے تو کریمن بوا بوکھلا کر روٹی بیلنے لگیں۔ جمیل بھیا اٹھ کر بیٹھک میں چلے گئے۔

بادل بڑے زور سے گرجے اور اس طرح بجلی تڑپی کہ سب نے سہم کر کانوں میں انگلیاں دے لیں۔ "جل تو جلال تو، آئی بلا کو ٹال تو" کریمن بوا زور زور سے پڑھنے لگیں۔

"کہیں بجلی گری ہے" بڑی چچی نے سہمی ہوئی آواز سے کہا۔

تیز ہوا سے پردے اُڑے جا رہے تھے۔ جمیل بھیا بیٹھک سے نکل کر ابھی بیچ آنگن میں تھے کہ ایک بار پھر زور سے بجلی تڑپی اور عالیہ جیسے چیخ پڑی "جلدی سے اندر بھاگ آئیے جمیل بھیا"

جمیل بھیا ہنستے ہوئے اندر آ گئے۔ "اولے پڑ رہے ہیں۔ مگر تم کیوں ڈر گئیں عالیہ بی بی۔۔؟"

"ڈری تو نہیں تھی۔ میں تو آپ کو بتا رہی تھی کہ بجلی کڑک رہی ہے" عالیہ نے بے وقوفوں کی طرح بات بنائی۔ وہ شرمندہ ہو رہی تھی کہ بھلا یہ چیخی ہی کیوں

تھی۔ کون سی بجلی گر رہی تھی جمیل بھیا پر۔

"یہ حضرت انسان کو سمجھنا بھی کتنا مشکل کام ہے۔ جب یہ روشن ہوتے ہیں تو اپنے آپ کو تاریک ثابت کر دیتے ہیں اور جب تاریک، تو روشن نظر آنے کی سعی فرماتے ہیں۔" جمیل بھیا نے عالیہ کو پیار سے دیکھتے ہوئے کہا کہ اس وقت وہ کتنے خوش اور مطمئن نظر آ رہے تھے۔

"ٹھیک ہے جمیل بھیا۔ جس طرح انسان کو سمجھنا مشکل ہے اسی طرح یہ بھی سمجھنا مشکل ہوتا ہے کہ بعض وقت انسان کا فعل اس کے خیال سے جدا کیوں ہوتا ہے یوں ہی بے مقصد جانے کیا کچھ کر گزرتا ہے" اس نے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر جواب دیا۔ اسے پتہ تھا کہ اس کی پیچ کے ساتھ جمیل بھیا اس کے دل کے بھاگے ہوئے چور کو پکڑ کر سامنے لانا چاہتے ہیں۔

"یہ بھی ٹھیک ہے عالیہ بی بی،" وہ ایک دم بجھ سے گئے اور پھر ذرا دیر کے لیے خاموشی چھا گئی۔

بڑے چچا اس وقت کہاں ہوں گے اور کیا کر رہے ہوں گے۔ دھیان بھٹکانے کے لیے عالیہ نے سوچنا شروع کر دیا۔

کھانا ختم ہوا تو سب لوگ سردی کے ڈر سے اپنے اپنے بستروں کی طرف لپکے مگر عالیہ اپنی جگہ سے نہ اٹھی۔ اسے اوپر اپنے کمرے میں جانا تھا اور بارش تھمنے کے باوجود اب تک بجلی چمک رہی تھی۔ اس حالت میں وہ آنگن کیسے پار کرتی۔ گرج چمک اسے ہمیشہ سے ڈراتی رہی تھی۔

پردہ سرکا کر اس نے باہر دیکھا اندھیرے اور سیاہ بادلوں کے سوا کچھ بھی نظر نہ آیا، وہ ہمت کر کے آنگن میں آ گئی۔

"چلو میں تم کو اوپر تک چھوڑ آؤں"۔ جمیل بھیا اس کے پیچھے نکل آئے "تم بجلی سے ڈرتی ہو؟" زینے طے کرتے ہوئے انھوں نے پوچھا۔

وہ خاموشی سے زینے طے کرتی رہی۔ شاعروں سے بجلی کی بات چھیڑنا سخت خطرناک بات ہوتی ہے۔ نجمہ پھوپی لحاف میں منھ چھپائے سو رہی تھیں وہ دبے قدموں اپنے کمرے میں آ گئی۔ جمیل بھیا دروازے کے بیچ میں کھڑے رہے۔

"اچھا شب بخیر، آپ بھی جا کر سو رہئے" وہ دھیرے سے بولی۔

"میں تھوڑی دیر تمھارے پاس بیٹھ جاؤں؟ کیا پتہ پھر بجلی کڑکنے لگے اکیلے میں تم ضرور ڈر جاؤ گی" وہ آگے بڑھ آئے۔

"میں قطعی نہیں ڈرتی، آپ جا کر سو رہیئے" اس نے بے رخی سے کہا اور اپنے لحاف میں دبک گئی۔

جمیل بھیا نے کوئی جواب نہ دیا۔ اسی طرح کھڑے جانے کیا سوچتے رہے اور وہ لحاف کے اندر کانپتی رہی۔ جانے اب کیا کہیں گے۔

پندرہ بیس منٹ بیس صدیوں کی طرح گزر گئے پھر وہ ایک دم چلے گئے انھوں نے کچھ نہ کہا۔

صدیوں کو گزار کر جب اس نے اطمینان کی سانس لی تو پھر خیال آیا کہ اگر جمیل بھیا تھوڑی دیر یہاں اور بیٹھ لیتے، کچھ باتیں کر لیتے تو کیا مضائقہ تھا۔ اس سرپھرے خیال سے بچنے کے لیے عالیہ کو اسرار میاں یاد آ گئے۔ جانے اب ان کی کیا حالت ہوگی۔ کیا بیماری میں انھیں کسی کی ضرورت نہ محسوس ہوتی ہوگی۔ بخار سے سر کلبلا رہا ہوگا۔ اور ان کا کیا جی چاہتا ہوگا کہ کوئی ان کے پاس بیٹھے۔ کوئی انھیں پوچھے، اس وقت تو کوئی محبت سے دیکھے۔ پر ان کا کوئی نہیں وہ تو تن تنہا آسمان سے ٹپک پڑے۔ آج

اس بیماری اور تنہائی میں وہ جانے اپنے لیے کیا سوچ رہی ہوں گے۔ اسرار میاں کے لیے آہیں بھرتے بھرتے وہ گہری نیند سو گئی۔

صبح آسمان بالکل صاف تھا۔ سورج بڑا چمکیلا ہو رہا تھا اور جب وہ اسکول جانے کی تیاری کر رہی تھی تو تین دن بعد اسے اسرار میاں کی کانپتی ہوئی آواز سنائی دی گئی "ڈرمین لوا اگر سب لوگ چائے پی چکے ہوں تو مجھے بھی دے دو۔ کمزوری لگ رہی ہے۔"

(۴۳)

صبح ہوتی ہے، شام ہوتی ہے اور بہار نے دنوں کو پھلانگ کر پھول کھلا دیے ہیں۔ ایک ڈیڑھ مہینے پہلے کرمین بوانے کیاری کا کوڑا صاف کرکے اسے گھٹنے تک گوڑا تھا اور پھر بیج بو کر اطمینان کی سانس لی تھی۔ اب کھلے ہوئے وہ پھول دیکھ کر وہ خوش ہو رہی تھی۔ مگر بڑی چچی سے تو یہ بھی نہ ہوا تھا وہ پھول توڑ کر اس گردے بھرے گلدان کو صاف کرکے سجا دیں۔ ان کے دل میں بہار کا گزر نہ تھا۔ پھولوں میں کوئی دلکشی نہ تھی۔ شکیل ان کے دل میں سدا خزاں کا بیج بو گیا تھا۔ جمیل بھیا اس بیج کو سینچ رہے تھے۔ اور بڑے چچا ۔۔ بڑے چچا کے لیے اسے کوئی بری بات نہ سوچنا چاہیے وہ اپنے آپ کو ملامت کرتی۔

گھر کی حالت بہت خراب ہو گئی تھی۔ جمیل بھیا نے ملازمت کی کوشش ہی نہ کی۔ سارا دن مسلم لیگ کے دفتر میں کام کرتے اور تھوڑا سا معاوضہ مل جاتا۔ بڑی چچی کو یہ معاوضہ دے کر وہ سارے مہینے کے لیے بے خبر ہو جاتے اور سارا مہینہ بڑی چچی سے انتقام لے کر گزر رہا تھا۔ ان دنوں بڑے چچا کے پیروں میں سنیچر ہو گیا تھا۔ آج یہاں، کل وہاں۔ انگلستان کی لیبر وزارت نے ہندوستان کو آزاد کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا اور اماں نے یہ خبر اس طرح سنی تھی

جیسے چنڈو خانے سے اڑائی گئی ہو۔

ادھر آزادی کے فیصلے کے ساتھ باپ بیٹے ایک دوسرے کی صورت سے بیزار ہو گئے تھے پاکستان بنے گا۔ پاکستان نہیں بنے گا۔ اور اس کشمکش کے عالم میں اُسے چھچھی بُری طرح یاد آنے لگتی۔ اگر آج کو وہ بھی اس گھر میں بیٹھی رہتی تو کیا ہوتا۔ آزادی ملنے سے پہلے ہی سب اپنا اپنا سر پھوڑ کر خدا کو پیارے ہو چکے تھے۔

آج پندرہ بیس دن بعد بڑے چچا گھر میں داخل ہوئے تھے اور برآمدے میں بچھے ہوئے پلنگ پر سکون سے لیٹے اپنا سر سہلا رہے تھے۔ اتنے دن بعد انھیں گھر میں لیٹے دیکھ کر عالیہ چائے کی پیالی لے کر ان کے پاس جا بیٹھی۔ بڑے چچا اٹھ کر چائے پینے لگے۔

"انگریز کہتے ہیں کہ اب ہندوستان آزاد ہو جائے گا۔" بڑی چچی بھی ہنستی ہوئی آگئیں۔

"ہاں، خیر آزاد کرنا ہی ہو گا۔ بس تھوڑے سے دن اور گڑبڑ کریں گے بے ایمان قوم ہے۔" بڑے چچا جوش میں آ گئے۔

"پھر جب آزادی مل جائے گی تو تم اپنی دو دکانوں پر بیٹھو گے؟" بڑی چچی نے پوچھا، ان کی آنکھوں سے اشتیاق ٹپک رہا تھا۔

"بیٹھوں گا کیوں نہیں، تم دیکھنا کہ اس کے بعد دوکانیں کیسی چلتی ہیں، اپنی حکومت سے تو دوکانوں کو چلانے کے لیے امداد بھی مل جائے گی۔"

"اچھا اپنی حکومت امداد بھی کردے گی؟ ہائے کتنا اچھا ہوگا۔" بڑی چچی کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔

"بڑے چچا آج آپ گھر میں لیٹے کتنے اچھے لگ رہے ہیں۔ جب آپ ہوتے ہیں تو مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے —" عالیہ کچھ نہ کہہ سکی۔ اس کی آواز بھرا رہی تھی

"اور میں تمھارا باپ نہیں تو پھر کیا ہوں پگلی۔" بڑے چچا نے اس کا سر اپنے سینے سے لگا لیا۔ "اور جب آزادی مل جائے گی۔ تو میں اپنی بیٹی کو دُلھن بناؤں گا اور بہت شان دار پڑھا لکھا دولھا لاؤں گا۔ ایں نا؟" انھوں نے بڑی چچی کی طرف دیکھا وہ دونوں ہنسنے لگے مگر عالیہ بڑے چچا کے سینے میں محبت کی گرمی محسوس کر کے دھیرے دھیرے رو رہی تھی وہ دل ہی دل میں دعا کر رہی تھی کہ اللہ اس ملک کو جلدی سے آزاد کر دے، بڑے چچا اپنے گھر واپس آجائیں اور پھر شام کو اسی گھر میں لیٹ کر بڑی چچی سے باتیں کریں۔ چھمی کی خیریت پوچھیں، ساجدہ آپا کو میکے آنے کے لیے خط لکھیں جمیل بھیا کے لیے دولھن تلاش کریں اور شکیل کو ڈھونڈ کر گھر لے آئیں۔

"اری پگلی رو رہی ہو۔" بڑے چچا نے اپنے کھدر کے کرتے کے پار آنسوؤں کی نمی محسوس کر لی تھی۔ "مت رو میری بیٹی۔"

"کریمن بوا بڑے بھیا سے کہو کہ حکیم صاحب اور ہردیال بابو آئے ہیں۔" اسرار میاں کی آواز آئی تو بڑے چچا ایک دم اُٹھ پڑے، وہ اُسے چُپ کرانا بھی بھول گئے، عالیہ نے اپنے ہی آپ آنسو پونچھ ڈالے کیا جی امنڈ رہا تھا۔ ابھی تو وہ رونا چاہتی تھی،

رات جب سب لوگ کھانا کھا رہے تھے تو جمیل بھیا بڑے جوش و خروش سے بولے جا رہے تھے۔ "مطالبۂ پاکستان ایک ایسی حقیقت ہے جیسے ہم آپ بیٹھے ہیں کانگریسی لاکھ روڑے اٹکائیں مگر کچھ نہیں کر سکتے دس کروڑ مسلمانوں کے اس مطالبہ کو کون روک سکتا ہے۔"

"تو کیا سارے مسلمان پاکستان جا کر رہیں گے۔؟" بڑی چچی نے پوچھا۔

"واہ اس کی کیا ضرورت پڑے گی۔ جو جہاں ہے وہاں رہے گا۔"

"مگر ہندو یہاں رہنے کیوں دیں گے، وہ نہیں کہیں گے کہ اپنے ملک جاؤ۔"

ان کے ہندو جو پاکستان میں ہوں گے ہم ان سے کب کہیں گے کہ جاؤ۔"

جمیل بھیا کی دلیل بڑی چچی کی سمجھ میں آ گئی تو انھوں نے اطمینان کی سانس لی۔

"ہاں جمیل یہ جانے وانے کی بات بُری ہے، میں بھی یہ گھر نہیں چھوڑ سکتی" کریمن بوا بھی آخر بول ہی پڑیں۔

"اور میں کب چھوڑ رہا ہوں اپنا گھر میں تو بس اسرار میاں کو بھیج دوں گا پاکستان۔" جمیل بھیا غرّے میں آ کر ہنسے اور کریمن بوا نے کھسیا کر برتن اُٹھانے شروع کر دیے۔

"پھر تم اپنی ایک دکان تو سنبھال ہی لینا، تمھارے ابّا اب تھک چلے ہیں اور پھر تم ان کا ادب بھی کرو گے نا رے؟"

"میں سب کچھ کروں گا اماں، جو کچھ آپ کہیں گی وہی ہوگا، بس پاکستان بن جانے دیجیے۔" جمیل بھیا باتیں کرتے ہوئے بار بار عالیہ کی طرف دیکھے جا رہے تھے اور وہ بے تعلق سی بیٹھی کھانا کھائے جا رہی تھی۔ جانے آج کل اتنی بھوک کیوں لگتی ہے۔

"حد ہے، ہر وقت یہی باتیں، کھانا پینا حرام ہو گیا ہے" اماں باتیں سُن سُن کر ایک دم جھلّا اٹھیں —— "بس اب تو عقل مند تمھارے ملک کے لوگ رہ گئے ہیں۔ انگریز تو بے چارے نرے بے وقوف ہیں کہ آزادی بانٹی اور چپکے سے اپنے ملک لوٹ گئے۔ ارے ابھی نو برسوں جھک مارو۔ جب بھی آزادی نہیں ملنی ہے"

"انھیں کون کافر بے وقوف سمجھتا ہے مگر اس وقت انھیں بے وقوف بننے پر مجبور کر رہا ہے۔ اگر نہ گئے تو نکال دیے جائیں گے۔" جمیل بھیا جوش میں آ گئے۔

"خدا کی شان ہے کیا بڑھ بڑھ کر باتیں مار رہے ہو۔" اماں بگڑ کر اٹھ گئیں "کریمن بوا میرا کھانا کمرے میں پہنچا دو۔" اماں جانے لگیں تو جمیل بھیا نے پکڑ لیا

چلئے چھوڑ دیجیے چھوٹی چچی، اب اگر آزادی کا نام بھی لوں تو جو چور کی سزا وہ میری۔"
بات مذاق میں ٹل گئی مگر اماں کا موڈ ٹھیک نہ ہوا کھانا کھاتے ہی اپنے کمرے میں چلی گئیں۔

سردی کا زور گھٹتے ہی سب برآمدے میں سونے لگے تھے۔ بیچھے ہوئے پردے لپیٹ کر کب کے باندھ دیئے گئے تھے۔ اس وقت چاندنی برآمدے میں داخل ہو کر بستروں پر لوٹ رہی تھی۔

جمیل بھیا اتنی بہت سی باتیں کرنے کے بعد اب صحن میں ٹہل رہے تھے اور عالیہ بڑی چچی کے پاس بیٹھی چھالیہ کاٹ رہی تھی۔ اماں سب سے روٹھ کر اپنے کمرے میں نہ جانے کیا کر رہی تھیں۔

"بڑے بھیا کہاں ہیں؟" نجمہ پھوپھی اوپر سے آ کر بڑی چچی کے پاس ٹک گئیں۔ وہ کچھ فکر مند سی نظر آ رہی تھیں۔

"بیٹھک میں ہوں گے، بلوا لو۔" بڑی چچی نے جواب دیا۔

"دیکھو کریمن بوا اگر کوئی نہ ہو تو بلا لاؤ۔" نجمہ پھوپھی نے اکتا کر کہا۔

بڑے چچا کے آتے ہی جمیل بھیا اپنے کمرے میں چلے گئے، عالیہ کی سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ آج نجمہ پھوپھی کیا بات کرنا چاہتی ہیں۔ جو اس قدر فکر مند ہو رہی ہیں۔

"بڑے بھیا، وہ بات یہ ہے کہ میں نے اپنے لئے زندگی کا ساتھی تلاش کر لیا ہے بس آپ کو اطلاع دینا تھی۔" انھوں نے بڑی ڈھٹائی سے کہا۔

سب حیران ہو کر اُن کا منہ تکنے لگے۔ بڑے چچا آنکھیں جھکائے خاموش بیٹھے تھے۔ کیا انگلش میں ایم اے کر کے انسان اپنی تہذیب پر لات مار دیتا ہے۔ نجمہ پھوپھی یہی کچھ بڑی چچی کے ذریعے بھی کہلا سکتی تھیں۔ عالیہ نے نفرت سے بڑی چچی کی طرف دیکھا

"تو پھر ضرور کرو شادی، ہم سے کہو، فوراً انتظام کر دینگے۔ بڑی چچی کھیا کر ہنسنے لگیں۔

"کیا انتظام کریں گی آپ! کیا میں چھمّی ہوں جس کی شادی پر میراثنیں بلائی جائیں گی، ڈھول پیٹی جائے گی اور میرا جہیز سلے گا۔ میں خود جہیز ہوں نجمہ پھوپھی سخت مغرور ہو رہی تھیں۔

"تم جب کہو گی میں شریک ہو جاؤں گا۔" بڑے چچا اٹھ کر باہر چلے گئے "بس گرمیوں کی چھٹی میں نکاح ہو جائے گا۔ پھر ہم لوگ شملے چلے جائیں گے۔ نجمہ پھوپھی نے بڑی چچی کو اطلاع دی اور خود بھی اٹھ کھڑی ہوئیں۔

"وہ ہیں کون صاحب؟" بڑی چچی سے بغیر پوچھے نہ رہا گیا۔

"ہمارے کالج کے لیکچرار کے بھائی ہیں۔ انھوں نے بھی انگلش میں ایم اے کیا ہے۔ بہت زبردست تاجر ہیں۔ وہ کھٹ پٹ کرتی زینہ پر ہولیں۔

ذرا دیر تک سب چپ رہے کوئی کسی سے نہ بولا مگر جیسے ہی جمیل بھیا پھر سے آ کر ٹہلنے لگے تو بڑی چچی نے دھیرے سے اطلاع کر دی۔ "تمھاری نجمہ پھوپھی شادی کر رہی ہیں۔"

اچھا تو اس وقت وہ یہی کچھ بتانے آئی تھیں۔ ہے؟"

"ہوں!" بڑی چچی سر جھکا کر پان بنانے لگیں۔

"ڈھول نہ باجے، دھوم نہ دھام، یہ بھی کوئی شادی ہوئی، زمانے بدل گئے۔ سوا سوا مہینے تک لڑکی کو مانجھے بٹھاتے تھے باپ بھائیوں کا سایہ تک نہ دیکھتی تھی لڑکی۔ قاضی سے کہنا کہ نکاح بھی انگریزی میں پڑھائے" جمیل بھیا زور سے ہنسے۔ واقعی اس خاندان کی بدنصیبی تھی کہ لڑکیوں کو تعلیم

نہ دلائی گئی۔ اب ہماری نجمہ پھوپھی خاندان کی پہلی لڑکی تھیں جنھوں نے اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ ظاہر ہے کہ انھیں مارے غرور کے یہی کچھ بننا تھا دوسری تعلیم یافتہ خاتون ہماری عالیہ بی بی ہیں، کچھ فتور تو ان میں بھی ہے" انھوں نے داد طلب نظروں سے دیکھا۔

عالیہ سمجھ گئی کہ یہ کس فتور کی طرف اشارہ ہو رہا ہے۔ اس کی جان جل کر رہ گئی جی ہاں عورت اگر کٹھ پتلی سے آگے بڑھنے کی کوشش کرے گی تو ظاہر ہے کہ دماغی فتور سمجھا جائے گا، مرد عورت کو بے وقوف دیکھ کر ہی سچی خوشی محسوس کرتا ہے۔ نجمہ پھوپھی کا طریقہ غلط ہے۔ مگر انھیں یہ حق پہنچتا ہے کہ اپنی شادی کریں۔

"کون کر رہا ہے شادی؟" اماں نے کمرے سے نکل کر پوچھا۔

"نجمہ پھوپھی" عالیہ نے جواب دیا۔

"کہاں، انتظام کر دیا بڑے بھیا نے؟"

"بڑے بھیا نے نہیں، انھوں نے خود انتظام کیا ہے۔ بڑی چچی نے بتایا۔

"جاہی بھئی، ان کی بڑی بہن صاحبہ نے بھی تو خود اپنی مرضی سے شادی کی تھی اور آج ان کا شاندار بیٹا صفدر دنیا کی چھاتی پر دندناتا پھرتا ہے،" اماں کا غصہ پورے جوش پر تھا۔

سب چپ رہے، کسی نے کوئی جواب نہ دیا۔ عالیہ کو افسوس ہو رہا تھا کہ اماں اتنی تلخ باتیں کیوں کرتی ہیں۔

اماں اپنے کمرے میں چلی گئیں۔ جمیل بھیا اٹھ کر ٹہلنے اور گنگنانے لگے۔

بھلا نہ دل نہ تیرگی شام غم گئی
یہ جانتا تو آگ لگاتا نہ گھر کو میں

ٹھیک ہی۔ امی لیے میرے دماغ کے فتور کا رونا رویا جا رہا تھا، وہ ان کا دل نہ بہلا سکی وہ ان کی شاموں کو رنگین نہ بنا سکی۔ اس سے بڑھ کر اور کیا فتور ہو گا۔

میں ذرا باہر جا رہا ہوں اماں، ضروری کام سے، دیر سے آؤں گا، دروازہ بند کر لیجئے۔ جمیل بھیا نے کہا اور پھر دروازے کی طرف بڑھ گئے۔ ،، بہلا نہ دل نہ تیرگی شام غم گئی۔ دروازے سے نکلتے ہوئے بھی وہ دھیمے دھیمے گا رہے تھے۔

دُھوم دھام سے چھٹکی ہوئی چاندنی میں اسرار میاں کی اندھیری آواز اُبھری

کریمن بوا اگر سب لوگ کھانا کھا چکے ہوں تو ۔ ۔ ۔ "

عالیہ اپنے کمرے میں جانے کے لیے زینوں پر ہو لی۔

(۳۴)

سخت گرمی پڑ رہی تھی۔ نجمہ پھوپھی اپنے تاجر میاں کے ساتھ شملے جا چکی تھیں۔ ان کی شادی پر نہ تو ڈھول بجی، نہ میراثنوں نے گانے گائے کریمن بوا کا مارے دُکھ کے کلیجہ پھٹ گیا تھا۔ یہ زمانے کم بخت نے ان کو کیا کیا دکھایا۔ اماں کو ان کی شادی کے بعد سے سلمہ پھوپھی ہر وقت یاد آنے لگی تھیں اور صفدر بھائی کے لئے موت کی دعائیں دل سے نکلنے لگی تھیں ادھر ملک میں ہڑ بونگ مچی تھی کیبنٹ مشن ہلّہ مچا کر واپس ہو گیا تھا بڑے چچا کا بس چلتا تو جمیل بھیا کی صورت نہ دیکھتے وہ انھیں آستین میں پلا ہوا سانپ سمجھنے لگے تھے۔ اگر کسی وقت سامنا ہوتا تو ایک دوسرے پر چھینٹے کسنے لگتے۔ سارے مسلم لیگی انگریزوں کے پٹھو ہیں، بڑے چچا بھبر کر کہتے۔

"اس میں کیا شک ہے، مگر یہ حضرت نہرو اور ماؤنٹ بیٹن کی دوستی کب سے چلی ہے اور یہ ان کی لیڈی صاحبہ سے اتنا خلوص کیوں برتتے ہیں" جمیل بھیا کب چپ کتے۔

"تمھاری جہالت ایسے ہی سوال کرے گی"

"اے جمیل بھیا کیا آپ باہر بحث کرکے نہیں تھکتے۔" عالیہ بیچ میں کود پڑتی تو جمیل بھیا اپنے باپ کے مقابلے میں بے بس ہو کر رہ جاتے۔

"اُفوہ ایک ایک مسلمان جو فسادیں مارا جاتا ہے اس کا خون مسلم لیگیوں کی کی گردن پر ہے" بڑے چچا ٹھنڈی سانس بھرتے۔

جمیل بھیا عالیہ کی طرف دیکھ کر خاموش رہتے۔ جواب دینے کے لیے ان کا جی تو گھٹتا ہوگا مگر کچھ نہ کر پاتے۔

بڑی چچی کو شکیل کی پڑی تھی۔ "اللہ جانے کہاں ہوگا، ہندو مسلمان ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو رہے ہیں" ان دنوں تو بڑی چچی کو شکیل کی یاد شدت سے ستا رہی تھی۔

سرِ شام زور سے آندھی آئی کریمن بوا لالٹین جلا رہی تھیں۔ ساری کی ساری ایک ہی جھونکے سے بجھ گئیں۔ "ناس جائے ان آندھیوں کا" لالٹین کو سمیٹ کر وہ بڑبڑاتی ہوئی کمرے میں چلی گئیں۔

ہار موتیے چنبیلی کے" گلی میں ہار بیچنے والا صدا لگاتا بھاگا جا رہا تھا ذرا دیر میں آندھی رک گئی بارش کے دو چھینٹے پڑ کر زمین کی سوندھی سوندھی خوشبو اڑا گئے تھے اور محلوں کی چھتوں سے گراموفون ریکارڈ بجنے کی آواز آرہی تھی "بابل مورا نیہر چھوٹو ہی جائے"

سب لوگ کھانا کھالو، پتہ نہیں پھر بارش ہونے لگے، بادل گھرے کھڑے ہیں۔" کریمن بوا نے کہا اور پھر برتنوں سے آندھی کی دھول صاف کرنے لگی۔ "جانے یہ ناس پٹی آندھیاں کیوں آنے لگی ہیں۔" اُنھوں نے جیسے اپنے آپ سے پوچھا۔

"پہلے زمانے میں تو اتنی آندھیاں آتی نہ ہوں گی کریمن بُوا؟" جمیل بھیا نے ہنس کر پوچھا۔

"یہ آندھیاں تو ہمیشہ سے آتی تھیں جمیل میاں، جانے کیا کچھ اُڑا لے گئیں۔" کریمن بوا ان کا مذاق نہ سمجھتے ہوئے سنجیدگی سے بولیں۔ "ایک بار تو میرا جارجٹ کا نیا دوپٹہ اُڑا لے گئیں۔ دھو کر الگنی پر پھیلایا تھا۔" کریمن بوا اپنے لئے جیسے ڈوپٹے کو سر پر ٹھیک سے اوڑھنے لگیں۔ "ناس جائے ان آندھیوں کا" وہ پلیٹیں اُٹھا کر دالان میں چلی گئیں۔

"شاید رات بھی بارش ہو۔" جمیل بھیا نے عالیہ کی طرف دیکھا۔

"اللہ کرے ہو، گرمی سے نجات ملے۔"

کھانے کے بعد اماں اور بڑی چچی نے پاندان کھول لیا۔ کریمن بوا، اسرار میاں کے لیے پلیٹوں سے بچا ہوا سالن ایک پیالے میں جمع کر رہی تھیں۔ جمیل بھیا اب پھر اپنی کرسی پر جا بیٹھے تھے۔

"بڑے چچا کہاں ہیں، یہ ٹھنڈا کھانا اُن کی صحت کو اور بھی تباہ کرے گا۔ کم سے کم رات تو جلدی سے گھر آجایا کریں۔" عالیہ اوپر جاتے ہوئے سوچ رہی تھی۔

رات روئی ہوئی آنکھوں کی طرح بھیگی ہوئی تھی۔ چھت پر اپنا بستر لگانے کے بعد وہ دھیرے دھیرے ٹہلنے لگی۔ "وقت نہیں گزرتا اللہ" وہ بڑبڑا رہی تھی۔

گراموفون ریکارڈ برابر بجے جا رہے تھے۔

مفت ہوئے بدنام سنوریا تیرے لئے

"اُدھر تو بڑے مزے کی ہوا چل رہی ہے۔" جمیل بھیا بھی آکر اس کے ساتھ ٹہلنے لگے۔

وہ چپ رہی۔ رات، تنہائی، امڈے ہوئے بادل اور پھر جمیل بھیا۔ وہ ایک طوفان میں گھر کر رہ گئی اس کا جی بیٹھنے لگا۔ کیسی عجیب سی کیفیت ہو رہی تھی۔ بس یہی جی چاہتا کہ جمیل بھیا کو اٹھا کر نیچے گلی میں پھینک دے۔

وہ منڈیر سے جھک کر نیچے گلی میں جھانکنے لگی جہاں گنڈیریوں والا دو لوؤں والا چراغ تھال میں سجائے صدا لگاتا چلا جا رہا تھا۔

"عالیہ!" جمیل بھیا نے بھاری سی آواز سے پکارا۔

"کیا بات ہے؟" وہ پھر کر پلٹی۔

"بہت سی باتیں ہیں مگر تم تو میرے لئے بہری بن گئی ہو۔"

"اور کیا رہ گیا ہے کہنے کو، آپ سب کچھ تو کہہ چکے ہیں اور میں سن چکی ہوں، آپ تھکتے کیوں نہیں کہہ کہہ کر!"

جمیل بھیا اس کے پاس کھڑے ہو گئے اور اندھیرے میں جھک کر اسے دیکھنے لگے۔ وہ اتنے قریب تھے کہ اسے ان کی سانسیں اپنے چہرے پر محسوس ہو رہی تھیں۔ اور اسے ایسا لگ رہا تھا کہ جون کی لو سے اس کا چہرہ پھنکا جا رہا ہے۔

وہ ہٹ کر اپنے بستر پر بیٹھ گئی اور دونوں ہاتھوں سے چہرہ رگڑ ڈالا۔

"تم میرے سلسلے میں اتنی بے درد کیوں ہو؟" وہ بھی قریب آ گئے۔ کون سا کوسوں کا فاصلہ تھا جو طے نہ ہو سکتا تھا۔ وہ جھک کر اس کی آنکھوں میں جھانک رہے

تھے۔ عالیہ نے دیکھا کہ ان کی آنکھوں میں تو بادلوں سے زیادہ اندھیرا چھایا ہوا تھا مگر ان بادلوں کے باوجود لو چل رہی تھی۔ عالیہ کا دل جیسے پگھلنے لگا۔

"بیٹھ جائیے" وہ ایک طرف سرک گئی۔

"تمہارے بستر پر بیٹھ جاؤں؟ تمہارے بستر پر تو مجھے کچھ ایسا محسوس ہوگا جیسے۔"

"عالیہ کو ایسا محسوس ہوا کہ بہت سی بھیڑیں اس کے جسم سے لپٹ گئی ہیں۔ جمیل صاحب آپ میرے معاملے میں صرف ضد یا گئے ہیں، آپ خواہ مخواہ یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ اگر میں نہ ملی تو آپ مر جائیں گے تباہ ہو جائیں گے۔ اب مجھ سے زیادہ شاندار لڑکی اس زمانے میں کہیں نہیں ملے گی، مگر میں جانتی ہوں کہ اگر آج میں آپ کی نظروں سے دور ہو جاؤں تو آپ کو کوئی اور مل جائے گا۔ کبھی آپ نے جمی کے لئے بھی یہی کچھ محسوس کیا ہوگا اور۔۔۔" اس کی آواز بھرا گئی اور وہ گھٹنوں میں سر چھپا کر رونے لگی اس وقت وہ سخت کمزوری محسوس کر رہی تھی۔

"ارے، تو کیا تم مجھ سے اتنی بیزار ہو، مت رو عالیہ" جمیل بھیا نے گھبرا کر اس کے شانوں پر ہاتھ رکھ دیئے۔۔۔۔ "تم اطمینان رکھو اب میں کچھ نہ کہوں گا بس زندگی بھر ہنسانا چاہتا ہوں رلانا نہیں چاہتا"۔۔۔۔ انھوں نے شانوں پر سے ہاتھ ہٹا لئے۔۔۔۔ "اب میں تم سے کوئی مطالبہ نہ کروں گا مجھے حق ہی کیا ہے۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ اب تم میری وجہ سے پریشان نہ ہو گی، اب تم خوش ہو نا؟"

وہ بھلا کہتی کیا، یونہی گھٹ گھٹ کر روتی رہی۔

"مت رو عالیہ بی بی" وہ مجرموں کی طرح دور کھڑے رہے "تم میری زندگی کی ساتھی نہیں بننا چاہتیں تو نہ سہی۔ یوں بھی زندگی گزر ہی جائے گی کتنے لوگ ہیں جو خوشیوں سے بھرپور زندگی گزارتے ہیں، خیر، لگے اب تم چپ ہو جاؤ۔ میں اب

تم سے کچھ نہ کہوں گا۔" ان کی آواز کانپ رہی تھی۔

چند منٹ تک وہ خاموش کھڑے رہے اور پھر تیزی سے نیچے چلے گئے۔

"کریمن بوا! بڑے بھیا رات بارہ بجے تک آئیں گے، اگر سب لوگ کھانا کھا چکے ہوں تو مجھے بھی دیدو۔" اسرار میاں کی صدا سناٹے کو چیر گئی۔

عالیہ آنسو پونچھ کر بے سدھ سی لیٹ گئی ـــــ بہت اندھیرا ہے، بادل کس بری طرح گھرے ہیں، کیا آج اتنی بارش ہو گی کہ طوفانِ نوح آجائے گا؟ آج وہ فرد ڈوب جائے گی۔ اس نے تو اپنی حفاظت کے لیے کوئی کشتی بھی نہیں بنائی! اس نے آنکھیں موند لیں۔

(۴۵)

پاکستان بن گیا۔ لیگی راہ نما کراچی دارالحکومت جا چکے تھے۔ پنجاب میں خون کی ہولی کھیلی جا رہی تھی۔ بڑے چچا اس صدمے سے جیسے نڈھال ہو گئے۔ بیٹھک میں بیماروں کی طرح وہ ہر ایک سے پوچھتے رہتے "یہ کیا ہو رہا ہے؟ یہ کیا ہو گیا؟ یہ ہندو مسلمان ایک دم ایک دوسرے کے ایسے جانی دشمن کیسے ہو گئے؟ انھیں کس نے سکھایا ہے؟ ان کے دل سے کس نے محبت چھین لی؟"

جب وہ یہ سب کچھ عالیہ سے پوچھتے تو وہ ان کا سر سہلانے لگتی "بڑے چچا، آپ آرام کیجیے، آپ تھک گئے ہیں" بڑے چچا اس طرح آنکھیں بند کر لیتے جیسے خون کی ندی ان کی آنکھوں کے سامنے بہہ رہی ہو۔

"زمانے زمانے کی بات ہے، وہ بھی زمانہ تھا جب ہندو اپنے گاؤں کے مسلمانوں پر آنچ آتے دیکھتے تو سر دھڑ کی بازی لگا دیتے اور مسلمان ہندو کی عزت

بچانے کے لئے اپنی جان نچھاور کر دیتا۔ ایسا بھائی چارہ تھا کہ لگتا ایک ماں کے پیٹ سے پیدا ہوئے ہیں۔" پر اب کیا رہ گیا۔ دونوں کے ہاتھوں میں خنجر آگیا ہے۔ کہیں بوا فساد کی خبریں سن سن کر ٹھنڈی آہیں بھرا کرتیں۔ اپنے شہر بھی فساد تو ہوا تھا مگر سب کی جانوں پر بنی رہتی۔ پتہ نہیں کب کیا ہو جائے۔

"کہاں ہوگا میرا شکیل؟" بمبئی میں فساد کی خبر سن کر بڑی چچی بلکنے لگیں "تمہارا پاکستان بن گیا جمیل" "تمہارے ابا کا ملک بھی آزاد ہو گیا، پر میرے شکیل کو اب کون لائے گا"

"سب ٹھیک ہو جائے گا اماں، وہ خیریت سے ہوگا۔ یہ فساد وساد تو چار دن میں ختم ہو جائیں گے" جمیل بھیا ان کو سمجھاتے مگر ان کا چہرہ فق رہتا۔

شام سب لوگ خاموش بیٹھے چائے پی رہے تھے کہ ماموں کا خط آگیا۔ انھوں نے اماں کو لکھا تھا کہ ——— "انھوں نے اپنی خدمات پاکستان کے لئے وقف کر دی ہیں اور وہ جلد ہی جا رہے ہیں۔" اگر آپ لوگوں کو چلنا ہو تو فوراً جواب دیجئے اور تیار رہیے۔

"بس ابھی تار دیدو جمیل میاں، ہماری تیاری میں کیا لگے گا ہم تو بس تیار بیٹھے ہیں۔ ہے! اپنا بھائی ہے بھلا ہمیں اکیلا چھوڑ کر جا سکتا ہے؟ مارے خوشی کے اماں کا منھ سرخ ہو رہا تھا۔

جمیل بھیا نے اس طرح گھبرا کر سب کی طرف دیکھا جیسے فسادی ان کے دروازے پر پہنچ گئے ہوں۔ "مگر آپ کیوں جائیں چھوٹی چچی؟ آپ یہاں محفوظ ہیں۔ میں آپ کے لئے اپنی جان دیدوں گا" انھوں نے آج بڑی مدت بعد عالیہ کی طرف دیکھا کیسی سفارشی نظریں تھیں مگر عالیہ نے اپنی آنکھیں جھکا لیں۔

"میں نہ جاؤں تو کیا ہندوؤں کے نگر میں رہوں، پاکستان میں اپنوں کی توحکومت ہوگی پھر میں اپنے بھائی کو چھوڑ کر ایک منٹ بھی زندہ نہیں رہ سکتی واہ" مارے خوشی کے اماں سے نچلا نہ بیٹھا جا رہا تھا۔

"عالیہ جانے پر راضی نہیں ہوگی چھوٹی چچی، وہ نہیں جائے گی" وہ جا ہی نہیں سکتی"۔ جمیل بھیا نے جیسے نیم دیوانگی کے عالم میں کہا۔

"تم اچھے حق دار آگئے، کون نہیں جائے گا؟ اماں ایک دم بپھر اٹھیں"۔ تم ہوتے کون ہو روکنے والے؟"

"ضرور جائیے چھوٹی چچی"۔ جمیل بھیا نے سر جھکا دیا اور عالیہ کو ایسا محسوس ہوا کہ وہ نہیں جا سکتی۔ صدیاں گزر جائیں گی مگر وہ یہاں سے ہل بھی نہ سکے گی۔

"میں ابھی تار دیئے دیتا ہوں کہ سب تیار ہیں"۔ جمیل اٹھ کر باہر چلے گئے۔

عالیہ کا جی چاہا کہ وہ چیخ چیخ کر اعلان کرے کہ وہ نہیں جائے گی، وہ نہیں جا سکتی، اسے کوئی نہیں لے جا سکتا، مگر اس کے گلے میں تو سینکڑوں کانٹے چبھ رہے تھے وہ ایک لفظ بھی نہ بول سکی، اس نے ہر طرف دیکھا اور پھر نظریں جھکا لیں مگر وہ کیوں رکے، کس کے لئے، اس نے سوچا اور پھر جیسے ٹھرے سکون سے چھالیہ کاٹنے لگی۔ عالیہ بیگم اگر تم رہ گئیں .... تو ہمیشہ کے لئے دلدل میں پھنس جاؤ گی۔

"کریمن بوا اگر سب لوگ چائے پی چکے ہوں ——" اسرار میاں نے بیٹھک سے آواز لگائی اور کریمن بوا آج تو ڈائنوں کی طرح چیخنے لگیں ——

"ارے کوئی تو اسرار میاں کو بھی پاکستان بھیجدو۔ سب چلے گئے۔ سب چلے جائیں گے مگر یہ کہیں نہیں جاتا"۔

بیٹھک میں اسرار میاں کے کھانسنے کی آواز آئی اور پھر خاموشی چھا گئی۔

"کیا تم سچ مچ چلی جاؤ گی چھوٹی دلہن؟" بڑی دیر تک چپ رہنے کے بعد بڑے چچا نے پوچھا۔

"ظاہر ہے کہ چلی جاؤں گی۔" اماں نے رکھائی سے جواب دیا۔

"یہ گھر تمہارا ہے چھوٹی دلہن، مجھے اکیلے نہ چھوڑو" بڑی چچی نے ڈبڈبائی ہوئی آنکھیں بند کر لیں شاید وہ تنہائی کے بھوت سے ڈر رہی تھیں۔

عالیہ جیسے پناہ ڈھونڈنے کے لئے اوپر بھاگ گئی۔ دھوپ پھیلی پڑ کر سامنے کے مکان کی اونچی دیوار پر چڑھ گئی تھی۔ ہائی اسکول کے احاطے میں بسیرا لینے والے پرند مسلسل شور مچا رہے تھے۔

کھلی فضا میں آکر اس نے اطمینان کی سانس لی اور مسافروں کی طرح ٹہل ٹہل کر سوچنے لگی۔ کہ اب آگے کیا ہوگا، شاید اچھا ہی ہو، وہ یہاں سے جاکر ضرور خوش رہے گی۔

جب وہ نیچے اتری تو سب اپنے اپنے خیالوں میں مگن بیٹھے تھے۔ صرف کریمن بوا جانے کس بات پر بڑبڑا رہی تھیں اور پھرتی سے روٹیاں پکاتی جا رہی تھیں۔

جمیل بھیا کہاں گئے، اب تک کیوں نہیں آئے۔ عالیہ نے سونی کرسی کی طرف دیکھا۔ جانے یہ سرپھرا آدمی اسے یاد کرے گا یا بھول جائے گا۔ اس نے اپنے آپ سے پوچھا۔

لالٹین کی بتی خراب تھی اس لئے اس میں سے دو لویں اٹھ رہی تھیں اور ایک طرف سے چمنی سیاہ ہو گئی تھی۔ مدھم روشنی میں اماں، بڑی چچا اور کریمن بوا کے چہرے بگڑے بگڑے لگ رہے تھے۔

جمیل بھیا گھر میں داخل ہوئے اور اپنی کرسی پر بیٹھ گئے "میں آ گیا چھوٹی چچی!" انھوں نے دھیرے سے کہا۔

"تم اتنی دیر تک باہر نہ رہا کرو، شام سے گھر آ جایا کرو۔ جانے کب یہاں بھی گڑبڑ ہو جائے" بڑی چچی نے کہا

"رہنا تو پڑتا ہے، مسلمان ڈرے ہوئے ہیں، انھیں سمجھانا ہے کہ وہ یہاں ڈٹ کر رہیں اور یہاں کی فضا کو پرامن رکھیں، گھر میں بیٹھ کر تو کام نہ چلے گا"

"تو بر اب ملک آزاد ہو گیا تو یہ کام شروع ہو گئے" خیر مجھے کیا۔ تم نے تار پر پتہ ٹھیک لکھا تھا نا؟" اماں نے پوچھا۔

"آپ اطمینان رکھیں پتہ ٹھیک تھا"

"خیر سے ہم تو پاکستان جا رہے ہیں مگر اب تم اپنے گھر کی فکر کرو جمیل میاں کیا بری حالت ہو چکی ہے، اپنی ماں کی طرف بھی دیکھو۔" اماں نے ہمدردی سے بڑی چچی کی طرف دیکھا۔

"کون جا رہا ہے پاکستان؟" بڑے چچا نے صحن میں قدم رکھتے ہی بوکھلا کر پوچھا۔ انھوں نے اماں کی باتیں سن لی تھیں۔

"میں اور عالیہ جائیں گے، اور کسے جانا ہے" اماں نے تڑاخ سے جواب دیا

"کوئی نہیں جا سکتا، میری اجازت کے بغیر کوئی قدم نہیں نکال سکتا۔ کس لئے جاؤ گے پاکستان؟ یہ ہمارا ملک ہے، ہم نے قربانیاں دی ہیں، اور اب ہم اسے چھوڑ کر چلے جائیں؟ اب تو ہمارے عیش کرنے کا وقت آ رہا ہے" بڑے چچا سخت جوش میں تھے۔

"انشاء اللہ۔ آپ بڑے حق دار بن کر آ گئے، نہ کھلانے کے نہ پلانے کے،

کون سا دکھ تھا جو یہاں آ کر نہیں جھیلا، میرے شوہر کو بھی آپ ہی نے چھین لیا۔ آپ ہی نے انھیں مار ڈالا، میری لڑکی کو یتیم کر دیا اور اب حق جتا رہے ہیں۔" مارے غصے کے اماں کی آواز کانپ رہی تھی۔

"کریمن بوا میرا کھانا بیٹھک میں بھجوا دو۔" بڑے چچا سر جھکا کر بیٹھک میں چلے گئے۔

"کیا آپ چلنے سے پہلے بڑے چچا کو بھی بدل دینا چاہتی ہیں؟ بڑے چچا نے کسی کو تباہ نہیں کیا، بڑے چچا نے کسی کو دعوت نہیں دی تھی کہ آ کر میرا ساتھ دو۔ آپ آج اچھی طرح سن لیں کہ مجھے بڑے چچا سے اتنی ہی محبت ہے جتنی ابا سے تھی" عالیہ نے کھانا چھوڑ دیا اور ہاتھ دھو کر بیٹھک میں چلی گئی۔" اماں کیا کہتی رہ گئیں اس نے ذرا بھی نہ سنا۔

"کیا تم سچ مچ جا رہی ہو بیٹی؟"

ہاں بڑے چچا! ں جو تیار ہیں اس نے بے بسی سے جواب دیا۔

"یہ انگریز جاتے جاتے بھی چال چل گیا، لوگوں کو گھر سے بے گھر کر گیا، پھر بھی تم مت جاؤ بیٹی اپنی اماں کو سمجھا لو، اب تمھارے سکھ کا زمانہ آ گیا ہے۔"

"بڑے چچا میں تو اماں کا واحد سہارا ہوں، میں انھیں کس طرح چھوڑ دوں وہ ضرور چلی جائیں گی مگر آپ کو نہیں معلوم کہ یہ گھر چھوڑ کر میں کس طرح تڑپوں گی۔۔۔ آپ۔۔۔ آپ تو۔۔۔" وہ دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا کر سسکنے لگی۔

"چھوٹی دلہن کو مجھ سے سخت نفرت ہے، ٹھیک ہے میں نے تم لوگوں کے لیے کچھ نہ کیا، مگر اب وقت آیا تھا کہ اس گھر میں پہلی سی شادمانی لوٹ آتی مجھے بڑی اچھی ملازمت دی جا رہی ہے پھر دکانوں کو چلانے کے لیے دس پندرہ ہزار

کی امداد بھی ملنے کی توقع ہے، میں چھوٹی دلہن کی شکایتیں رفع کر دوں گا۔" انھوں نے عالیہ کو پیار سے تھپکا۔ "کیا گھر میں تیل ختم ہو گیا ہے؟ لالٹین کی لو مدھم ہوتی جا رہی ہے، اب انشاء اللہ تھوڑے دنوں میں بجلی کا کنکشن بحال کرا لوں گا اور اب تم ایم۔ اے میں داخلہ کیوں نہ لے لو۔ میرا خیال ہے کہ تم کو اگلے سال ضرور داخل کرا دوں گا۔

عالیہ کا کلیجہ کٹ رہا تھا۔ آنسو پوچھ کر وہ خاموش رہی۔ جی ہی جی میں گھٹ رہی تھی مگر ایک لفظ بھی نہ بول سکی۔ خدا آپ کو سکھ دے بڑے چچا، خدا آپ کے سارے سہانے خواب پورے کرے۔ وہ دل ہی دل میں دعا مانگ رہی تھی۔ وہ بڑے چچا سے کس طرح کہتی کہ وہ تو یہاں سے خود بھاگ جانا چاہتی ہے۔

اسرار میاں بیٹھک میں داخل ہونے کے لیے پٹ کھول رہے تھے۔ عالیہ اٹھ کر صحن میں آ گئی۔

اماں اور بڑی چچی جانے کیا باتیں کر رہی تھیں۔ جمیل بھیا اب تک کرسی پر بیٹھے انگلیاں مروڑ رہے تھے۔ وہ ایک لمحے تک آنگن میں کھڑی رہی اور پھر اوپر چلی گئی۔

شبنم سے بھیگی ہوئی رات بڑی روشن ہو رہی تھی۔ چاند جیسے وسط آسمان پر چمک رہا تھا اور روز کی طرح آج بھی قریب کی کسی چھت پر گراموفون ریکارڈ بج رہے تھے۔ "گٹھڑی میں لاگا چور مسافر جاگ ذرا۔"

وہ آہستہ آہستہ ٹہلنے لگی۔ کیسی عجیب سی حالت ہو رہی تھی۔ جیسے سوچنے کی ساری صلاحیت کسی نے چھین لی ہو۔ "کیا یہ میں ہوں؟" اس نے اپنے آپ سے پوچھا اور پھر اپنی آواز سن کر حیران رہ گئی۔ حد ہے دیوانگی کی، وہ کس سے پوچھ رہی تھی۔

ٹہلتے ٹہلتے وہ ایک بار مڑی تو جمیل بھیا بت کی طرح بے حس و حرکت کھڑے تھے وہ اور تیزی سے ٹہلنے لگی۔ اب یہ کیا کہنے آئے ہیں؟ انھوں نے اپنا وعدہ بُھلا دیا۔

"کیا سچ سچ تم نے جانے کا فیصلہ کر لیا ہے؟" انھوں نے دھیرے سے پوچھا۔

"ہاں" اس نے ٹہلتے ہوئے جواب دیا۔

"تم یہاں سے جا کر غلطی کروگی، تم نے ایک بار کہا تھا نا کہ دور رہ کر یادیں بہت اذیت ناک ہو جاتی ہیں۔ میرا خیال ہے کہ تم وہاں خوش نہ رہو گی۔"

"میں ہر جگہ خوش رہوں گی، مگر آپ نے تو وعدہ کیا تھا کہ آپ مجھ سے کبھی کچھ نہ کہیں گے۔"

"میں کیا کہہ رہا ہوں؟"

"کچھ نہیں۔"

"تم میری مقروض ہو، یاد رکھنا کہ تم کو یہ قرض چکانا ہوگا۔" وہ جانے کے لئے مڑے "تم وہاں خوش رہو گی نا؟" انھوں نے رک کر پوچھا۔

وہ چپ رہی۔ جمیل بھیا تھوڑی دیر کھڑے رہے اور پھر چلے گئے اور اس نے محسوس کیا کہ اس وقت وہ سب کچھ کھو بیٹھی ہے۔

بڑی دیر تک یوں ہی ٹہلنے کے بعد جب وہ تھک گئی تو چھمی کو خط لکھنے بیٹھ گئی۔ اسے یہاں سے جانے کی اطلاع دینی تھی۔

(۴۶)

یہ رات پہاڑوں کا بوجھ اٹھائے ہوئے ہے، کوئی اسے گزار دے۔ کوئی صبح ہونے کا پیغام سنا دے اسے صبح ہونے کا انتظار ہے۔ صبح وہ چلی جائے گی

اور اسی کرب سے نجات حاصل کرے گی۔

سب بول رہے ہیں، باتیں کر رہے ہیں۔ پھر بھی کیسا سناٹا چھایا ہوا ہے۔ چاند کی کونسی تاریخ ہے۔ اب تک چاند نہیں نکلا۔ چھالیہ کاٹتے کاٹتے عالیہ نے سب کی طرف دیکھا۔ جمیل بھیا سب کی باتوں سے بے نیاز اپنی کرسی پر بیٹھے ایک شعر گنگنائے جا رہے تھے ؎

مجھے اور زندگی دے کہ ہے داستاں ادھوری
مری موت سے نہ ہوگی مرے غم کی ترجمانی

جمیل بھیا آج سارا دن باہر نہیں نکلے تھے آج ان کو فرصت ہی فرصت تھی جیسے سارے کام ختم ہو گئے اور اب انھیں کچھ بھی نہیں کرنا ہے۔

"بڑی بھابی، میں تو جا رہی ہوں مگر آپ میری ایک بات یاد رکھئے گا کہ اگر آپ نے بڑے بھیا اور جمیل میاں کو قابو میں نہ کیا تو آپ کی ساری عمر یونہی گزر جائے گی۔ اب تو آزادی مل گئی، اب کون سا بہانہ رہ گیا ہے جو یونہی سارا دن دونوں باپ بیٹے آوارہ پھرتے ہیں۔" اماں بڑی بھابی کو سمجھا رہی تھیں۔

"مجھے اور زندگی دے کہ ہے داستاں ادھوری ..... کہ ہے داستاں ادھوری۔" جمیل بھیا اسی ایک شعر کو رٹے جا رہے تھے۔

اس شعر کو بار بار پڑھ کر وہ کیا جتانا چاہتے ہیں۔ وہ اس سے کیا کہہ رہے ہیں؟ عالیہ کا سروتہ بڑی تیزی سے چھالیہ کاٹنے لگا۔ اللہ میاں اگر اس وقت اسے بہرا کر دے تو پھر کتنا اچھا ہو۔

چھوٹی دلہن ایسا جان پڑتا ہے کہ کلیجہ منہ کو آیا جاتا ہے، بھرا پرا گھر تھا۔ دیکھتے دیکھتے سب تتر بتر ہو گئے۔ زمانے زمانے کی بات ہے کوئی کچھ

نہیں کر سکتا، قربان جاؤں اس مالک کے جس نے ایک ملک کے دو ملک دیے، اپنے مسلمانوں کی حکومت ہو گئی، پر ہم اکیلے رہ گئے۔" کریمن بوا جدائی کے صدمے سے نڈھال .... ہو رہی تھیں۔

"تم بھی چلو کریمن بوا" اماں نے بڑے خلوص سے کہا۔

"اب تو یہی دعا کریں چھوٹی دلہن کہ اس گھر سے لاش نکلے میری، آج یہاں سے چلی جاؤں تو مرنے کے بعد مالکن مرحومہ کو کیا منہ دکھاؤں گی، وہ اپنے جیتے جی جہاں بٹھا گئیں وہاں سے کیوں کر پاؤں نکالوں۔"

سیتا نے رام کی کھینچی ہوئی لکیر سے باہر قدم رکھا تھا تو راون اٹھا لے گیا تھا۔ سیتا نے جیتے جاگتے رام کی حکم عدولی کی تھی، مگر تم کریمن بوا مری ہوئی مالکن کا حکم نہیں ٹال سکتیں۔ پھر بھی سیتا سیتا رہیں اور تم کریمن بوا رہو گی، تم کو کون جانے گا، تمہارا قصہ کون لکھے گا۔

عالیہ نے ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے کریمن بوا کو دیکھا۔ لالٹین کی مدھم زرد روشنی میں جھائیوں کے دھبے کتنے اجاگر ہو رہے تھے۔

"چھوٹی دلہن اب بھی اپنا فیصلہ بدل دو، مت جاؤ چھوٹی دلہن!"

بڑی چچی کی آواز بھاری ہو رہی تھی۔

"مجھے اور زندگی دے کہ ہے داستاں ادھوری ـــ جمیل بھیا ساری باتوں سے بے نیاز ہو کر جیسے اس ایک شعر کی کیفیت میں ڈوب کر رہ گئے تھے۔

"اللہ کوئی تو اس رات کو گزار دے ورنہ آج وہ اپنی جان سے گزر جائے گی۔ عالیہ نے مڑ کر ادھر ادھر دیکھا۔ چاند نکل رہا تھا

آسمان روشن ہوتا جا رہا تھا۔

"چھمی کا خط آیا تھا، اس نے کیا لکھا تھا عالیہ؟" بڑی چچی نے پوچھا۔

"اس نے لکھا ہے کہ پاکستان جانا مبارک ہو، ضرور جائیے۔ اس پاک سرزمین کو میری طرف سے چوم لیجئے گا اور وہاں کی تھوڑی سی مٹی بھیج دیجئے گا۔ میں اسے اپنی مانگ میں لگاؤں گی، میں بدنصیب تو وہاں کبھی نہیں جا سکتی، اور سب کو سلام دعا لکھی ہے۔" عالیہ کو جتنا یاد تھا سب سُنا دیا۔

"اور بھی کچھ لکھا ہے؟" بڑی چچی نے پوچھا۔

"بس یہی سلام دعا، خط اوپر رکھا ہے۔"

"مری موت سے نہ ہوگی مرے غم کی ترجمانی ـــــ" جمیل بھیا اب بھی سب سے بے نیاز تھے۔

"جانے ہمارے مسلمانوں کا ملک کیسا ہوگا، مکان بھی مل جائے گا۔ جلدی سے کہ نہیں، ہوٹل میں نہ ٹھہرنا چھوٹی دلہن۔ صحت خراب ہو جائے گی وہاں کے کھانے سے۔" کریمن بوا کو اب آگے کی فکر ستا رہی تھی۔

"تم پریشان نہ ہو کریمن بوا، میں جاتے ہی خط لکھ دوں گی۔" اماں نے کہا۔

رات کے بارہ بج رہے تھے۔ رات سرد ہوتی جا رہی تھی مگر سب لوگ بیٹھے تھے، عالیہ کا جی چاہ رہا تھا کہ بس اب کسی طرح اوپر کھاگ جائے۔

"اچھا بھئی اب سونے کو چل دیجئے، خدا حافظ" ـــــ جمیل بھیا کرسی سے اٹھ پڑے ـــــ

"مجھے اور زندگی دے ـــــ" وہ کمرے میں چلے گئے۔

بیٹھک کے دروازے کھلے اور بند ہو گئے، بڑے چچا ایک ذرا دیر کو بھی اندر نہ آئے۔ عالیہ انتظار کرتی رہ گئی۔

گلی میں آوارہ کتے بھونک بھونک کر رو رہے تھے۔ کاش نیند آجائے اس کی آنکھوں میں مرچیں سی لگ رہی تھیں ـــ ایک دن جب وہ یہاں آئی تھی اور پہلی رات اس کمرے میں گزاری تھی تو ساری رات سو نہ سکی تھی اور آج جب وہ یہاں سے جا رہی ہے تو پھر نیند نے ساتھ چھوڑ دیا تھا۔ کتنی بہت سی باتیں اس کا کلیجہ نوچ رہی تھیں ـــ جمیل بھیا نے اس سے ایک بات بھی نہ کی، کیا جاتے جاتے وہ اب اس سے کچھ نہ کہیں گے، کیا اب کچھ کہنے کو باقی نہیں رہ گیا۔ اللہ، بڑے چچا کیا سوچ رہے ہوں گے، وہ بڑے چچا کو چھوڑ کر جا رہی ہے اور چچی، خدا کرے اسے پاکستان آنا نصیب ہو جائے۔

جاگتے جاگتے صبح ہو گئی۔ نچلی منزل سے برتنوں کے کھڑکنے اور باتیں کرنے کی آواز آ رہی تھی۔ اس نے کمرے پر ایک وداعی نظر ڈالی اور پھر نیچے آ گئی۔

ناشتہ تیار تھا وہ اماں اور بڑی چچی کے ساتھ بیٹھ گئی۔ کمرے کے کھلے دروازوں سے اس نے دیکھا کہ جمیل بھیا اب تک چادر تانے سو رہے تھے۔

حد ہو گئی بے مروتی کی، وہ جا رہی ہے اور ان کی آنکھ بھی نہیں کھلتی جیسے موت کی نیند آ گئی ہے۔ عالیہ کو کیسی ٹیس لگ رہی تھی ان کے یوں ٹھاٹ سے سونے پر۔ وہ چلی جاتی تو پھر سو لیتے۔

ناشتے کے بعد اماں نے اپنے سارے سامان کا جائزہ لینا شروع کر دیا۔ کپڑوں اور ہلکے پھلکے دو کمبلوں کے سوا تمام سامان چھوٹے کمرے میں بھر دیا گیا تھا کہ جب اچھا وقت آئے گا تو پھر آکر سب کچھ لے جائیں گے۔

”تانگے آ گئے ہیں“ اسرار میاں نے باہر سے آواز لگائی تو وہ جلدی سے بیٹھک کی طرف بھاگی۔ ”کیا آج بڑے چچا جی سوتے رہیں گے“

”تمہارے بڑے چچا تو تڑکے ہی کہیں چلے گئے کہتے تھے کہ کام ہے اور یہ بھی کہتے تھے کہ میں سب کو جاتے نہ دیکھ سکوں گا“ کریمن بوا نے بڑی رقت سے بتایا۔

”یہ کہو نا کریمن بوا کہ وقت نہیں تھا جو رخصت کرنے بیٹھے رہتے“

اماں نے برا سا منہ بنایا۔ ”بڑی بھابی، میرا سامان حفاظت سے رکھئے گا۔ اس کمرے میں تالا لگا دیجئے گا“ اماں نے ایک بار پھر ہدایت دی۔

اللہ آج کی سیٹیں ریزرو نہ ہوتیں، آج وہ رک سکتی، بڑے چچا سے ملے بغیر وہ کس طرح جا سکتی ہے۔ وہ جیسے تھک کر بیٹھ گئی۔

”اٹھ جاؤ جمیل، تمہاری بہن اور چچی جا رہی ہیں، انہیں رخصت تو کرو“ بڑی چچی نے تیسری بار جمیل بھیا کو آواز دی مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوئے۔

”جلدی کرو کریمن بوا، ہوائی جہاز کسی کا انتظار نہیں کرتا وقت پر اڑ جائے گا“ اسرار میاں نے پھر صدا لگائی۔

”خدا نہ کرے۔ میرا بھائی آج لاہور کے ہوائی اڈے پر انتظار کرے گا۔ جو ہم لوگوں کو نہ پایا تو کلیجہ پھٹ جائے گا“ اماں نے بوکھلا کر

برقع اوڑھ لیا۔" اب تم بھی جلدی کرو نا۔"۔۔۔۔ انھوں نے جھلا کر عالیہ کی طرف دیکھا جو ابتک بے سدھ سی بیٹھی تھی۔

"بہت وقت ہو رہا ہے، پہلے سے پہونچنا اچھا ہوتا ہے"۔ اسرار میاں کی آواز رکتی ہی نہ تھی۔

"ارے کوئی اس اسرار میاں کو بھی پاکستان بھیجدو" کریمن بوا کلیجہ پھاڑ کر رو دیں۔

کریمن بوا اور بڑی چچی اماں سے مل مل کر رو رہی تھیں مگر وہ دم بخود کھڑی رہی اسے تو رونا بھی نہیں آرہا تھا۔

"اگر شکیل وہاں ملے تو خط ضرور لکھنا" بڑی چچی نے عالیہ کو لپٹا کر سرگوشی کی۔ "مجھے یاد رکھنا، جاؤ خدا کو سونپا"۔۔۔۔ ان کی آواز کانپ رہی تھی۔"

ارے اے جمیل۔ اب تو اٹھ جا۔ بڑی چچی نے زور سے پکارا۔

میں جا رہی ہوں، خود مل لوں گی" عالیہ نے کہا۔

"کیوں مل لوگی؟ وہ تو مارے نفرت کے ملنا نہیں چاہتا"۔ اماں نے تیوریوں پر بل ڈال لئے۔ "بس اب چلو جلدی۔"

"میں جا رہی ہوں، خدا حافظ"۔ عالیہ نے جمیل بھیا کے منھ پر سے چادر کھینچ لی اور پھر جھجک کر ایک قدم پیچھے ہٹ گئی۔ بھیگی اور سوجی ہوئی آنکھوں میں ایک داستان دم توڑ رہی تھی۔ اس نے گھبرا کر آنکھیں بند کرلیں۔ پھر بھی وہ آنکھیں تو اس کی آنکھوں میں گھسی جا رہی تھیں۔

"تم جاتیں کیوں نہیں بے وقوف لڑکی؟ کیا یہی دیکھنے کے لئے مجھے جگانے آئی تھیں؟ خدا حافظ" انھوں نے منھ چھپا لیا۔

"جلدی چلو عالیہ"۔ اماں کی آواز آئی۔ تب عالیہ کو خیال آیا کہ اسے جانا ہے۔ باہر تانگہ کھڑا ہے۔ مگر اس کے پاؤں کیوں نہیں اٹھتے، اب وہ جاتی کیوں نہیں اور یہ کمرے میں اتنا اندھیرا کیوں چھا رہا ہے۔

"کریمن بوا جلدی کرو بہت دیر ہو رہی ہے" اور چھوٹی دلہن سے اور عالیہ بی بی سے میری دعا کہہ دو کہ ——" اسرار میاں کی آواز رک گئی۔

"خدا کرے تمہاری زبان تھک جائے اسرار میاں" کریمن بوا نے تڑپ کر دعا مانگی۔

عالیہ سب کچھ سن رہی تھی مگر اس کے پاؤں نہیں اٹھ رہے تھے اور کوئی اسے کھینچ کر لیے جائے۔ وہ اس کمرے سے تو نکل جائے۔

"تم اس لیے دیر کر رہی ہو کہ ہمارا جہاز ہم کو چھوڑ کر اڑ جائے۔ تیرے بھائی کے ٹکٹوں کے دام غارت جائیں اور وہ ہمیں اس جہاز میں نہ پاکر پاگل ہو جائے۔ ——" اماں جانے اور کیا کہتیں کہ عالیہ وحشیوں کی طرح بھاگتی ہوئی کمرے سے نکل گئی۔

"آپ کے بھائی اور بھاوج سے اتنا بھی نہ ہوا کہ چار پانچ دن ہماری وجہ سے ٹھہر جاتے۔ ہمارے ساتھ سفر کر لیتے اور اب ہمارے لیے پاگل ہو جائیں گے۔ اوہ!" عالیہ زور سے بولی اور پھر بڑی بڑی چیخوں سے لپٹ کر سسکنے لگی۔

(۴۷)

لاہور آ کر تین چار دن ماموں کے ساتھ ان کی سرکاری کوٹھی میں

گزارنے پڑے۔ وہ بھی اس طرح کہ سارا دن ایک چھوٹے سے کمرے میں بند پڑی رہتی۔ وہ ہر وقت یہ سوچتی رہتی کہ اس بیزار کن ماحول میں کس طرح زندگی گزارنے گی۔ ہاں اماں بہت خوش تھیں۔ بھائی اور انگریز بھاوج کے ساتھ رہنے کی بڑی پرانی آرزو اب پوری ہو گئی تھی۔ انھوں نے زندگی بھر ساتھ رہنے کے پروگرام بنا لئے تھے اور عالیہ سے خفا تھیں کہ وہ سب سے الگ تھلگ پڑی رہتی ہے۔ اور کچھ نہیں تو اپنی ممانی سے فر فر انگریزی بولنے کی مشق ہی کرے مگر اس نے تو ان چار دنوں میں صرف ایک ہی کام کیا تھا کہ بڑی چچی اور بڑے چچا کو کئی کئی صفحوں کے خط لکھے تھے۔

پانچویں دن ماموں نے ایک چھوٹی سی کوٹھی کا تالا تڑوا کر اماں کو ان کے گھر جانے پر مجبور کر دیا۔ انھوں نے اماں کو چپکے چپکے سمجھایا کہ انگریز عورتیں تو اپنی ماں کے ساتھ بھی رہنا پسند نہیں کرتیں۔

اماں نے عالیہ سے یہ باتیں چھپانی چاہیں مگر جب وہ اپنے نئے گھر جا رہی تھی تو ممانی نے ٹوٹی پھوٹی اردو میں سمجھا ہی دیا کہ سب کا الگ الگ رہنا ٹھیک ہوتا ہے ساتھ رہنے میں بہت گڑبڑ ہوتی ہے۔

کوٹھی میں ایک ایک چیز اپنی جگہ پر موجود تھی۔ کھانے کی میز پر برتن قرینے سے لگے ہوئے تھے۔ اور برتنوں کے نقش و نگار دھول نے چھپا دیئے تھے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ بس ابھی پردے کے پیچھے سے نکل کر کوئی آئے گا۔ اور کھانے کے لئے بیٹھ جائے گا۔ باورچی خانے میں پیتل کے برتن الماری میں لگے تھے اور چند برتن زمین پر لڑھکے پڑے تھے۔ ڈرائنگ روم کے قالین اور صوفے سب پر دھول ہی دھول براجمان تھی اور گلدان میں لگے

ہوئے پھول جھڑ کر میز پر بکھرے ہوئے تھے۔ صرف کالی کالی سوکھی شاخیں اب تک گلدان میں ٹھنسی ہوئی تھیں۔ سونے کے کمرے میں بستروں پر پلنگ پوش بچھے ہوئے تھے اور سرہانے تپائی پر رکھا ہوا لیمپ اوندھا پڑا تھا۔ اس کمرے کے ساتھ چھوٹے سے کمرے میں آتشدان پر کرشن مہاراج کی مورتی رکھی تھی۔ مالا کے پھول جھڑ کر آس پاس بکھرے ہوئے تھے اور گلے میں صرف پیلا ڈورا لٹکا رہ گیا تھا۔

"بھئی اسے تو یہاں سے ہٹاؤ، باہر بچوں کو دیدو، کھیلیں گے۔" جب سے اماں یہاں آئی تھیں انھوں نے کئی بار کہا تھا۔

عالیہ نے اماں کو کوئی جواب نہ دیا۔ مورتی کئی دن تک یوں ہی رکھی رہی۔ پھر جب اس کمرے کو استعمال کیے بغیر اماں کا گزارہ ناممکن ہو گیا تو عالیہ نے مورتی کو اٹھا کر اپنے بکس میں چھپا لیا۔

دن بڑی بے کیفی سے گزر رہے تھے۔ بیکار بیٹھے بیٹھے اکتا گئی تھی۔ اس کے خطوں کے جواب بھی نہ آئے تھے۔ کون کہتا ہے کہ دور رہ کر یادیں بہت اذیت ناک ہو جاتی ہیں، اسے تو سب بھول گئے۔ یادیں صرف اس کے لیے اذیت ناک ہو رہی ہیں۔

شامیں عذاب کی طرح کٹتیں، امدادی کمیٹیاں گھر گھر چکر لگاتی پھرتیں، اپنے مہاجر بھائیوں کی مدد کرو، قافلے آرہے ہیں، مدد کرو۔ اور اماں بڑی رقت سے بتاتیں کہ ہم تو خود مہاجر ہیں۔ لوگ چلے جاتے مگر عالیہ کا دل چاہتا کہ وہ اماں کی آنکھوں میں دھول جھونک کر سب کچھ اٹھا کر دیدے۔

ماموں اور ان کی بیگم کبھی کبھی شام کو آنکلتے تو عالیہ کی سمجھ میں نہ آتا کہ وہ کون

سے چوہیا کے بل میں جا چھپے، اماں بوکھلا جاتیں اور ان کی سمجھ میں نہ آتا کہ اپنی بھابی کو کس کے سر آنکھوں پر بٹھا دیں،

چند دن خاموش بیٹھے رہنے کے بعد اس نے ایک ہائی اسکول میں ملازمت کی درخواست دیدی جو جلد ہی منظور ہو گئی اور مصروفیت نے اسے بہت سے غموں اور دکھوں سے بچا لیا پھر بھی جب وہ اسکول سے واپس آتی تو بڑے چچا اور بڑی چچی کے خط کے لیے پوچھتی۔ اماں اس روز روز کے پوچھنے سے تنگ آچکی تھیں وہ ہمیشہ جھنجھلا کر جواب دیتیں۔

ایک دن ماموں اکیلے آئے تو انھوں نے بتایا کہ کوٹھی اماں کے نام الاٹ کرا دی ہے۔ اب کسی بھی صورت چھوڑنا نہیں۔ پھر انھوں نے فرنیچر وغیرہ کی چند رسیدیں دیں کہ اگر کوئی پوچھے تو یہ دکھا دینا کہ ہم نے یہاں آکر خریدا ہے۔ اس کوٹھی میں تو بس کیا دھرا تھا۔

اماں اپنے بھائی کے کارناموں پر خوش ہوتی رہیں "بھائی ہو تو ایسا ہو" میرے آرام کے لیے اس نے کیا نہیں کیا اب انگریزوں میں یہ قاعدہ نہیں کہ سب ہر وقت سر پہ نازل رہیں اگر ہمارے ہاں جیسا قاعدہ ہوتا تو بھائی ایک منٹ کو جدا نہ کرتا۔

عالیہ چپ چاپ کچھ سنتی رہی اس کی سمجھ میں نہ آرہا تھا کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ کس کا حق کون اڑائے لیے جا رہا ہے۔ یہ رسیدیں کہاں سے آگئیں، یہ کوٹھی اس کی کس طرح ہو گئی۔ مگر عالیہ یہ سب کچھ کس سے پوچھتی اماں صرف اماں تھیں اس کی تنخواہ ملنے اور کوٹھی کی مالک بننے کے بعد پہلی جیسی مغرور اور خود پسند۔

وقت گھٹ گھٹ کر گزر رہا تھا۔ اسکول سے آکر وہ پریشان پھرا کرتی۔ آس پاس کی کوٹھیوں میں بھی کسی سے ملنا جلنا نہ تھا۔ جانے کہاں کے لوگ آکر بس رہے ہیں

کسی کو کسی کی خبر نہ تھی۔

اماں کو اتنی فرصت ہی نہ ملتی کہ اس کی طرف کبھی دیکھ لیتیں، سارا دن کوٹھی کی دیکھ بھال میں گزر جاتا دس روپے مہینے پر رکھی ہوئی ماما اگر کسی چیز کو ذرا زور سے رکھ دیتی تو اماں کا کلیجہ دکھ جاتا ـــ "میں نے اتنی اتنی مہنگی چیزیں خریدی ہیں اور تم آپے میں نہیں رہتیں۔ ذرا ہوش سے کام کیا کرو۔"

بہت دن نہیں گزرے تھے کہ ماموں کراچی تبدیل ہو گئے، جب وہ رخصت ہو رہے تھے تو اماں کا رو رو کر برا حال ہو گیا، ان کی بھابی اس بیقراری کو دیکھ کر مسکراتی رہیں ـــ "ہمارا تو یہ لوگ بھی بہت دور دور چلا جاتا ہے مگر کوئی نہیں روتا۔"

عالیہ کو ان کے جانے کا نہ صدمہ ہوا نہ خوشی، چلے گئے تو چلے گئے۔ اس کا ان لوگوں سے واسطہ ہی کیا تھا۔ یہاں آنے کے بعد ماموں نے کئی بار کہا بھی تھا کہ عالیہ اپنے باپ کی طرح دل سے انھیں ناپسند کرتی ہے۔

وہ یہ سب کچھ سن کر ہنس دی۔ اس وقت اسے ابا کتنی شدت سے یاد آتے تھے، مگر اب تو وہ ان کی قبر تک کو دوسرے ملک میں چھوڑ آئی تھی۔ وہاں سے ناتہ ٹوٹ گیا تھا۔ کسی نے اس کے خط کا جواب تک نہ دیا تھا۔

(۴۸)

فساد ختم ہو گئے تھے بس کہیں اکا دکا واردات کی خبر پڑھنے میں آجاتی۔ اب دونوں ملک بھائی چارہ قائم کرنے پر زور دے رہے تھے عالیہ کو ان خبروں سے ذرا بھی دلچسپی نہ ہوتی۔ بھلا ایسی بھی معصومیت کس کام کی۔

ماموں کے جانے کے بعد عالیہ نے پردہ چھوڑ دیا تھا۔ یہاں اسے کون جانتا تھا جو اپنی پرانی روایات کو پکڑے بیٹھی رہتی۔ خالی وقت گزارنے کے لئے اس نے والنٹ کیمپ جانا شروع کر دیا تھا۔ اسکول سے آکر وہ تھوڑی دیر آرام کرتی اور پھر بس سے چلی جاتی۔ وہاں بچوں کو مفت میں پڑھا کر اسے عجیب سا سکون ملتا۔ مصروفیت کی دھول نے پچھلی یادوں کو دھندلا دیا تھا۔

اماں اس کے والٹن کیمپ جانے کی وجہ سے سخت اکھڑی اکھڑی رہتیں جب بھی وہ وہاں سے واپس آتی کوئی نہ کوئی ناخوشگوار بات ہو جاتی۔ ایسے موقع پر وہ چپ رہتی۔ وہ اپنی طرف سے بات نہ بڑھانا چاہتی تھی۔

آج چھ بجے شام جب وہ واپس آئی تو اماں اجاڑ لان میں کرسی پر بیٹھی جیسے اسی کا انتظار کر رہی تھیں۔

"تم وہاں کس لئے جاتی ہو؟ تم کو اس بے کار کام میں کیا مل جاتا ہے؟" انھوں نے سختی سے سوال کیا۔

"سکون ملتا ہے۔" اس نے بڑی نرمی سے جواب دیا۔

"وہی باپ اور چچا والی باتیں، کیا اب تم مجھے تباہ کرنا چاہتی ہو؟"

"بچوں کو پڑھانے سے اگر آپ تباہ ہوتی ہیں تو میں مجبور ہوں۔" اس نے تنگ آکر جواب دیا۔

"تم مجبور ہو؟" اماں نے غصّے سے پوچھا۔

"ہاں میں مجبور ہوں۔" وہ اٹھ کر اندر چلی گئی۔ اس نے پلٹ کر بھی نہ دیکھا کہ اماں پلّو میں منہ چھپا کر رو رہی تھیں۔

کمرے میں تنہا پڑ کر وہ دیر تک سوچتی رہی کہ وہ کیا کرے۔ وہ اماں کو

خوش نہیں رکھ سکتی"۔ انھیں خوش رکھنے کے لئے اسے پرائے گھر میں پڑا رہتا ہوگا۔ تنہائی اور بیکاری ہیں جو جذبے اسے ستائیں گے ان سے کس طرح پیچھا چھڑائے گی اور جو یادوں کے بھوت اس کے گرد منڈلانے لگتے ہیں ان سے بچکر وہ کہاں بھاگے گی۔ وقت یوں نہیں گزر سکتا، اسے سہارے کی ضرورت ہے۔ اور پھر اس خیال کے ساتھ ہی جانے کیسے اسکو والٹن کیمپ کے ڈاکٹر کا خیال آگیا۔ اچھا آدمی ہے بیچارا۔

رات اماں نے اکیلے کھانا کھا لیا۔ اس نے بھی شکایت نہ کی۔

آج جب وہ اسکول سے واپس آئی تو اداس تھی۔ آپ ہی آپ اسے ایسا محسوس ہوتا کہ جی بیٹھا جا رہا ہے۔ سردیاں دم توڑ رہی تھیں پھر بھی اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ اسے سخت سردی لگ رہی ہے۔ اس نے سوچا کہ آج وہ آرام کرے گی، آج کہیں نہ جائے گی۔

کھانے کے بعد کمرہ بند کر کے وہ سونے کے لئے لیٹ گئی۔ کتنی دیر کروٹیں بدلتی رہی مگر نیند نہ آنا تھی نہ آئی۔ اکتا کر اس نے اخبار اٹھا لیا۔ آج تو صبح جانے سے پہلے اس نے اخبار کو سرسری طور پر بھی نہ دیکھا تھا۔ یوں ہی نہ چاہا۔

دو تین موٹی موٹی سرخیاں دیکھنے کے بعد ایک خبر پر اس کی نظریں جم کر رہ گئیں۔ مسلمان کانگرسی لیڈر کو کسی شخص نے مار دیا۔ نہرو کا اظہار افسوس۔ مرحوم کے خاندان کے لئے تین ہزار روپیہ کا عطیہ۔ ہندو مسلمان منافرت کی شدید مذمت۔

بڑے چچا کا نام پڑھ کر اس نے دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا لیا۔ وہ

پاگلوں کی طرح اٹھی اور پھر اپنے بستر پر گر پڑی۔ اسے اپنے دل میں درد سا ہوتا محسوس ہو رہا تھا۔ ارے وہ تو بڑے چچا سے مل کر بھی نہ آئی تھی اور وہ ہمیشہ کے لیے رخصت ہو گئے ــــ وہ اپنے پلنگ کی پٹی سے سر ٹیک ٹیک کر بڑی دیر تک روتی رہی۔ اب وہ بڑے چچا سے کبھی نہ مل سکے گی۔ اس احساس نے اسے اس طرح تڑپایا کہ اس کے آگے وہ کچھ نہ سوچ سکتی تھی۔

شام ہو گئی۔ کمرے میں اندھیرا پھیل گیا۔ روتے روتے وہ تھک چکی تھی۔ اماں کئی بار دروازہ کھٹکھٹا کر لوٹ چکی تھیں۔ اس نے سوجی ہوئی آنکھوں کو بہ مشکل کھولا اور کمرے میں بکھرے ہوئے اخبار کے صفحوں کو روندتی باہر نکل گئی۔

"ارے تم کو کیا ہوا ہے؟" اماں اس کے سرخ چہرے اور سوجی ہوئی آنکھوں کو دیکھ کر گھبرا گئی تھیں۔

"بڑے چچا کو کسی ہندو نے چپکے سے مار دیا۔" اس نے بڑے سکون سے کہا۔ اتنا رو چکنے کے بعد اسے صبر آ گیا تھا۔

"ہے ہے، ساری زندگی ہندو کی غلامی کرنے کے بعد یہ بدلہ ملا؟" اماں کی آواز بھرا رہی تھی۔ انھوں نے پلو میں آنسو خشک کر لیے ــــ "بے چاری چھوٹی بھابی کا کیا حال ہوگا، انھوں نے تو ہم لوگوں کو اطلاع تک نہ دی۔"

عالیہ اماں کو ان کے حال میں چھوڑ کر باہر لان میں چلی آئی ــــ بس بڑے چچا! اتنی شاندار زندگی کا یہی انجام ہونا تھا؟ ــــ تین ہزار روپے کا عطیہ اور اظہار افسوس؟ پتہ نہیں کپڑے کی دکانوں کے لیے وہ بیس پچیس ہزار روپے ملے تھے یا نہیں؟ بجلی کا کنکشن بحال ہوا تھا یا نہیں؟ کیا ابھی لالٹین

کی پیلی پیلی روشنی میں بڑے چچا کی لاش رکھ کر سب روتے رہے ہوں گے؟ پتہ نہیں جمیل بھیا کا کیا حال ہوگا؟ موت نے سارے اختلافات مٹا دیئے ہونگے کہ نہیں؟

رات لیمپ کی روشنی میں، میز پر جھکی وہ بڑی دیر تک بڑی چچی کو خط لکھتی رہی اور اماں باتیں کرتی رہیں ـــــ

"جانے کیا حال ہوگا بڑی بھابی کا، بڑے بھیا مرحوم نے نہ زندگی بھر خود چین لیا نہ دوسروں کو لینے دیا۔ بھرے پرُے گھر تباہ کر دیئے، کیا مل گیا انہیں؟ جن کا ساتھ دیا انھوں نے ہی پردیس میں موت کی نیند سلا دیا۔ ہائے چلے ہی آتے ان کافروں کے ملک سے بھلا کیا ضرورت تھی وہاں رہنے کی۔ اور اب وہ جمیل میاں ہیں وہ بھی ویسے ہی شاندار نکلے۔

خط ختم کر کے اس نے لفافے میں بند کر دیا۔

"سو جایئے اماں" وہ لیمپ بجھا کر اپنے بستر پر لیٹ گئی۔ ذرا دیر بعد اماں کے خراٹے لینے کی آواز آنے لگی مگر وہ آنکھیں کھولے اس اندھیرے میں کیا کچھ نہیں دیکھ رہی تھی ـــ یہ بڑے چچا کی کفنائی ہوئی لاش یہاں اتنی دور لا کر کون رکھ گیا۔ اسرار میاں تم بڑے چچا کو ہاتھ نہ لگانا۔ کریمن بوا ناراض ہو جائیں گی۔ کریمن بوا اتنی زور زور سے قرآن شریف نہ پڑھو، موت کا احساس اور بھی شدید ہو جاتا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ بڑے چچا نہیں مرے ایک دنیا مر گئی، چپکے چپکے پڑھو کریمن بوا ـــ اس نے گھبرا کر آنکھیں بند کر لیں مگر وہ اپنے کانوں کو کیسے بند کر لیتی۔ اتنی دور سے بڑے چچا کے ملک سے کریمن بوا کے قرآن شریف پڑھنے کی آواز برابر آئے جا رہی تھی۔ اور

بڑی چچی کے بین کی آواز اس کے کانوں کے پردے پھاڑے دے رہی تھی۔

"اے اللہ اس رات کو گزار دے" وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ کہتے ہیں کہ سولی پر بھی نیند آجاتی ہے، پھر آخر اسے نیند کیوں نہیں آرہی، کیسی کیسی غلط کہاوتیں مشہور ہو گئیں اور آج تک کسی نے صحیح نہ کیں۔

صبح وہ اٹھی تو تھکن اور صدمے سے نڈھال ہو رہی تھی۔ برآمدے میں دھوپ آگئی تھی اور اماں مائی کے ساتھ ناشتے کی تیاری میں مصروف تھیں۔

وہ حسب معمول اسکول جانے کے لئے تیار ہونے لگی۔ اماں نے اس کی طرف اس طرح دیکھا جیسے کہہ رہی ہوں کہ بھلا اتنے صدمے کی کیا ضرورت ہے۔

وہ اماں اور مائی کے بے حد اصرار کے باوجود ناشتہ کئے بغیر اسکول چلی گئی۔

ایک بجے جب وہ اسکول سے واپس آئی تو دھوپ میں پڑی ہوئی آرام کرسی پر خود کو جیسے گرا دیا اور جب مائی نے اس کے سامنے کھانا رکھ دیا تو وہ اس طرح کھانے لگی جیسے کڑوی روٹی نگل رہی ہو۔ اماں اب تک اپنے کام میں مصروف تھیں۔۔۔ "افوہ سارا دن گزر جاتا ہے مگر کام ختم نہیں ہوتا، کوٹھیوں میں کتنا کام ہوتا ہے، مائی برآمدے میں رکھے ہوئے گملوں میں پانی ڈال دو سوکھے جا رہے ہیں" ۔۔۔ اماں برابر بولے جا رہی تھیں ۔۔۔ "مائی تم نے کمرے میں میز پر کھانا کیوں نہیں لگایا؟ میز کرسی ہو تو آدمی کیا مزے سے کھانا کھاتا ہے، اپنے ہاں کا بھی کیا برا رواج تھا کہ تخت پر بیٹھے کھا رہے ہیں۔"

آج مرے کل دوسرا دن، مرنے والے کو کون روتا ہے۔ آج اماں پر اپنے ہاں کے رواجوں کے عیبوں کا انکشاف ہو رہا تھا۔ اگر یہ کوٹھی نہ ملتی تو پھر یہ

اتنے بہت سے راز کیسے کھلتے۔

کھانا کھا کر والٹن کیمپ جانے کے لئے اُٹھ کھڑی ہوئی۔ اماں نے اسے مڑ کر دیکھا اور کوئی اعتراض کئے بغیر پھر کام میں مشغول ہو گئیں۔

شام جب وہ والٹن کیمپ سے واپس آئی تو کسی قدر پُر سکون تھی۔ والٹن کیمپ میں ڈاکٹر نے اسے کتنے مدھم اور پیار دے لہجے میں سمجھایا تھا۔ اسے تسلی دی تھی اسے وہاں سے جلدی چلے جانے پر مجبور کیا تھا اور پھر نیند کی دو گولیاں دے کر ہدایت کی تھی کہ رات کو ضرور کھالے، اسے نیند کی سخت ضرورت ہے۔

وہ اچھا اور مہربان آدمی ہے ——— رات سونے سے پہلے عالیہ نے نیند کی گولیاں کھاتے ہوئے فیصلہ کیا۔

(۴۸)

اسکول سے آنے کے بعد اس نے دیکھا کہ بستر پر لفافہ پڑا ہے۔ کتنے دن بعد بڑی چچی نے جواب دیا تھا۔ وہ تو ان کے خط سے مایوس ہو گئی تھی لفافہ کھول کر وہ جلدی جلدی پڑھنے لگی ——— پیاری عالیہ۔ تمہارا خط ملا۔ دل قابو میں نہ تھا۔ جو تم کو جواب دے سکتی۔ تم نے دیکھا، تمہارے بڑے چچا کتنے بے مروّت نکلے، میں نے زندگی بھر ان کا ساتھ دیا اور وہ مجھے تنہا چھوڑ گئے۔ تم کو کیسے بتاؤں کہ یہ سب کچھ کیسے ہوا۔ میں تمہارے بڑے چچا کو برابر منع کر رہی تھی کہ دلی مت جاؤ۔ کیا پتہ کہ ابھی کیا عالم ہو۔ مگر وہ نہیں مانے اور نہرو سے ملنے چلے گئے وہاں کسی ہندو نے چپکے سے شہید

کر دیا۔ ہنستے بولتے گئے تھے اور جب آئے تو ہونٹوں پر تالا پڑ چکا تھا وہ تو شکر ہے کہ وہاں کے جاننے والوں نے لاش پہچان لی اور عزت کے ساتھ گھر لے آئے ورنہ آخری دیدار کو بھی ترستی رہ جاتی۔ بیٹی خدا سے دعا کرو کہ اب وہ تمہاری چچی کی لاج رکھ لے اور جلدی سے اٹھا لے۔

نہرو نے تین ہزار روپے دینے کا اعلان کیا تھا مگر تمہارے جمیل بھیا نے یہ امداد لینے سے انکار کر دیا تمہارے جمیل بھیا بہت دن تک بیکار رہے ملازمت ڈھونڈے نہ ملی۔ گھر میں فاقے پڑنے لگے، وہ خدا بھلا کرے تمہارے بڑے چچا کے کانگریسی دوستوں کا جنہوں نے تمہارے جمیل بھیا کو زبردستی اسسٹنٹ جیلر کرا دیا بڑی سفارش سے یہ نوکری ہاتھ لگی اور وہ بھی تمہارے چچا کی خدمت کے صلے میں مل گئی۔ بے خدا "ان" کے دوستوں کو اجر دے۔

کتنے دن ہو گئے، تمہارے بڑے چچا کو سدھارے، مگر اب بھی ایسا محسوس ہوتا ہے کہ بیٹھک سے نکلے چلے آ رہے ہیں۔ کم بخت بوا تم کو اور دلہن کو بہت یاد کرتی ہیں، بہت لاغر ہو گئی ہیں۔ تمہارے بڑے چچا کے مرنے کی خبر سنتے ہی انھوں نے اسرار میاں کو دھکے دیکر نکال دیا تھا۔ پتہ نہیں کہاں چلے گئے آج تک نہ لوٹے،

اگر تمہیں کہیں ملے تو ماں کے کلیجے کا حال سنا دینا۔ اب کتنے دن اور جیوں گی، خالہ۔ ایک بار تو اس کی صورت بھی دیکھ لیتی۔

حیدرآباد دکن پر ہندوستان کا قبضہ ہوتے ہی تمہارے ظفر چچا کراچی چلے گئے، ان کا خط آیا ہے کہ ابھی بیٹھنے کا ٹھکانا بھی نہیں ملا۔ اللہ

اپنا رحم کرے۔ تمھاری نجمہ بہن بھی اپنے گھر خوش نہیں ہیں۔ طلاق لینے کی سوچ رہی ہیں۔ بہت سمجھایا مگر نہیں مانتیں، کہتی ہیں کہ ان کا میاں جاہل ہے، انگریزی کے دو لفظ صحیح نہیں بول سکتا۔ انھیں سخت شرم آتی ہے کہ ان کا شوہر ایسا ہو۔ ان کی سہیلی نے دھوکے سے شادی کرا دی۔ نجمہ کے میاں تو صرف بارہ جماعتیں پڑھے ہیں۔

چھوٹی دلہن کو بہت بہت دعا کہو۔ بس اب جیتی ہوں یہ دنیا ظالم نہیں چھوٹتی ورنہ تمھارے بڑے چچا کے ساتھ ہی اٹھ جاتی۔ خط لکھتی رہا کرو۔

تمھاری بڑی چچی

خط پڑھ کر اس نے کرسی کی پشت سے سر ٹیک دیا۔ بڑے چچا اسرار میاں کو بھی اپنے ساتھ دلی لے گئے ہوتے شاید کسی کو رحم آجاتا اور ایک تیز چھرا ان کی گردن پر بھی پھیر دیتا۔

اماں سے آنسو چھپانے کے لیے اس نے آنکھیں بند کر لیں۔

"کس کا خط ہے؟" اماں نے پوچھا۔

"بڑی چچی کا، آپ کو دعا لکھی ہے۔"

"حد کر دی اتنے دن بعد جواب دیا ہے، وہ ہمیں اپنا سمجھتی کب ہیں، سناؤ کیا لکھا ہے؟"

"خود پڑھ لیجیے اماں، بہت تھک گئی ہوں۔" اس نے آنکھیں کھولے بغیر جواب دیا۔

اماں نے خط پڑھ کر رکھ دیا اور ٹھنڈی سانس بھری ۔۔۔۔ "کیسی بے توفی کی کہ تین ہزار روپے واپس کر دیئے، ایک دکان میں لگا دیتے تو چل نکلتی"

اب تم کہاں ہو گے اسرار میاں ؟ عالیہ دل ہی دل میں پوچھ رہی تھی۔

"خیر کم کمین بوا نے یہ کام خوب کیا کہ اسرار سٹنڈے کو گھر سے نکال دیا مفت خور کسی کام کا بھی نہ تھا، کھا گیا منحوس سب کو"

"اماں" عالیہ نے سُرخ سُرخ آنکھیں کھول کر اماں کو پکارا

"کیا ہے ؟"

"کچھ نہیں" اس نے پھر آنکھیں بند کر لیں۔ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ وہ اپنے گھر کی تباہی کے لیے پوچھے کہ وہ کون لایا تھا۔ وہاں کون سے اسرار میاں تھے۔ ابا کو مسرت کے لیے کون ترسا رہا، مگر وہ یہ سب نہ پوچھ سکی۔ آخر وہ اس کی ماں ہیں۔

وہ بڑے بڑے ٹھنڈی سانسیں بھرتی رہی۔ اماں لوٹوں سے بھر بھر کو کیاریوں میں پانی ڈالنے لگیں۔

جمیل بھیا کیا بھول گئے، اس کے خط کا جواب بھی نہ دیا۔ مگر اب وہ شادی کر رہے ہیں۔ ٹھیک ہے جواب نہیں دیا، یاد نہیں آتی ہوگی، دوری سب کچھ بھلا دیتی ہے ..... کوئی جذبہ اس کے کلیجے کو نوچنے لگا۔

اماں کی آواز پر وہ کھانا کھانے کے لیے اُٹھ گئی ... بڑی چچی نے چھمی کے لیے کچھ لکھا ہی نہیں جانے اس کا کیا حال ہوگا۔ اس کی بٹیا تو اب مزے سے بیٹھنے لگی ہو گی۔

کھانا کھا کر وہ والفن کیمپ جانے کی تیاری کرنے لگی۔ اللہ جانے ظفر چچا حیدر آباد کی جنت سے نکل کر کس حال میں ہوں گے۔

"میں کہتی ہوں کہ کسی دن گھر بھی بیٹھو آخر یہ جب ہو وہ سلسلہ کب تک چلتا

رہے گا۔" لوٹا رکھ کر اماں ایک دم بگڑ اٹھیں۔

"یہ بے ہودہ سلسلہ یوں ہی چلتا رہے گا۔" اس نے بڑی سختی سے جواب دیا۔ اماں ہر وقت اپنے حال میں مگن رہتی ہیں، یہ تک نہیں دیکھتیں کہ آج بڑی چچی کا خط آیا ہے۔ آج اس کے دل پر چھریاں چل رہی ہیں۔

"سکون؟ تم کو سکون ملتا ہے؟ وہ تم کو کیا دے دیتے ہیں جو اس طرح ماری ماری پھر رہی ہو؟" مارے غصے کے اماں کا منھ سرخ ہو رہا تھا۔

"مجھے ان سے کچھ نہیں چاہیے۔ وہ لٹے ہوئے غریب مجھے کیا دے سکتے ہیں، ان کی خدمت کر کے مجھے خوشی ہوتی ہے، اس وقت تو میں ساری دنیا کو بھول جاتی ہوں۔" عالیہ نے جیسے بھرپور مسرت سے آنکھیں موند لیں اسے اس وقت وہ بچیاں یاد آ رہی تھی، جس کی کتابیں امرت سر میں رہ گئی تھیں، اور ان کتابوں کو یاد کر کے اب بھی روتی ہے۔ اس کے بدلے میں اس کو کئی کتابیں دیں مگر وہ ان کتابوں کو نہیں بھولتی۔

"ہوں! تمھارے باپ بھی یہی کہتے تھے کہ مجھے فلاں کام میں مسرت ہوتی ہے، مجھے سکون ملتا ہے، اور تمھارا چچا بھی یہی کہتا تھا۔" اماں اسے گھور رہی تھیں۔

"میں ابا نہیں ہوں اور نہ میں بڑے چچا کی طرح بن سکتی ہوں۔ آپ ان کا نام نہ لیا کریں تو بہتر ہوگا آپ تو مجھے صرف اپنی بیٹی سمجھئے اور بس۔" وہ تیزی سے باہر نکلنے لگی تو اماں نے پھر سے لوٹا اٹھا لیا۔

بہار نے مرجھائے ہوئے پودوں میں جان ڈال دی تھی۔ ننھی ننھی کونپلیں پھوٹ رہی تھیں اور گلاب کے پودے میں دو بڑے بڑے پھول جھول رہے

تھے۔ عالیہ کو ایک دم یاد آیا کہ ایک بار اس نے کیاری سے ایک پھول توڑ کر اپنے بالوں میں لگا لیا تھا مگر جب جمیل بھیا نے اسے بڑے اشتیاق سے دیکھا تھا تو اس نے اپنے بالوں سے پھول کھسوٹ کر کیاری میں پھینک دیا تھا۔

پھاٹک سے باہر جاتے جاتے اس نے ایک پھول توڑ کر بالوں میں لگا لیا۔

شام جب وہ الٹن کیمپ سے واپس آئی تو کپڑے تبدیل کر کے لان میں آ بیٹھی۔ اماں تو سخت ناراض تھیں انھوں نے اسے دیکھتے ہی منھ پھیر لیا تھا۔

پھاٹک کے اس پار سڑک پر کاریں اور تانگے شور مچاتے گزر رہے تھے پھر بھی عالیہ کو ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ ہر طرف سناٹا طاری ہے۔ وہ گھبرا کر ٹہلنے لگی۔ خزاں میں جھڑے ہوئے خشک پتے اب تک گھاس پر پڑے تھے جو اس کی چپلوں کے نیچے آ کر خزاں کی یاد دلا رہے تھے۔

"کیا آج یہیں بیٹھی رہو گی؟" جب اندھیرا چھانے لگا تو اماں نے برآمدے میں آ کر کہا اور پھر الٹے پیروں واپس چلی گئیں۔

اب اماں کا موڈ ٹھیک ہو رہا ہے۔ وہ مرگنڈوں کی پرانی کرسی پر تھک کر بیٹھ گئی۔ اب خاصا اندھیرا چھا گیا تھا۔ پھر بھی اس نے اٹھنے کا نام نہ لیا۔ اب یہ خط و کتابت کا سلسلہ بھی ختم ہو جانا چاہیے۔ کیا فائدہ کہ مسلسل اذیت سہتی رہے، یادیں سب سے زیادہ ظالم ہوتی ہیں اور ــــــ اچانک پھاٹک زور سے کھلا اور کوئی بے تحاشا بھاگتا ہوا اندر آ گیا۔

"کون؟" اس نے گھبرا کر پوچھا۔

بھاگنے والا ایک لمحے کو رک گیا ـــــ "آپ میری ماں ہیں، میری بہن ہیں مجھے چھپ جانے دیجیے میں غریب، مہاجر ہوں، وہ ظالم پولیس مجھے خواہ مخواہ پکڑ

رہی ہے، میں ابھی چلا جاؤں گا۔" آدمی دوڑ کر، میز کے پیچھے چھپ گیا۔

عالیہ خوف کے مارے کرسی میں جم کر رہ گئی۔ اس نے اماں کو آواز دینا چاہی مگر ساری جان کا زور لگانے کے بعد بھی وہ ہونٹ تک نہ ہلا سکی۔

اسی لمحے اماں نے آکر برآمدے کا بلب روشن کر دیا۔ "یہ کھانا کھا لو آ کر" اماں کے لہجے میں ابتک سختی تھی۔

روشنی میں اس نے ہر طرف دیکھا پھر بھی اس سے کچھ نہ بولا گیا۔ اماں پھر چلی گئیں اور وہ ہاتھ بڑھا کر رہ گئی۔ اس نے اُٹھ کر اندر بھاگنا چاہا تو پیروں نے جواب دیدیا۔

میز کے پیچھے بالکل خاموشی تھی۔ عالیہ کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ پتہ نہیں کون سا ڈاکو آچھپا ہو، وہ بڑی مشکل سے اٹھی اور اندر جانا چاہتی تھی کہ ایک دم کھڑبڑ ہوئی اور وہ آدمی نکل آیا وہ باہر بھاگنے والا تھا کہ عالیہ سے اس کی آنکھیں چار ہو گئیں ـــــ "ارے عالیہ بجیا آپ؟" شکیل نے اپنی ننگی ننگی سُرخ آنکھیں جھکا لیں ـــــ "انھوں نے مجھے غریب جان کر گرہ کٹ سمجھ لیا، میں ایسا نہیں ہوں بجیا۔"

عالیہ کو اپنی آنکھوں پر یقین نہ آ رہا تھا۔ سامنے شکیل کھڑا تھا، اس کی قمیص شانے سے پھٹی ہوئی تھی اور بڑھے ہوئے بال ماتھے پر بکھرے ہوئے تھے۔

"اب میں جاتا ہوں بجیا، کہیں وہ مجھے تلاش کرتے اندر نہ آجائیں۔"

"تم کہاں جاؤ گے شکیل، میرے بھیا۔" عالیہ بے قرار ہو کر اس کے لپٹ گئی اور پھر اسے اپنی کرسی پر بٹھا کر جلدی سے برآمدے کی بتی بجھا آئی۔ "

اب تم کہیں نہ جاؤ۔ کہیں وہ ظالم تم کو پکڑ نہ لیں، تم میرے کمرے میں چلو۔"
وہ اسے کھینچتی ہوئی اپنے کمرے میں لے آئی اور برآمدے میں کھلنے والا دروازہ اندر سے بند کر لیا۔

"مجھے جانے دیجئے بجیا۔" وہ اب تک گھبرایا ہوا تھا۔

"میں تم کو کہیں نہ جانے دوں گی، یہ تم نے اپنی کیا حالت بنا رکھی ہے۔ میرے بھیا۔" وہ شکیل کے پھٹے کپڑوں اور لاغر چہرے کو دیکھ کر جیسے بلکی جا رہی تھی۔ "تم یہاں اس حالت میں پھر رہے ہو اور وہاں بڑی چچی تمہارے لئے آدھی موئی ہو گئیں۔" اس نے شکیل کو پلنگ پر بٹھا دیا۔

"اچھا! اماں مجھے یاد کرتی تھیں؟ مجھے اور کون کون یاد کرتا تھا؟ ابا تو مجھے خاک یاد کرتے ہوں گے۔ وہ تو کسی سے مطلب ہی نہ رکھتے تھے، اور چچی اور جمیل بھیا، وہ تو میری خوب برائیاں کرتے ہونگے اس کی آنکھوں میں اشتیاق تھا۔۔۔" میں سخت بھوکا ہوں بجیا، کل سے میں نے کچھ نہیں کھایا۔"

"بڑے چچا تم کو خاک یاد کرتے ہوں گے، ٹھیک ہے شکیل میرے بھیا!"
عالیہ کا گلا زندھنے لگا۔ "چلو تم کو کھانا کھلاؤں پھر باتیں ہوں گی۔" اس نے شکیل کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"آپ یہاں کب آئیں بجیا؟" ساتھ چلتے ہوئے شکیل نے پوچھا۔

"پاکستان بننے کے تھوڑے دن بعد آ گئی تھی۔"

وہ اسے کھانے کے کمرے میں لے گئی جہاں اماں دودھ کر اکیلی بیٹھی بڑی نزاکت سے کھانا کھا رہی تھیں اور رہ گئی آنکھیں پھاڑے شکیل کو دیکھ رہی

تھی۔ اماں نے نظریں کبھی نہ اُٹھائیں۔

"اماں شکیل آیا ہے"۔

"کون شکیل"۔ اماں نے نظریں اُٹھائیں"۔ ارے تم کب آئے پاکستان؟"
اماں نے خوش ہو کر اس کی طرف دیکھا۔

"تھوڑے دن ہوئے چھوٹی چچی" اور وہ سب غلط ہے، وہ واہیات لوگ یونہی خواہ مخواہ پردیسی جان کر ـــــ" شکیل اماں کے سامنے بھی اپنی صفائی پیش کر رہا تھا۔ شاید اسے خیال ہو گا کہ عالیہ ضرور سب کچھ بتا دیگی مگر عالیہ نے تو جلدی سے اس کی بات کاٹ دی" اماں شکیل بیچارہ قافلوں کے ساتھ آیا ہے ادھر دُور شہر کے اندر کہیں ٹھہرا ہے، ابھی تو بیچارے کو کچھ پتہ نہیں اس لیئے اِدھر اُدھر محنت مزدوری کر کے پیٹ بھر رہا ہے۔ اپنا کوئی نہ ہو تو بیچارے کی یہی حالت ہو جاتی ہے"۔ اس نے شکیل کے لیے لوکر سی کھینچ دی۔

"اب اگر ہمارے پاس جگہ ہوتی تو دیدیتے، اتنی سی کوٹھی ہے"۔ اماں نے چھ کمروں کی کوٹھی کو اتنا سا بنا دیا، ان کے لہجے میں سخت بے اعتنائی تھی۔ وہ شکیل کو ناقدرانہ نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔

"اب یہ کافی عرصے یہیں میرے پاس ٹھہرے گا۔ عالیہ نے سخت اور فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

اماں نے گھور کر عالیہ کو دیکھا اور بے تعلقی سے کھانا کھانے لگیں۔ شکیل بھکوں کی طرح جلدی جلدی کھا رہا تھا۔ وہ روٹی اس طرح اُٹھاتا جیسے چھپٹ رہا ہو ـــــ "بہت دن بعد گھر کا کھانا ملا ہے مزا آگیا بجیا"۔

اماں سب سے پہلے اٹھ کر چلی گئیں، جاتے ہوئے انھوں نے شکیل اور عالیہ کی طرف دیکھنا بھی گوارہ نہ کیا۔ عالیہ بیٹھی شکیل کو کھاتے دیکھتی رہی اور یہ سوچ سوچ کر دہلتی رہی کہ اگر اس وقت پولیس اسے پکڑ ہی لیتی تو کیا ہوتا۔ کھانے کے بعد وہ شکیل کو اپنے کمرے میں لے آئی۔

"دروازہ بند کر لیجیے بجیا مجھے ڈر لگتا ہے"۔ شکیل بڑے آرام سے عالیہ کے بستر پر لیٹ گیا۔

"یہ تمھارا کمرہ ہے، ٹھیک رہے گا نہ؟" اس نے پوچھا۔

"اب تو ابا کا ملک آزاد ہو گیا، اب وہ کیا کرتے ہیں نہرو نے ان کو کون سی جاگیر دیدی؟" شکیل نے پوچھا۔ اس کی آنکھوں میں کتنی نفرت تھی۔

"بڑے چچا؟" عالیہ کی آواز کانپ گئی۔ "وہ تو اس دنیا سے سدھار گئے شکیل، میرے بھیا انھیں تو کسی ہندو نے فساد میں شہید کر دیا۔

"کیا؟" اس نے تکیے میں منھ چھپا لیا اور اس کا سارا جسم ہولے ہولے لرزنے لگا۔

تھوڑی دیر بعد عالیہ نے اپنے آنسو پوچھ کر اس کا سر اٹھایا تو سارا تکیہ بھیگا ہوا تھا۔

"مجھے اس وقت اماں یاد آ رہی ہیں بجیا"۔ وہ دو سال کے بچوں کی طرح منمنایا۔

"اب تم ان کے پاس چلے جاؤ شکیل، ان کی زندگی میں بہار آ جائے گی۔ بڑے چچا کی موت نے ان کو کہیں کا نہیں رکھا، تمھیں دیکھ کر وہ تھوڑے دن اور جی لیں گی"۔

"ابا کا مر جانا ہی ٹھیک ہوا بجیا! انھوں نے کسی کے لئے کچھ نہ کیا، اب میں گھر جا کر کیا کروں۔ وہ جمیل بھیا مجھے طعنے دیدے کر زندگی حرام کر دیں گے۔ میرے لئے تو اب بھی اس گھر میں کچھ نہ ہوگا یہاں کھا کما لوں گا۔" اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔

مگر اس طرح تو نہ کماؤ کہ پولیس تمہارے پیچھے پیچھے پھرے۔ تم بہت بے رحم ہو شکیل میرے بھیّا!"

"میں کچھ نہیں کرتا بجیا، پولیس بہت بے رحم ہے وہ غریبوں کو جینے نہیں دیتی۔ مجھے اماں یاد آرہی ہیں۔"

"اگر تم بڑی چچی کے پاس نہیں جاتے تو پھر میرے پاس رہنا ہوگا، میں تم کو اب کہیں نہ جانے دونگی اب میں ملازم ہو گئی ہوں۔۔ میں تم کو بھی اسکول میں داخل کرا دوں گی۔ تم آرام سے پڑھو، اس طرح زندگی بن جائے گی میں کل ہی بڑی چچی کو لکھ دوں گی کہ شکیل میرے پاس ہے، ہم بھائی بہن بڑے مزے سے رہتے ہیں۔"

"اب کیا پڑھوں گا بجیا، جو پڑھا تھا وہ بھی بھلا دیا۔ اور بجیا، ہمارے گھر کے سامنے والا اسکول تو اسی طرح تھا نا؟"

"ہاں اسی طرح تھا۔ جب پڑھنا شروع کرو گے تو سب یاد آجائے گا۔

"اب صبح باتیں ہونگی بجیا، مجھے نیند آرہی ہے۔" وہ پھر لیٹ گیا۔ "بس اب آپ اُٹھ جائیے میں اندر سے دروازہ بند کر لوں۔"

"دروازہ بند کرلو گے تو گرمی نہیں لگے گی؟"

"نہیں بجیا میں دروازہ بند کر دوں گا، مجھے ڈر لگتا ہے۔"

عالیہ آکر برآمدے میں لیٹ گئی۔ پاس کے پلنگ پر اماں بڑی بے خبر سو رہی تھیں۔ اسے ان پر رحم آنے لگا۔ خواہ مخواہ آج انہیں بد زبانی کی۔

وہ بڑی دیر تک یوں ہی لیٹی رہی اندھیرے میں اِدھر اُدھر دیکھتی رہی۔ شکیل کے بھاگ کر آنے اور چھپنے کے منظر نے اس کی نیند کو لوٹ لیا تھا۔ وہ سب سمجھ گئی تھی۔ اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اب کسی بھی صورت میں شکیل کو نہ جانے دیگی، چاہے اس سلسلہ میں اماں سے کتنی ہی دشمنی مول لینی پڑے۔

رات گئے وہ سو گئی اور جب صبح اُٹھی تو شکیل کے کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ ”کیا شکیل غسلخانے میں ہے؟“ اس نے اماں سے پوچھا۔

”میں نے تو صبح اُٹھ کر اسے دیکھا نہیں، شاید چلا ہی گیا۔ کام جو کرنا ہوا، مزدور آدمی ٹھہرا۔“ اماں نے بڑے سکون سے جواب دیا۔

سب جھوٹ ہے۔ صبح اس نے جانے کو کہا ہوگا اور اماں نے اسے اجازت دیدی ہوگی۔“ اس نے آپ سے جانے کو کہا ہوگا۔ اور آپ نے خوش ہو کر اجازت دیدی ہوگی“۔ عالیہ نے غصہ سے کہا۔

”تم بولا گئی ہو، مجھ سے بات مت کرو، ورنہ اپنا سر پھوڑ لوں گی۔“ اماں باورچی خانے میں چلی گئیں۔

پتہ نہیں اب کب آئے گا، اماں کی اجازت سے کتنا مایوس ہو کر گیا ہوگا۔ اماں نے کیسا ظلم کیا۔ ان کے سینے میں دل نہیں پتھر ہے۔ وہ تھوڑی دیر تک پلنگ سے پاؤں لٹکائے گم سم بیٹھی رہی۔

منھ ہاتھ دھو کر جب وہ اپنے کمرے میں گئی تو کپڑے تبدیل کرنے کے لئے اسے الماری کا تالا کھولنے کی ضرورت نہ پڑی۔ ٹوٹا ہوا تالا چھوتے ہی کھل گیا۔ پرس کھلا پڑا تھا اور اس کی جمع جتھو سے پچاس روپے غائب تھے۔

شکیل میرے بھیا، تم سے اب کبھی ملاقات نہ ہوگی۔ اب تم سدا کے لئے کھو گئے، اب تم کو کون پا سکتا ہے؟"

(۴۹)

بڑی چچی کا خط سامنے پڑا تھا اور وہ نمے چادر تنے پر ملول بیٹھی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ اب چھمی کی زندگی کا کیا بنے گا۔ آخر اس نے اپنی ساس اور اپنے شوہر کے ساتھ پاکستان آنے سے یوں انکار کیا۔ آخر اسے یہ کیا سوجھی تھی۔ جب پاکستان کے لئے وہ ہاتھوں اچھل اچھل کر نعرے لگاتی تھی اس پاکستان میں وہ کیوں نہ آئی؟"

اس نے ایک بار پھر خط اٹھا لیا اور اس حصّے کو پڑھنے لگی جس میں چھمی کے متعلق لکھا تھا۔۔ چھمی نے اپنے میاں کے ساتھ پاکستان جانے سے انکار کر دیا اور جب اس سے ضد کی تو لڑائی پر آمادہ ہو گئی۔ جھگڑا یہاں تک بڑھا کہ چھمی نے اپنی ساس کو بال پکڑ کر خوب مارا اور اس کی ساس نے اپنے بیٹے سے اسی دم طلاق دلوا کر مع لڑکی کے یہاں بھجوا دیا۔ انھوں نے جانے سے پہلے مجھے پیغام بھجوایا تھا کہ اب اپنی اس بے لگام لڑکی کا کسی بھنگی سے کاح کر دو ہمارے بیٹے کو تو کراچی میں چاند جیسی دلہن مل جائے گی۔ اب چھمی جب سے یہاں

ہے بالکل چپ ہے، اپنی بچی کو سینے سے لگائے دم بخود پڑی رہتی ہے۔ اس چھمی نے ہمیشہ اپنے ساتھ دشمنی کی۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ اس کا کیا انجام ہوگا میں اسے دیکھتی ہوں تو کلیجہ منھ کو آتا ہے۔

"اماں چھمی کو طلاق دیکر اس کے میاں کراچی آگئے"۔ اماں کو قریب آتے دیکھ کر عالیہ نے اطلاع دی۔

"ایں" اماں نے حیرت سے عالیہ کی طرف دیکھا اور پھر خط اٹھا کر پڑھنے لگیں

اب بیچاری چھمی کیا کرے گی۔ عالیہ سوچ رہی تھی۔

"ٹھیک ہی کیا ان لوگوں نے، بھلا ایسی لڑکی سے کوئی نباہ کر سکتا تھا۔ غضب خدا کا، اور ساس میاں دونوں کو پیٹ کر رکھ دیا"۔ اماں نے خط میز پر ڈالدیا اور کمرے کا اڑی جھری سامان ٹھیک کرنے لگیں۔

"ہوں!" عالیہ کمرے سے باہر نکل آئی۔ والٹن کیمپ سے آکر اس نے کپڑے بھی نہ تبدیل کیے تھے۔ مائی نے اس کے ہاتھ میں چائے کی پیالی پکڑا دی تو وہ کھڑے کھڑے پینے لگی ــــــ اسے کیا ہو گیا ہے کمرے میں ہر چیز بکھیر دیتی ہے اور اماں ٹھیک کرتی پھرتی ہیں۔ اتنی لا پروائی بھی کس کام کی، اماں کیا سوچتی ہونگی۔

چائے کی خالی پیالی مائی کو تھما کر وہ لان میں آگئی جون کی شام بھی کس قدر تپ رہی تھی۔ اونچے اونچے درخت بالکل ساکت کھڑے تھے، ایک پتہ تک نہ ہل رہا تھا۔ وہ دھیرے دھیرے خشک گھاس پر ٹہلنے لگی۔ اب تو تنہائی اور اداسی کا شدید احساس ہر وقت ستانے لگا تھا۔ وہ اپنی اس لگی بندھی زندگی سے کس قدر عاجز آگئی تھی۔

اس وقت بھی جب وہ چھمی کی برباد زندگی کا ماتم کر چکی تھی تو پھر اپنی برباد

زندگی کے لئے سوچنے لگی تھی۔ اب وہ کیا کرے؟ زندگی کس طرح کٹے ــــ سوچتے سوچتے اسے چند لمحوں کے لئے ڈاکٹر کا خیال آگیا۔ عالیہ نے اس کی آج کی باتوں کو یاد کرنے کی کوشش کی اور پھر اس طرح جی اچاٹ ہو گیا جیسے کوئی عجیب سی حرکت کرنے جا رہی ہو ــــ وہ باتیں ہی کیا کرتا ہے۔ ٹھیک ہے وہ اچھا آدمی ہے مگر اسے باتیں کرنی ہی کب آتی ہیں؟ کوٹھی، کار، پریکٹس کا حال اور بس ــــ کوٹھی تو ماموں نے اسے بھی دلا دی، اور رہی کار تو وہ روز بس پر جاتی ہے۔ بس یہی فرق ہے نا کہ وہ کار سے بڑی ہوتی ہے۔ اور کسی ایک شخص کی ملکیت نہیں ہوتی۔

"اب کھانا کھا لو، یہاں اندھیرے میں اکیلی بیٹھی کیا کر رہی ہو؟" اماں اس کے پاس آ کھڑی ہوئیں تو اسے احساس ہوا کہ واقعی اندھیرا پھیل گیا ہے وہ اماں کے ساتھ ہو لی۔

"تم ہر وقت چپ رہتی ہو، میں نے تمہارے ماموں کو لکھ دیا ہے کہ۔" اماں نے چلتے ہوئے کہا "کہ اب تمہاری شادی کا بندوبست کر دیں۔"

"اچھا، مجھے آج معلوم ہوا کہ میں اسی لئے اُداس رہتی ہوں۔" وہ اس سچائی پر جھلا گئی۔ "مگر آپ نے ماموں کو یہ حق کب سے دیدیا؟ میں تو ان کو ماموں بھی نہیں مانتی، مجھے ان سے کوئی مطلب نہیں۔ میں شادی نہیں کرونگی!"

اماں نے اسے ملامت بھری نظروں سے دیکھا مگر چپ رہیں۔ ادھر کچھ دنوں سے انھوں نے عالیہ کو ڈانٹنا ڈپٹنا اور اس سے لڑنا چھوڑ دیا تھا۔

دونوں خاموشی سے کھانا کھاتی رہیں۔ عالیہ کا جی بھر رہا تھا۔ پھر بھی وہ ضبط کیے بیٹھی کھاتی رہی اور اماں جانے کیا سوچتی رہیں۔

(۵۰)

اسکول سے واپسی پر اس نے دیکھا کہ میز پر جیمی کا خط پڑا ہے۔ جسے اماں کھول کر پڑھ چکی تھیں۔ خط کا ایک صفحہ کمرے کے فرش پر پڑا تھا اسے ذرا سا غصہ آیا اور پھر جلدی جلدی خط پڑھنے لگی۔

پیاری بجیا تسلیم۔ آپ کو گئے ایک سال ہونے کو آ رہا ہے مگر آپ نے کبھی مجھے یاد نہ کیا۔ ٹھیک ہے میں نے بھی آپ کو خط نہ لکھا۔ مگر میں آپ کو کبھی نہ بھولی۔ میں نے تو آپ کو ہر دکھ اور خوشی میں یاد کیا اور جب میں بہت خوش ہوں، میری زندگی میں بہار آ گئی ہے تب بھی میں آپ کو یاد کر رہی ہوں۔ بجیا کاش آپ یہاں ہوتیں تو دیکھتیں کہ میں کتنا خوش ہوں۔ آپ کے جمیل بھیا نے مجھے اپنا بنا لیا ہے، مجھے اب تک یقین نہیں آتا کہ میں ان کی بن گئی ہوں۔ طلاق کے بعد جب میں اس گھر میں آ کر پڑ گئی تھی تو ایسی بات سوچ بھی نہ سکتی تھی۔ بہت دن پہلے جب انھوں نے مجھ سے آنکھیں پھیر لی تھیں تو مجھے اپنی بدنصیبی کا یقین ہو گیا تھا۔ بجیا اب آپ کو یہ بھی بتا دوں کہ میں اسی لیے پاکستان نہیں گئی تھی۔ وہ مجھے اتنی دور لے جا رہے تھے جہاں سے پلٹ کر پھر میں جمیل کو نہ دیکھ سکتی۔ وہ ظالم لوگ مجھ سے سب کچھ چھینے لے رہے تھے۔

بجیا، مزے کی بات تو یہ ہے کہ بڑی چچی جمیل کے لیے رشتہ تلاش کر رہی تھیں۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ جمیل کی دلہن کی خدمت کر کے زندگی گزار لوں گی، کبھی تو جمیل کو احساس ہوگا، وہ پچھتائیں گے، انھیں افسوس ہوگا اس وقت میں سمجھوں گی کہ مجھے محبت میں کامیابی ہو گئی۔ میں نے انھیں پا لیا۔

مگر اس کی نوبت نہ آئی بجیا اور اس دن جب بڑی چچی لڑکی کے گھر آخری جواب لینے جا رہی تھیں تو رات کو جمیل بھیا میرے پاس آ بیٹھے اور میری بٹیا کو گود میں لے کر کھلانے لگے۔ میں چپ بیٹھی رہی۔ جب سے طلاق لے کر آئی تھی انھوں نے مجھ سے بات بھی نہ کی تھی۔ میں کیا منہ لے کر ان سے بات کرتی۔ آپ ہی پوچھنے لگے کہ تم پاکستان کیوں نہیں گئیں؟ بجیا، میں انھیں کیا جواب دیتی۔ مارے دکھ کے کلیجہ پھٹ رہا تھا کہ جس کی خاطر اتنا سب کچھ کیا وہ یہ بھی نہیں جانتا۔ میں رونے لگی تو وہ ایک دم بے چین ہو گئے۔ اور مجھے لپٹا لیا اور میری بٹیا سے پوچھنے لگے کہ تیرا باپ بن جاؤں؟ پھر مجھ سے بولے کہ چچی تمہاری محبت مجھ پر قرض ہے۔ اب اس قرض سے نجات پا لوں گا ـــ وہ میرے آنسو پونچھ کر نیچے چلے گئے اور دوسرے دن بڑی چچی نے میرے ہاتھوں میں مہندی لگا کر مجھے دلہن بنا دیا۔

اب میں بہت خوش ہوں بجیا، جمیل میری فکر رکھتے ہیں میری بٹیا کو بہت چاہتے ہیں، بجیا، آپ کو ایک بات بتاؤں۔ جب بٹیا ہوئی تھی تو میں نے یہ سوچا ہی نہ تھا کہ یہ جمیل کی بیٹی نہیں ہے۔

بڑی چچی بہت خوش ہیں، میں ان کی خوب خدمت کرتی ہوں۔ کریمن بوا بھی بہت خوش ہیں۔ کہتی ہیں کہ اپنا خون اپنوں میں آ گیا۔ ہر دم بٹیا کو لپٹائے پھرتی ہیں آپ کو بہت یاد کرتی ہیں اب گھر کی بڑی اچھی حالت ہے بس بڑی چچی کو شکیل بہت یاد آتا ہے۔ اچھا بجیا اب رخصت ہوتی ہوں۔ اللہ کرے میری بجیا کو بھی چاند جیسا دولہا ملے بجیا اب آپ بھی جلدی سے شادی کر لیجئے! چھوٹی چچی کو آداب کہیئے۔

آپ کی پیاری چھمی

خط ختم کر کے وہ اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔ وہ اس وقت کتنی خالی اور ویران ہو رہی تھی۔ "بڑا اچھا ہوا چھمی کی زندگی بن گئی" اس نے ایسی آواز میں کہا جو اس کی اپنی نہیں تھی۔

"اور کیا ملتا جمیل میاں کو، بڑی ہوئی چھمی ہی ملنا تھی"۔ اماں نے بڑے سکون سے کہا۔

عالیہ خاموشی سے اپنے کمرے میں جا کر لیٹ گئی اور یوں ہی بے مقصد اِدھر اُدھر دیکھنے لگی پھر تھوڑی دیر بعد اٹھ کر والٹن کیمپ جانے کے لئے تیار ہونے لگی۔

(۱۵)

آج ڈاکٹر نے اس سے بڑی التجا سے شادی کی درخواست کی تھی۔ زمین مکان سب اس کے نام لکھنے کے لئے کہا تھا۔ ساری زندگی اس کے قدموں پر گزارنے کا وعدہ کیا تھا۔ اور جب وہ یہ سب کر رہا تھا تو ایک لمحے کو اس کا جی چاہا کہ وہ ہاں کر دے، وہ اس سائے تلے بیٹھ جائے مگر جب وہ اقرار کرنا چاہتی تھی تو اسے بڑا عجیب سا لگ رہا تھا۔ کار، کوٹھی، بینک بیلنس اور یہ ڈاکٹر جو والٹن کیمپ میں لٹے ہوئے انسانوں کا علاج کر کے روپے کماتا ہے ــــ بس اس نے یہی چاہا تھا؟ کیا اس کا معیار یہی شخص تھا؟ اور وہ جانے کس جذبے کے تحت وہاں سے "نہیں نہیں" کہتی بھاگ آئی تھی اور اب اپنے گھر میں پڑی سوچ رہی تھی کہ آخر وہ چاہتی کیا ہے ادھر تو اتنے دن ہو گئے نفے کر اسے جمیل بھیا کی یاد کبھی نہ آئی تھی اس نے بڑی چچی کے خطوں کا جواب

کبھی نہ دیا تھا۔ اس نے تو وہاں سے تمام رشتے توڑ لیے تھے اسے اب کوئی دلچسپی نہ محسوس ہوتی تھی۔

بادل بڑے زور سے گھر کر آ گئے تھے۔ وہ کمرے سے نکل باہر لان میں آ گئی بارشوں نے گھاس کو گھنا اور سبز کر دیا تھا۔ بھیگی بھیگی ہوا میں ٹہلتے ٹہلتے اس نے دیکھا کہ پھاٹک کے پاس کوئی شخص کھڑا اسے دیکھ رہا ہے۔

"میں اندر آ جاؤں عالیہ بی بی؟" وہ آگے بڑھنے لگا۔

چالیس بیالیس سال کی ایک پرکشش شخصیت اس کے سامنے کھڑی تھی عالیہ نے اسے حیران نظروں سے دیکھا۔ جانے کہاں دیکھا ہے، کس سے ملتی صورت ہے۔ اس نے اپنے ذہن پر زور ڈالا۔ "آپ کون ہیں؟" آخر اس نے پوچھا۔

"میں صفدر ہوں۔ تم نے پہچانا نہیں عالیہ بی بی؟ یہ سامنے والی کوٹھی میں آتا جاتا تھا آج انھوں نے تمھارے ماموں کا ذکر کیا اور بتایا کہ ان کی بہن یہاں سامنے رہتی ہیں۔ میں ضبط نہ کر سکا تم سے ملنے کو تڑپ گیا چچی کہاں ہیں؟ مگر خیر انھیں میرے آنے کی اطلاع نہ دو،" وہ منمنائے۔

"صفدر بھائی!" عالیہ نے بمشکل آواز نکالی۔ ماضی اس کے سامنے ماتم کرتا آ گیا۔ "اچھا تو آپ اب آئے ہیں بیٹھ جائیے، آپ کو کیا کام ہے؟" عالیہ نے سرد مہری سے کہا۔

"عالیہ بی بی، اتنی مدت گزر گئی۔ بارہ تیرہ سال کا عرصہ، اس کے بعد بھی میرے لیے تمھارے دل سے نفرت نہ گئی۔ مگر میں غلط کہہ رہا ہوں تم تو مجھ سے نفرت نہ کرتی تھیں۔ تمھیں یاد ہے نہ؟ تم بھول تو نہیں گئیں؟"

بارہ تیرہ سال گزرنے کے بعد بھی ان کی آواز میں کوئی فرق نہ آیا تھا۔ وہی لجاجت وہی بیچارگی۔

آپ کہاں رہتے ہیں؟ آپ کے بیوی بچے کہاں ہیں؟" عالیہ نے پوچھا وہ ان سے باتیں کرنے پر مجبور ہو گئی تھی۔ ان کی آواز کی لجاجت نے جیسے اس کا دل پگھلا دیا تھا۔ اسے یاد آ رہا ہے کہ کبھی اس شخص نے اس کے گھر میں زندگی کے بدترین دن گزارے ہیں۔

"میرے بیوی بچے؟" وہ بے بسی سے ہنسے "تہمینہ کے بعد میری زندگی میں کوئی عورت داخل نہیں ہوئی مجھے اس کے لئے بتاؤ عالیہ بی بی۔"

جب آپ تہمینہ آپا کو چھوڑ کر چلے گئے اور جب آپ نے اسے کبھی نہ پوچھا اور صرف ایک خط لکھ کر اسے مر جانے پر مجبور کر دیا تو اب میں آپ کو کیا بتاؤں، اب آپ یہ معلوم کر کے خوش ہونا چاہتے ہیں کہ اس نے زہر کھا لیا تھا۔ جمیل بھیا کی بننے سے انکار کر دیا تھا۔ وہ بے وقوف تھی اس لئے مر گئی۔ آپ دانا تھے اس لئے زندہ رہے اور آج اتنی مدت بعد مجھے ماضی کی یاد دلانے کے لئے میرے سامنے بیٹھے ہیں۔"

"میں زندہ ضرور ہوں مگر مرے سے بھی بدتر۔ تمہارا خیال ہے کہ اگر میں وہاں ہوتا تو مجھے چچی اپنا بنانا پسند کرتیں؟ ایسا ناممکن تھا بھرا پُرا گھر تباہ ہو جاتا اسی لئے میں راہ سے ہٹ گیا۔ میں نے روپے لینا بھی بند کر دیئے تھے۔ تم سوچ نہیں سکتیں کہ اس کے بعد زندہ رہنے کے لئے مجھے کیا کچھ کرنا پڑا۔ بہر حال میرا ضمیر صاف ہے۔ میں سب کام کرتا رہا اور اس کے بدلے میں بڑے بھیا کی طرح جیل کاٹتا رہا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ تہمینہ مجھے بھولے گی نہیں

اور جان دے دیگی"۔۔۔ ان کی آواز یادوں کے بوجھ سے کانپنے لگی تو وہ خاموش ہو گئے اور ادھر اُدھر دیکھنے لگے۔

"اب آپ یہاں کیا کر رہے ہیں؟ کچھ تو اپنے لئے بتائیے۔ پرانی باتوں کو نہ اُکھیڑیئے، اب مجھ میں برداشت کی طاقت نہیں رہی"۔ وہ اپنے آنسو پینے کی کوشش کر رہی تھی۔

ذرا دیر کے لئے بالکل خاموشی چھا گئی۔ عالیہ سر جھکائے بیٹھی تھی بیتے ہوئے زمانے کی ایک ایک بات اسے یاد آ رہی تھی اسے خواہ مخواہ صفدر بھائی سے بے پناہ ہمدردی محسوس ہو رہی تھی۔ آخر ان کا کیا قصور تھا۔ آپا کمزور تھیں وہ اپنی بات نہ منوا سکتی تھیں اس لئے اماں نے گھر کو تباہ کر دیا۔

عالیہ نے سر اٹھا کر دیکھا تو صفدر بھائی اسے بڑے اشتیاق اور پیار سے دیکھ رہے تھے کچھ اس طرح عالیہ کی نظریں جھک گئیں۔ اور وہ بھی گھبرا گئے۔

"مجھے اپنے لئے بتائیے"۔ اس نے پھر کہا۔

"میں اپنے لئے کیا بتاؤں؟ یہاں آنے کے بعد دو بار سیفٹی ایکٹ کے تحت جیل جا چکا ہوں اور اب تھک سا گیا ہوں۔ پر اب بھی یہی چاہتا ہوں کہ تھکوں نہیں، زندہ رہنے کے لئے جد وجہد کرتا رہوں اور ۔۔۔۔۔۔ وہ کچھ کہتے کہتے رک گئے۔

ذرا دیر کے لئے پھر خاموشی چھا گئی۔ بڑی بے ڈھنگی سی خاموشی، جیسے کسی کی سمجھ میں نہ آ رہا ہو کہ کیا بات کرے۔ آج عالیہ کے سامنے وہ شخص بیٹھا تھا۔ جس نے مدتوں اس گھر میں عذاب سہے۔ تھے گناہوں سے پہلے در رخ

کے مزے جھیل لئے تھے، جیسے چھیچھڑوں کا قیمہ اور ڈھیروں پانی ملا دو دھ دیا جاتا جسے کبھی کبھی دعوتوں کا باسی سڑا ہوا کھانا کھلا کر اس کی موت کی دعائیں مانگی جاتیں۔ اس کا تصور صرف یہی تھا کہ وہ غریب باپ کا بیٹا تھا کہتے ہیں کہ حشر کے روز ماں کے نام سے پکارا جائے گا۔ کاش صفدر بھائی کے لئے بھی یہ دنیا روز حشر ہی رہتی، انھیں جاگیردار کی بیٹی سلمہ پھوپھی کے نام سے یاد کیا جاتا۔ پھر تو یقیناً ان کی قیمت بڑھ جاتی۔

سوچتے سوچتے اس نے صفدر بھائی کی طرف دیکھا، وہ آنکھیں بند کئے کرسی کی پشت سے سر ٹیکے جانے کیا سوچ رہے تھے۔ اس وقت وہ اسے بڑے مظلوم نظر آرہے تھے۔ بالکل پہلے جیسے صفدر بھائی۔ اسے یاد آیا کہ جب وہ گھر کے لڑائی جھگڑوں سے ہراساں ہو کر منھ بسورتی پھرتی تو یہی صفدر بھائی اس کو خوشیوں کی راہ دکھاتے اور اس کی خاطر اماں کی تیز گھورتی نظروں کے تیر اپنے کلیجے کے پار کر لیتے۔

اس نے پھر ان کی طرف دیکھا تو وہ اسے بڑے پیار سے تک رہے تھے کچھ ایسی عجیب سی نظروں کہ وہ بوکھلا کر رہ گئی اور صفدر بھائی جھینپ گئے۔"

عالیہ بی بی مجھے آج بھی تہمینہ سے اسی طرح محبت ہے" آج جب یہاں بیٹھا ہوں تو جانے کیا کیا یاد آرہا ہے۔ تم تو بڑی ہو کر بالکل تہمینہ جیسی لگنے لگی ہو، ہو بہو تہمینہ، تمھیں دیکھ کر خیال ہی نہیں آتا کہ وہ مر گئی ہے۔"

وہ کوئی جواب نہ دے سکی۔ بادلوں سے لدی ٹھنڈی شام اداس لگ رہی تھی۔ اس نے صفدر بھائی کو غور سے دیکھا جن کی آنکھوں سے دو آنسو ڈھلک کر رخساروں پر بہہ رہے تھے کیا سچ مچ صفدر بھائی آج۔

تک تہمینہ کو اسی طرح چاہتے ہیں؟ اور کیا اسی لئے ان کی زندگی میں کوئی عورت نہ آسکی؟ اور آج وہ اس کو صرف اس لئے اتنے پیار سے دیکھ رہے ہیں کہ وہ تہمینہ جیسی دکھائی دیتی ہے؟ عالیہ کو یاد آیا کہ صفدر بھائی تہمینہ کو ایسی نظروں سے چھپے چوری دیکھا کرتے تھے کیا محبت اتنے دنوں تک بھی زندہ رہتی ہے؟ اب صفدر بھائی کتنے تھک چکے ہیں، کتنے بہت سے بال سفید ہو گئے ہیں۔ شاید انھوں نے کبھی سکھ کی سانس نہ لی ہوگی۔"

صفدر بھائی کیا سچ مچ میں تہمینہ آپا جیسی لگتی ہوں؟ اس نے اچانک سوال کیا اور پھر اپنے سوال پر خود ہی گھبرا گئی۔

"ہاں بالکل اسی جیسی" — وہ پھر اسے عجیب نظروں سے دیکھنے لگے "میں بار بار بھول جاتا ہوں کہ تم وہ نہیں ہو اگر تم تہمینہ ہوتیں تو مجھے اپنے دل میں چھپا لیتیں، مجھے زندگی کی خوشیاں دیدیتیں" وہ جیسے خواب میں بولنے لگے۔ تم تہمینہ بن جاؤ، عالیہ، تم میری بن جاؤ، میں تھک گیا ہوں" — وہ اٹھ کر اس پر جھک گئے" تم میرا ساتھ دیدو، تہمینہ کہتی تھی کہ میں جو کچھ بھی کروں گا وہ میرا ساتھ دیگی اور کیا کچھ کہتی تھی" — وہ جیسے ہوش میں آکر بیٹھ گئے۔

عالیہ نے آنکھیں موند لیں، وہ کچھ ایسی کیفیت میں ڈوبی ہوئی تھی جیسے کسی دلہن کو پہلی بار اس کے دولہا کے کمرے میں لے جایا جا رہا ہو۔ اس کے کانوں میں آندھیوں جیسی سائیں سائیں ہو رہی تھی۔ پتہ نہیں صفدر بھائی کرسی پر بیٹھنے کے بعد اور کیا کہتے رہے اس نے سنا ہی نہیں۔ وہ بالکل بہری ہو رہی تھی۔

"کیا آج اٹھنے کا ارادہ نہیں ہے" اماں برآمدے میں آکر کہہ رہی تھیں۔

اور یہ کون بیٹھا ہے وہاں وہ پاس آگئیں۔

عالیہ نے ہوش میں آکر ان کی طرف دیکھا۔ وہ صفدر بھائی کو پہچاننے کی کوشش کر رہی تھیں۔

"السلام علیکم چچی، صفدر بھائی منمنائے" ان کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔

"تم ۔۔۔ ؟ اماں پہچان کر زور سے ہاتھ مٹکانے لگیں" "تم یہاں کس لئے آئے ہو۔ اس گھر کا پیچھا نہیں چھوڑو گے کبھی؟ سب کچھ تباہ ہو گیا۔ تم نے اب کیا چھوڑا ہے؟"

"میں ۔ میں ملنے آیا ہوں، آپ لوگوں کو دیکھنے کے لئے جی چاہ رہا تھا ابھی چلا جاؤں گا چچی۔ انھوں نے عالیہ کو الوداعی نظروں سے دیکھا تو اسے اپنا کلیجہ پھٹتا ہوا محسوس ہونے لگا۔

"یہ نہیں جائیں گے اماں، میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ یہ ہمیشہ میرے پاس رہیں گے، آپ ہم دونوں کو ایک کر دیجئے"، عالیہ نے نظریں جھکا کر بڑے عزم سے کہا۔

"افوہ! لعنتی، تم اتنی دیر سے یہاں بیٹھے عالیہ کو کون سی پٹی پڑھا رہے ہو ۔۔۔ مارے غصے کے اماں کی آنکھیں ابل پڑ رہی تھیں ۔۔۔ "تم ابھی یہاں سے نکل جاؤ"۔

"میں تہمینہ آپا کی طرح گونگی نہیں ہوں اماں، یہ نہیں جائیں گے، عالیہ کو اپنے گلے میں کانٹے چبھتے معلوم ہو رہے تھے۔

"اماں نے پھٹی پھٹی نظروں سے عالیہ کی طرف دیکھا" کیا تم نے اسی دن کے

لئے لکھا پڑھا تھا؟"

"میں کوئی بُرا کام نہیں کر رہی ہوں" اس نے بڑے سکون سے جواب دیا۔ اس کے سامنے صفدر بھائی بے بسی کی تصویر بنے بیٹھے تھے۔ عالیہ نے پیار سے ان کی طرف دیکھا۔ ساری زندگی دُنیا کے لئے وقف کر رکھی مگر ان کا کوئی نہ بنا کسی نے ساتھ نہ دیا۔ اب وہ ضرور ساتھ دیگی۔

"تم ضرور شادی کرو، میری طرف سے اجازت ہے، میں کل اپنے بھائی کے گھر چلی جاؤں گی میں مرتے ہوئے تم کو دودھ نہ بخشوں گی۔ مجھے اس وقت بڑی خوشی ہوگی کہ تم میری زندگی میں سلمہ کی طرح تباہ ہو جاؤ۔ یہ شخص جیلوں میں زندگی گزارے اور تم گھر میں پڑی تڑپو"۔

میں ان کا انتظار کیا کروں گی اماں، میں تڑپوں گی نہیں، میں سلمہ پھوپھی کی طرح کبھی نہیں مرونگی۔ اس نے آہستہ سے جوابدیا۔

اماں نے ساری کا آنچل اپنی آنکھوں پر رکھ لیا۔ ان کا جسم لرز رہا تھا۔

"چچی آپ کہیں نہیں جائیں گی" صفدر بھائی نے التجا کی۔ "میں آپ کی خدمت کروں گا"، "میں نے اپنی زندگی کی ڈگر کو بدل دیا ہے، دنیا تباہ ہوتی ہے تو ہو جائے۔ مجھے کوئی مطلب نہیں میں اب صرف دولت کماؤں گا، عیش کرونگا، میں اب کار، کوٹھی کے خواب پورے کرونگا میں اب جیل نہیں جا سکتا، میں اب امپورٹ ایکسپورٹ کا لائسنس لینے کی کوشش کر رہا ہوں بہت جلد مل جائیگا، چچی میں اب بڑا آدمی بن جاؤں گا۔ آپ مجھے قبول کر لیجئے"۔

"ایں!" عالیہ نے اجنبیوں کی طرح صفدر بھائی کی طرف دیکھا۔ اررے

بس آپکی زندگی کا یہی مقصد رہ گیا ہے۔ بس اتنی سی بات۔ عالیہ کو ایسا محسوس ہ
کہ وہ بہت دور سے ریتیلے میدانوں میں سے چل کر آرہی ہے۔ تھکن سے نڈھال،
جنم جنم کی پیاسی۔ اور کوئی تو اس کے حلق میں ایک قطرہ پانی کا ٹپکائے۔

"پہلے کچھ بن کر دکھاؤ پھر میں عالیہ کی خواہش پوری کروں گی"۔ اماں نے بڑی
چالاکی سے معاملے کو ٹالنے کے لئے کہا۔

میں شادی نہیں کروں گی اماں۔ آپ بھی سن لیجئے صفدر بھائی، میں شادی
نہیں کرونگی۔ وہ کرسی سے اٹھی"۔ اب جب آپ یہاں آئیں تو سوچ لیجئے گا کہ
مجھے تہمینہ آپا یاد آتی ہیں، میں اس یاد سے چھٹکارہ چاہتی ہوں"۔ وہ تیز
تیز قد... سے اپنے کمرے کی طرف بھاگنے لگی"۔ خدا حافظ"۔

جب وہ اپنے کمرے میں بے سُدھ پڑی تھی تو اسے ایسا محسوس ہو رہا
تھا کہ چھمی اس کے سینے پر دھم دھم کرتی گزر گئی ہے۔ میں نے آپ کو ہرا دیا بجیا،
میں نے آپ کو ہرا دیا بجیا"۔

اس نے دونوں ہاتھ زور سے اپنے سینے پر باندھ لئے۔

(تمام شد)

لائبریری ایڈیشن کی دیگر مطبوعات

خدا کی بستی	شوکت صدیقی	4/50
انتخاب اودھ پنچ	مرتبہ۔ رضی کاظمی	2/-
عذرا	خلیل الرحمان	2/25

کتابی دنیا۔ لکھنؤ